جادہ و منزل

سید قطب شہید

مترجم:- خلیل احمد حامدی

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
لاہور ۔۔۔۔ ڈھاکہ ۔۔۔۔ کراچی

جادہ و منزل

ترجمہ

معالم فی الطریق

مصنّف :- سیّد قطب شہید

مترجم :- خلیل احمد حامدی

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹیڈ

۱۳- ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (مغربی پاکستان)

شاخ :- ۱۶- بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ (مشرقی پاکستان)

طابع — اخلاق حسین، ڈائریکٹر

ناشر — اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

مطبع — کنول آرٹ پریس، لاہور

اشاعت:- اوّل — مئی ۱۹۶۸ء — ۲۰۰۰

قیمت:- اعلیٰ ایڈیشن ۵/۰۰ روپئے
جلد ۱/۰۰ روپئے
(کل) ۶/۰۰ روپئے

سستا ایڈیشن ۴/۰۰ روپئے

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مصنّف اور تصنیف

بقلم : خلیل احمد حامدی

سیّد قطب شہید اور ان کے دوسرے ساتھیوں پر جب قاہرہ کی فوجی عدالت میں مقدّمہ چل رہا تھا تو دورانِ مقدّمہ سرکاری وکیل کی طرف سے ہر ملزم سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا اُس نے "معالم فی الطریق" کا مطالعہ کیا ہے۔ اس مقدّمہ کی فردِ قرار دادِ جُرم اسی کتاب کے مضامین پر مشتمل تھی۔ چنانچہ یہی کتاب سیّد قطب اور ان کے ساتھیوں کو تختۂ دار پر لے جانے کا موجب ہوئی۔[1] لیکن یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ تاریخ میں متعدّد ایسی کتابیں ملتی ہیں جو اپنے مصنّفین کے لیے پیغامِ اجل لے کر آئیں۔ خود پاکستان کی تاریخ میں بھی اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ پیش آچکا ہے۔

---

[1] روزنامہ المنار، اردن شمارہ ۳۰، اگست ۱۹۶۶ء

مصر کا ایک دَور وہ تھا جب وہاں بادشاہت کا سِکّہ رواں تھا اور جسے اب تاریخِ مصر کے سیاہ باب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اُس سیاہ دَور کا واقعہ ہے کہ مصر کے نامور مصنّف عباس محمود العقاد نے ۱۹۳۱ء میں پارلیمنٹ میں شاہ مصر احمد فؤاد الاوّل پر شدید تنقید کی، چنانچہ انہیں جیل بھیج دیا گیا ۔ مگر زیادہ دن نہ گزرنے پائے کہ انہیں رہا کر دیا گیا ۔ رہائی کے بعد عقّاد کے ایک دوست نے اُن سے یہ دریافت کیا کہ "کیا یہ خبر صحیح ہے کہ احمد فؤاد نے وزیر اسمٰعیل صدقی کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ آپ کو یہ مشورہ دے کہ آپ کچھ نہ کچھ معذرت پیش کر دیں تاکہ اُسی کی بنا پر آپ کو رہا کر دیا جائے ؟" عقّاد نے اس خبر کی تصدیق کرتے ہوئے کہا : "دراصل احمد فؤاد اس بات سے ڈر گیا تھا کہ تاریخ کے صفحات پر یہ ثبت ہو جائے گا کہ اُس کے عہد میں ایک اہلِ قلم کو آزادیٔ فکر کی پاداش میں نذرِ زنداں کر دیا گیا[1]" اُس سیاہ دَور کے بعد مصر میں ۲۶ جولائی ۱۹۵۲ء کی صبح ایک نئے دَور کا آغاز کرتی ہے جسے "اجتماعی مساوات" کے عہد سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اسی "عہد زریں" کا یہ واقعہ ہے کہ ایک ایسی کتاب کی تصنیف پر، جس میں نہایت چچے تُلے انداز میں اصولی بحثیں کی گئی ہیں اور کسی شخصیّت کو زیر بحث نہیں لایا گیا، مصنّف کو پھانسی دے دی جاتی ہے ۔ ہم اسی

---

[1] مقالہ : "محنۃ الفکر" از قلم یوسف حنا، شائع شدہ روزنامہ الدفاع، اردن شمارہ ۳۱ اگست ۱۹۶۶ء

جاوداں کتاب کا اُردو ترجمہ اپنے مُلک کے اہلِ علم کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ قارئین تصنیف سے پہلے خود مصنّف سے تعارف حاصل کر لیں

مصنّف کے حالاتِ زندگی اُردو میں کسی نہ کسی حد تک منتقل ہو چکے ہیں۔ لیکن مصنّف کی عبقری شخصیت کا تقاضا ہے کہ ان کے حالات کو زیادہ تفصیل اور جامعیت کے ساتھ ہند و پاک کے اہلِ علم و دعوت کے سامنے لایا جائے۔

خاندانِ قطب

مصنّف کا اصل نام سیّد ہے۔ قطب ان کا خاندانی نام ہے۔ ان کے آباؤ اجداد اصلاً جزیرۃ العرب کے رہنے والے تھے۔ ان کے خاندان کے ایک بزرگ وہاں سے ہجرت کر کے بالائی مصر کے علاقے میں آکر آباد ہو گئے۔ انہی کی اولاد میں سے سیّد قطب کے والد بزرگوار حاجی ابراہیم قطب تھے۔ حاجی ابراہیم کی پانچ اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکے سیّد قطب اور محمد قطب، اور تین لڑکیاں حمیدہ قطب اور امینہ قطب۔ تیسری لڑکی کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ ان پانچوں بہن بھائیوں میں سیّد سب سے بڑے ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی محمد قطب بھی بڑے صاحبِ علم و فضل ہیں۔ ان کے قلم سے اب تک ۱۱ سے زائد ضخیم کتابیں مختلف اسلامی موضوعات پر نکل چکی ہیں اور علمی و تحریکی حلقوں سے غیر معمولی داد و ستائش حاصل کر چکی ہیں۔ امینہ قطب بھی بڑی پڑھی لکھی خاتون ہیں، اور دعوت و جہاد میں اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ سرگرمِ کار رہی ہیں۔ ان کے اصلاحی اور معاشرتی مضامین بھی مختلف جرائد میں چھپتے رہے ہیں۔ ان کے اِصلاحی

افسانوں کو ایک مجموعہ "فی تیار الحیاۃ" کے نام سے چھپ گیا ہے۔ ان کی دوسری بہن حمیدہ قطب بھی میدانِ جہاد میں اپنے بہن بھائیوں سے پیچھے نہیں رہی ہیں۔ یوں خاندان قطب کا ہر فرد گوہر یک دانہ نظر آتا ہے۔ اور اس مثل کا صحیح مصداق ہے کہ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔ صبر و عزیمت اور آزمائش و ابتلاء میں بھی اِس خاندان نے بیسویں صدی میں جس اعلیٰ کردار کا نمونہ پیش کیا ہے اس نے آلِ یاسر کی مثال زندہ کر دی ہے۔ سیّد قطب نے تختۂ دار کو چوم لیا۔ محمد قطب جیل میں ڈال دیئے گئے اور تعذیب و تشدّد کا نشانہ بنے۔ حمیدہ قطب کو بھی سات سال قید با مشقّت کی سزا ملی۔ امینہ قطب بھی ایسے ہی انجام سے دوچار ہوئی۔ تیسری بہن نے بھی جن کا صحیح نام معلوم نہیں ہو سکا سیّد رفعت نامی اپنا ایک لختِ جگر راہِ حق میں قربان کر دیا۔ اور جلّاد کے تازیانوں نے اُسے شہید راہِ اُلفت کے خطاب سے نواز دیا۔

سیّد کے حالاتِ زندگی

سیّد قطب ۱۹۰۶ء میں مصر کے ضلع اُسیُوط کے موشا نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ سیّد قطب کی والدہ کا اسمِ گرامی فاطمہ حسین عثمان تھا۔ موصوفہ بڑی دیندار اور خُدا پرست خاتون تھیں۔ انہیں قرآن مجید سے بڑا شغف تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے بچے قرآن کے حافظ ہوں۔ سیّد قطب اپنی کتاب "التصویر الفنی فی القرآن" کا انتساب اپنی والدہ محترمہ کی طرف کرتے ہوئے موصوفہ کی قرآن سے محبّت و شیفتگی کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

"اے میری ماں! گاؤں میں رمضان کا پورا مہینہ جب ہمارے گھر پر قاری حضرات قرآن کی دل نشیں انداز میں تلاوت کیا کرتے تھے تو تُو گھنٹوں کان لگا کر، پوری محویت کے ساتھ پردے کے پیچھے سے سُنا کرتی تھی۔ مَیں تیرے پاس بیٹھا جب شور کرتا تھا جیسا کہ بچّوں کی عادت ہوتی ہے تو مجھے اشاروں کنایوں سے باز رہنے کی تلقین کرتی تھی اور پھر مَیں بھی تیرے ساتھ کان لگا کر سُننے لگ جاتا۔ میرا دل الفاظ کے ساحرانہ لحن سے محظوظ ہوتا اگرچہ مَیں اس وقت مفہوم سے نا واقف تھا۔"

"تیرے ہاتھوں میں جب پروان چڑھا تو تُو نے مجھے بستی کے ابتدائی مدرسہ میں بھیج دیا۔ تیری سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ اللہ میرے سینے کو کھول دے اور مَیں قرآن حفظ کر لوں اور اللہ مجھے خوش الحانی سے نوازے اور مَیں تیرے سامنے بیٹھا ہر لمحہ تلاوت کیا کروں۔ چنانچہ مَیں نے قرآن حفظ کر لیا اور یُوں تیری آرزو کا ایک حصّہ پُورا ہو گیا۔"

"اے ماں! تیرا ننّھا بچّہ، تیرا جوان لختِ جگر آج تیری تعلیم و تربیّت کی طویل محنت کا ثمرہ تیری خدمت میں پیش کر رہا ہے۔ اگر حُسنِ ترتیل کی اُس میں کمی ہے تو حُسنِ تاویل کی نعمت سے وہ ضرور بہرہ ور رہے ہے۔"

سیّد کے والد بھی بڑے باخدا اور درویش منش انسان تھے۔ ان کا پیشہ زراعت تھا۔ سیّد نے اپنی کتاب "مشاھد القیامۃ فی القرآن" کا انتساب اپنے مرحوم والد کی طرف کیا ہے۔ اس انتساب میں وہ اپنے والد کے تعلق باللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اے باپ! یہ کاوش تیری رُوح کی نذر کرتا ہوں۔ میں بچہ ہی تھا کہ تو نے میرے احساس و وجدان پر یوم آخرت کا خوف نقش کر دیا۔ تُو نے مجھے کبھی نہیں جھڑکا تھا۔ بلکہ تُو میرے سامنے اس طرح زندگی بسر کر رہا تھا کہ قیامت کی باز پُرس کا احساس تجھ پر طاری رہتا تھا۔ ہر وقت تیرے قلب و ضمیر میں اور تیری زبان پر اُس کا ذکر جاری رہتا تھا۔ تُو دوسروں کا حق ادا کرتے وقت اپنی ذات کے ساتھ تشدّد برتتا اور دوسروں سے اپنا حق وصول کرتے وقت تسامح سے کام لیتا تھا۔ اس کی وجہ تُو یہ بتایا کرتا تھا کہ اصل حساب روزِ قیامت کو ہوگا۔ تُو بُرائیوں سے درگزر کرتا تھا حالانکہ تجھ میں ان کا جواب دینے کی قدرت ہوتی تھی، کیونکہ تُو انہیں قیامت کے روز اپنے لیے کفّارہ سمجھتا تھا، بسا اوقات تُو اپنی ضرورت کی اشیاء دُوسروں کو پیش کر دیتا حالانکہ تو خود ان کا شدید حاجت مند ہوتا تھا، لیکن تُو کہا کرتا تھا کہ زادِ آخرت جمع کر رہا ہوں۔ تیری صورت میرے تخیّل پر مرتسم ہے۔ عشاء

کے کھانے سے جب ہم فارغ ہو جایا کرتے تو تُو قرآن کی تلاوت کرنے لگ جاتا اور اپنے والدین کی رُوح کو ثواب پہنچاتا۔ ہم چھوٹے چھوٹے بچے بھی تیرے ساتھ اِدھر اُدھر کی چند آیات گنگنانے لگتے جو ہمیں پُوری طرح یاد نہ ہوتی تھیں۔"

سیّد کی تعلیمی زندگی

سیّد کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے سادہ اور محدود ماحول میں ہوئی۔ انہوں نے اپنی والدہ محترمہ کی دِلی آرزو کے مطابق بچپن میں قرآن حفظ کر لیا۔ اس زمانے میں مصر کے دیندار گھرانوں میں حفظِ قرآن کا عام رواج تھا۔ اور خاص طور پر جو خاندان اپنے بچوّں کو ازہر کی تعلیم دلانے کا شوق رکھتے تھے انہیں لازمًا بچوّں کو قرآن حفظ کرانا پڑتا تھا۔ سیّد کے والدین اپنے اس ہونہار اور اقبال مند بچےّ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بڑے متفکّر تھے۔ چنانچہ قدرت کی طرف سے ایسا اتّفاق ہؤا کہ سیّد کے والدین گاؤں کو چھوڑ کر قاہرہ کی ایک نواحی بستی حلوان میں آباد ہوئے۔ اور یُوں سیّد کے لیے اللہ تعالیٰ نے تعلیمی ترقی اور عروج کی راہ ہموار کر دی۔ سیّد قاہرہ کے ثانوی مدرسے "تجہیزیۃ دارالعلوم" میں داخل ہو گئے۔ اس مدرسہ میں ان طلباء کو داخل کیا جاتا تھا جو یہاں سے فارغ ہو کر "دارالعلوم" (موجودہ قاہرہ یونیورسٹی) میں تکمیلِ تعلیم کرنا چاہتے تھے۔ اس دَور میں جس طرح دینی و شرعی علوم کی اعلیٰ تعلیم گاہ ازہر یونیورسٹی تھی۔ اِسی طرح دارالعلوم جدید علوم و فنون کا اعلیٰ تعلیمی

ادارہ تھا۔ سید نے "تجہیزیہ دارالعلوم" سے فراغت حاصل کرتے ہی ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم قاہرہ میں داخلہ لے لیا۔ اور ۱۹۳۳ء میں یہاں سے بی اے ایجوکیشن کی ڈگری حاصل کی۔ اور اپنی خدا داد ذہانت کی وجہ سے اسی کالج میں پروفیسر لگا دیے گئے۔

سرکاری ملازمت اور سفر امریکہ

کچھ عرصہ تک دارالعلوم قاہرہ میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے رہے پھر انہیں وزارت تعلیم میں انسپکٹر آف سکولز لگا دیا گیا۔ مصر میں یہ عہدہ بڑے اعزاز و افتخار کا منصب سمجھا جاتا رہا ہے۔ تاریخ التشریع الاسلامی کے مؤلف علامہ محمد الخضری بک جیسے فقیہ و مؤرخ بھی اس عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں۔ اسی دوران انہیں وزارت تعلیم کی طرف سے جدید طریقہ تعلیم و تربیت کے مطالعہ کے لیے امریکہ بھیجا گیا، اور دو سال کے قیام کے بعد امریکہ سے لوٹے۔ امریکہ میں ان کا قیام تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لیے مختلف کالجوں میں ہوا۔ واشنگٹن کے وِلسن ٹیچرس کالج، اگریلی کولوراڈو کے ٹیچرس کالج۔ اور کیلیفورنیا میں اسٹان فورڈ یونیورسٹی میں ان کا قیام رہا۔ اس کے علاوہ نیویارک، شکاگو، سان فرانسسکو، لاس اینجلز اور دوسرے شہروں میں بھی جانے کا موقع ملا۔ امریکہ سے واپسی پر انہوں نے انگلستان، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ میں بھی چند ہفتے گزارے۔ امریکہ کا مختصر قیام اُن کے لیے بڑے خیر و برکت کا موجب

لہ ملاحظہ ہو "اسلام کا عدلِ اجتماعی" مقدمہ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی۔

ہوا۔ موصوف نے مادّی زندگی کی تباہ کاریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ چنانچہ انہیں اسلام کی حقانیت وصداقت پر مزید اطمینان ہوا۔ اور وہ یہ یقین لے کر واپس لوٹے کہ انسانیت کی اصل فلاح صرف اسلام میں ہے۔

"اخوان المسلمون" میں شمولیت

امریکہ سے واپس آتے ہی انہوں نے "اخوان المسلمون" کی طرف توجہ دی، ان کی دعوت کا مطالعہ کیا اور بالآخر ۱۹۴۵ء میں وہ اخوان سے وابستہ ہوگئے[1] یہ وہ دور تھا جب دوسری عالمی جنگ ختم ہو چکی تھی اور اخوان المسلمون کی تحریک نے عوامی پیمانے پر سیاسی مسائل میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ دورانِ جنگ انگریزوں نے آزادیٔ مصر کا جو وعدہ کیا تھا اخوان نے اُسے فوری طور پر پُورا کرنے کا مطالبہ کر رکھا تھا۔ اس سے ایک طرف اگر اخوان کی مقبولیت میں اضافہ ہو گیا تھا تو دوسری طرف انگریزی استعمار اور شاہی استبداد کی ملی بھگت سے ان کے لیے تکالیف ومصائب کے نئے دروازے بھی کھل گئے تھے۔ اخوان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دو سالوں کے اندر اندر ان کے صرف کارکنوں کی تعداد ۵ لاکھ تک پہنچ گئی تھی، اور عام ارکان اور ہمدردوں اور حامیوں کی تعداد اس سے بھی دوگنی تھی[2] ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء میں اخوان کے مرشد عام استاذ حسن البنا شہید کیے گئے، اور جماعت

---

[1] ملاحظہ ہو "الشہید سیّد قطب" ص ۷، مقالہ یوسف العظم۔

[2] "الاخوان المسلمون والمجتمع المصری" تالیف محمد شوقی زکی ص ۲۱۔

کو خلافِ قانون قرار دیا گیا۔ آزمائش کا یہ مرحلہ مصر میں فوجی انقلاب کے قیام تک جاری رہا۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں فوجی انقلاب برپا ہوا۔ جس نے بے شک اخوان المسلمون کی آزمائش کے ایک دور کو ختم کر دیا مگر ساتھ ہی آلام و مصائب کا ایک اور ایسا دور شروع کر دیا کہ بقول غالب ؎

اِک درد کی دوا پائی
اِک درد لا دوا پایا

اس آزمائش کے بعد اخوان کے اندر جن لوگوں کو نمایاں اہمیت حاصل ہوئی اُن میں ایک حسن الہضیبی ہیں جو بعد میں اخوان المسلمون کے مُرشد عام منتخب ہوئے اور دوسرے عبد القادر عودہ شہید ہیں جو جماعت کے جنرل سیکرٹری (وکیل) مقرر ہوئے۔ اور تیسرے جناب سیّد قطب جنہوں نے فکری میدان میں جماعت کی عظیم الشّان خدمات سرانجام دیں۔

۱۹۵۲ء کے وسط میں اخوان المسلمون کی تحریک دوبارہ بحال ہوئی۔ فاروق کا دورِ جبر ختم ہوا۔ اخوان کے رہنما اور کارکن جیلوں سے رہا ہوئے، اور حسن الہضیبی کی قیادت میں قافلۂ تحریک نئے ولولوں سے وقفِ سفر ہوا۔ استاذ سیّد قطب اخوان کے مکتب الارشاد (مجلس عاملہ) کے رُکن منتخب ہوئے۔ جماعت کے مرکزی دفتر میں انہیں شعبۂ توسیع دعوت کا رئیس (انچارج) مقرر کر دیا گیا۔ ۵۲ء سے پہلے تو وہ جماعت کے ایک عام رُکن تھے مگر اب ان کا شمار رہنماؤں میں ہونے لگا۔ اور انہوں نے اپنی زندگی ہمہ تن دعوت و جہاد کے لیے وقف کر دی۔ اور مختلف پہلوؤں اور مختلف طریقوں سے اس تحریک

کی خدمت کی۔ مارچ ۱۹۵۳ء میں مصر کے معاشرتی بہبود کے سرکل نے سیّد قطب کو معاشرتی بہبود کی کانفرنس میں شرکت کے لیے دمشق بھیجا۔ سیّد موصوف نے اس کانفرنس میں متعدد لیکچر دیئے جن میں قابلِ ذکر لیکچر یہ تھا: "التربیۃ الخلقیۃ کوسیلۃ لتحقیق التکافل الاجتماعی (اخلاقی تربیت اجتماعی کفالت کو بروئے کار لانے کا ایک ذریعہ ہے)۔ کانفرنس سے فارغ ہو کر سیّد موصوف اُردن کی زیارت کو روانہ ہوئے۔ مگر اُردنی حُکّام نے انہیں سرحد پر روک لیا اور اُردن میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔ اُردنی حُکّام کا یہ اقدام گلب پاشا کے احکام کی بنا پر عمل میں آیا تھا جو ان دنوں اُردن کے سیاہ وسفید کا مالک تھا۔ دسمبر ۱۹۵۳ء میں سیّد قطب کو اخوان کے مکتب الارشاد کی طرف سے بیت المقدس میں منعقد ہونے والی اسلامی کانفرنس میں بھیجا گیا۔ اس مرتبہ چونکہ سیّد قطب عالمِ اسلامی کے دفود کے ہمراہ اُردن میں داخل ہوئے تھے اس لیے اُردنی حُکّام کی طرف سے ان سے تعرّض نہیں کیا گیا ورنہ سیّد قطب کی آتشیں تحریروں سے گلب پاشا کو جو چڑ تھی اُس کی بنا پر ان کا اُردن میں قدم رکھنا آسان نہ تھا۔ جولائی ۵۴ء میں اخوان کی "مجلس دعوتِ اسلامی" نے سیّد قطب کو جریدۃ "اخوان المسلمون" کا رئیس التحریر مقرر کیا۔ موصوف نے صرف ۲ ماہ تک اس جریدے کی ایڈیٹری کے فرائض سرانجام دیئے۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۴ء کو یہ اخبار کرنل ناصر کی حکومت کی طرف سے بند کر دیا گیا، کیونکہ اس اخبار نے اخوان المسلمون کی پالیسی کے تحت اُس اینگلو مصری پیکٹ کی مخالفت کی تھی جو ۷، رجولائی ۱۹۵۴ء کو جمال عبدالناصر اور انگریزوں کے مابین ہوا تھا۔ اس پیکٹ کے بعد اخوان اور

ناصر کے مابین کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ اور اخوان شدید تر دَورِ ابتلاء میں گھِر گئے۔ ایک جعلی سازش کے الزام میں حکومتِ مصر نے اخوان المسلمون کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ اخوان رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ انہیں موت کی سزائیں دی گئیں[1] ان کے ہزار ہا کارکنوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا، اور ایسا محشر خیز ہنگامہ برپا ہوا کہ ہر اُس شخص کی عزّت و آبرو اور جان و مال پر دست درازی کی گئی جو اخوان کے ساتھ کسی نہ کسی نوعیّت کا تعلّق رکھتا تھا[2]

ابتلاء کا آغاز

ان گرفتار شدگان میں سیّد قطب بھی تھے۔ انہیں مصر کی مختلف جیلوں میں رکھّا گیا۔ کبھی قلعہ کی جیل میں، کبھی فوجی جیل میں اور گاہ ابو زعبل کی ہولناک جیل میں۔ سیّد موصوف کی گرفتاری اور تعذیب کی داستان بڑی زہرہ گداز ہے، شام کے ہفت روزہ الشہاب کے حوالے سے ہم اس کی تلخیص نقل کرتے ہیں:

"فوجی افسر جب سیّد قطب کو گرفتار کرنے کے لیے ان کے گھر میں

---

[1] جن لوگوں کو موت کی سزائیں دی گئیں (۷ نومبر ۱۹۵۴ء) ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) عبد القادر عودہ (۲) محمد فرغلی (۳) یوسف طلعت (۴) ابراہیم الطیّب (۵) ہنداوی دویر (۶) محمود عبد اللطیف۔

[2] مصر کے نامور اخبار المصری کے ایڈیٹر احمد ابو الفتح کا بیان ہے کہ چند ہفتوں کے اندر اندر گرفتار شُدگان کی تعداد ۵۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ ملاحظہ ہو کتاب "جمال عبد الناصر" تالیف احمد ابو الفتح ص ۲۰۵۔

داخل ہوتے تو سیّد اس وقت انتہائی شدید بخار میں مبتلا تھے۔ انہیں اسی حالت میں پا بند سلاسل کر لیا گیا۔ اور پیدل جیل تک لے جایا گیا۔ راستے میں شدّتِ کرب کی وجہ سے بیہوش ہو کر زمین پر گر جاتے۔ اور جب ہوش میں آتے تو اُن کی زبان پر اللہ اکبر و للہ الحمد (یہ اخوان کا نعرہ) کے الفاظ جاری ہو جاتے۔ انہیں جب سجن حربی (فوجی جیل) میں داخل کیا گیا تو جیل کے دروازہ پر ان کی ملاقات جیل کے کمانڈر حمزہ بسیونی[1] اور خفیہ پولیس کے افسروں سے ہوئی۔ جوں ہی سیّد قطب نے جیل کے اندر قدم رکھا تو جیل کے کارندے ان پر ٹوٹ پڑے اور پورے دو گھنٹے تک ان کو زدوکوب کرتے رہے۔ جیل کے اندر ان پر ایک سدھایا ہوا گرگ نما فوجی کتا بھی چھوڑا گیا۔ جو ان کی ران مُنہ میں لے کر انہیں اِدھر اُدھر گھسیٹتا رہا۔ اس تمہیدی کاروائی کے بعد انہیں ایک کوٹھڑی میں لے جایا گیا، اور ان سے سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا اور مسلسل سات گھنٹے تک جاری رہا۔ سیّد قطب کی جسمانی طاقت اگرچہ جواب دے چکی تھی مگر قلبی حرارت اور اطمینان وصبر کی طاقت نے انہیں پتھر کی چٹان میں تبدیل کر

---

[1] ۵ رجون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد یہ شخص غداری کے الزام میں خود گرفتار ہو چکا ہے۔

دیا تھا۔ ان پر گوناگوں اذیتوں کی بارش ہوتی رہی مگر وہ "اللہ اکبر وللہ الحمد" کے سرورِ جاودانی میں مستغرق رہتے۔ رات کو جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ڈال دیئے جاتے اور صبح کے وقت بلاناغہ انہیں پریڈ کروائی جاتی۔ ان مالایطاق مشقتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ متعدد بیماریوں میں مبتلا ہو گئے[1]۔ ۲ رمئی ۱۹۵۵ء کو انہیں فوجی اسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت موصوف امراضِ سینہ، قلبی ضعف، جوڑوں کے درد اور اسی نوعیت کی دوسری بیماریوں میں مبتلا تھے[2]"

موصوف کے ایک شاگرد جناب یوسف العظم لکھتے ہیں:

"تعذیب کے گوناگوں پہاڑ سیّد قطب پر توڑے گئے۔ انہیں آگ سے داغا گیا، پولیس کے کتّوں نے انہیں کچلیوں میں لے کر گھسیٹا، ان کے سر پر مسلسل کبھی گرم اور کبھی ٹھنڈا پانی انڈیلا گیا، انہیں لاتوں اور گھونسوں سے مارا گیا، دِل آزار الفاظ اور اشاروں سے ان کی توہین

---

[1] یہاں تک الشہاب کے بیانات کی ہم نے تلخیص نقل کی ہے۔ الشہاب ان دنوں شام کی جماعت الاخوان المسلمون کے زیرِ انتظام دمشق سے نکلتا تھا۔ اور مصری جیل خانوں کی تعذیب کی داستانوں سے دنیا کو آگاہ کرتا رہتا تھا۔

[2] الشہید سیّد قطب ص ۳۰۔

کی گئی۔ مگر ان سب چیزوں نے سیّد کے ایمان واذعان میں اضافہ کیا اور حق پر ان کے قدم مزید جم گئے[1]"

عزیمت کی ایک مثال

۱۳ر جولائی ۱۹۵۵ء کو مصر کی "عوامی عدالت" (محكمة الشعب) کی طرف سے سیّد قطب کو ۱۵ سال قید بامشقت کی سزا سُنائی گئی۔ "عوامی عدالت" کا یہ فیصلہ اُن کی غیر حاضری میں سُنایا گیا۔ کیونکہ موصوف اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ وہ عدالت میں حاضر نہ ہو سکتے تھے۔ ۱۵ سالہ قید بامشقّت کا ابھی ایک سال گزرا تھا کہ جمال عبدالناصر کی طرف سے ایک نمائندہ سیّد قطب کے پاس جیل خانے بھیجا گیا۔ اُس نے سیّد قطب کو یہ پیش کش کی کہ "اگر آپ چند سطریں معافی نامہ کی لکھ دیں جنہیں اخبارات میں شائع کیا جا سکے تو آپ کو رہا کر دیا جائے گا، اور جیل کے مصائب سے نجات پا کر آپ گھر کی آرام دہ زندگی سے متمتع ہو سکیں گے۔" اس پیشکش کے جواب میں اس مردِ مومن نے جو جواب دیا اُسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ انہوں نے کہا:

"مجھے ان لوگوں پر تعجّب آتا ہے کہ جو مظلوم کو کہتے ہیں کہ ظالم سے معافی مانگ لے۔ خدا کی قسم، اگر معافی کے چند الفاظ مجھے پھانسی سے بھی نجات دے سکتے ہوں تو مَیں تب بھی کہنے کے لیے تیار نہ ہوں گا، اور مَیں اپنے ربّ کے حضور اس حال میں پیش

---

[1] ایضاً ص ۳۱۔

ہونا پسند کروں گا کہ میں اُس سے خوش ہوں اور وہ مجھ سے خوش ہو۔“[۱]

جیل میں جب کبھی اُن سے اس پیش کش کا ذکر کیا گیا اور معافی کا مشورہ دیا گیا تو انہوں نے ہمیشہ یہ کہا: ”اگر میرا قید کیا جانا برحق ہے تو مَیں حق کے فیصلہ پر راضی ہوں، اور اگر باطل نے مجھے گرفتار کر رکھا ہے تو میں باطل سے رحم کی بھیک مانگنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“[۲] عوامی عدالت (محکمۃ الشعب) کی کارروائی حکومت کی طرف سے کتابی شکل میں شائع کی جا چکی ہے۔ اس کارروائی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ سیّد قطب کو حکومت کی طرف سے وزارتِ تعلیم کی پیش کش بھی کی گئی تھی۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ وزارت کا قبول کرنا اس وقت تک لاحاصل ہے جب تک مصر کے پُورے نظامِ تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا اختیار نہ ہو۔

رہائی !!

۱۹۶۴ء کے وسط تک سیّد قطب مصر کے مختلف جیل خانوں میں رہے۔ ابتدا کے ۳ سال تو انہوں نے انتہائی اذیت اور عذاب میں گزارے۔ مگر بعد میں جبر و تشدّد کا سلسلہ ہلکا کر دیا گیا۔ اور ان کے اعزّہ و اقارب کو بھی مُلاقات کی اجازت مل گئی۔ اور خود انہیں بھی جیل کے اندر اپنے علمی مشاغل جاری رکھنے

---

[۱] ایضاً ص ۵۰، ۵۱۔

[۲] روزنامہ النہار بیروت شمارہ ۱۱ ستمبر ۱۹۶۶ء مقالہ احمد شومان۔

کی سہولت کسی حد تک مہیا ہو گئی۔ اس جزوی سہولت سے انہوں نے پورا فائدہ اُٹھایا اور اپنی تفسیر "فی ظلال القرآن" کی تکمیل پر متوجہ ہو گئے۔ ۱۹۶۴ء کے وسط میں جب کہ ان کی قید کو تقریباً دس سال ہو گئے تھے اور بالعموم ۱۵ سال کی سزا پانے والا قیدی عملاً دس یا گیارہ سال گزار کر رہا ہو جاتا ہے، عراق کے مرحوم صدر عبدالسلام عارف نے قاہرہ کا دورہ کیا اور صدر ناصر سے سید قطب کی رہائی کی درخواست کی۔ چنانچہ صدر ناصر نے جو عبدالسلام عارف مرحوم کے ساتھ خوشگوار تعلقات کے قیام کے متمنی تھے اس درخواست کے جواب میں سید قطب کو رہا کر دیا[1]۔ مگر اس رہائی سے عملاً کوئی فرق نہ پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ وہ برابر پولیس کی نگرانی میں رہتے تھے۔ اور انہیں آزادانہ نقل و حرکت کی اجازت نہ تھی۔

دوبارہ گرفتاری اور سزا

اس مقید آزادی کو ایک سال بھی نہ گزرنے پایا کہ سید قطب کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ اُن پر الزام یہ تھا کہ وہ طاقت کے ذریعہ حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتے تھے۔ چنانچہ نہ صرف انہیں بلکہ ان کے بھائی محمد قطب اور ان کی ہمشیرگان حمیدہ قطب اور امینہ قطب کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اور ان کے علاوہ اور بھی کثیر تعداد کو گرفتار کر لیا گیا۔ ڈیلی ٹیلیگراف کی رپورٹ کے مطابق گرفتار شدگان کی تعداد بیس ہزار سے تجاوز کر گئی[2]۔ ان میں سات سو کے قریب

---

[1] یہ روایت راقم الحروف نے مصر اور کویت کے ثقہ لوگوں سے سُنی ہے۔ کسی سرکاری دستاویز یا اخباری بیان میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

[2] ڈیلی ٹیلیگراف ۱۱ر اکتوبر ۱۹۶۵ء

عورتیں تھیں۔ اس پکڑ دھکڑ کا آغاز اس وقت ہُوا جب اگست ۱۹۶۵ء میں صدر ناصر نے روس کا دورہ کیا۔ اور ماسکو میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ "اخوان المسلمون" نے میرے قتل کی سازش تیار کی ہے جو طشت از بام ہو چکی ہے ماضی میں مَیں نے انہیں معاف کر دیا تھا لیکن اب معاف نہیں کروں گا"۔ اس اعلان سے ایک سال پیشتر (۲۴ مارچ ۱۹۶۴ء) مصر میں ایک نئے قانون (نمبر ۱۱۹ مجریہ ۱۹۶۴ء) کے ذریعہ صدر کو یہ اختیارات دیئے گئے تھے کہ وہ جسے چاہے بغیر مقدمہ چلائے گرفتار کر سکتا ہے، جائیداد کی ضبطی اور دوسری انتظامی کارروائیوں کو رُو بہ عمل لا سکتا ہے، اور صدر کی ایسی تمام کارروائیوں کے خلاف عدالتی چارہ جوئی اور اپیل نہیں کی جا سکے گی۔ صدر ناصر کے اعلانِ ماسکو کے بعد گرفتاریوں کا وسیع پیمانے پر سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور جیلوں کے اندر تعذیب و تشدّد کی بھٹیاں گرم ہو گئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد خاص فوجی عدالتوں میں ان کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا۔ پہلے اعلان ہُوا کہ مقدّمہ کی کارروائی ٹیلی ویژن پر دکھائی جائے گی۔ لیکن جب ملزموں نے اقبالِ جرم سے انکار کر دیا اور تشدّد اور مظالم کی داستانیں بیان کیں تو فوری طور پر کارروائی ٹیلی ویژن سے روک دی گئی اور بند کمرے میں مقدّمہ چلنے لگا۔ ملزموں کی طرف سے کوئی وکیل مقدّمہ کی پیروی کرنے والا نہ تھا۔ ملک کے باہر کے وکلاء نے مقدّمہ کی پیروی کرنا چاہی مگر انہیں اجازت نہیں دی گئی۔ فرانس کی بار ایسوسی ایشن کے سابق صدر ولیم تھارپ (William Thorp) اور ہیگ کے مشہور وکیل اے۔ جے۔ ایم وینڈال (A. J. M. Vandal). اور مراکش کے

وکلاء نے باقاعدہ اجازت طلب کی جسے رد کر دیا گیا۔ سوڈان کے دو وکیل از خود قاہرہ پہنچ گئے اور وہاں کی بار ایسوسی ایشن میں اپنے آپ کو رجسٹر کرا کر پیروی کے لیے عدالت پہنچے لیکن پولیس نے دھکّے دے کر انہیں نکال دیا۔ اور فی الفور مصر چھوڑنے پر انہیں مجبور کیا گیا۔ جنوری اور فروری ۱۹۶۶ء میں ٹربیونل کے سامنے جو کارروائی ہوئی اس میں ملزموں نے بتایا کہ زبردستی اقبال نامے (Confessions) حاصل کرنے کے لیے ان کو جبر و تشدّد اور اعضاء شکنی (Torture) کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ خود سیّد قطب نے بھی جو اس مقدّمہ کی مرکزی شخصیّت تھی یہی الزام لگایا۔ ٹربیونل کے صدر نے ملزم کا منہ فوراً بند کر دیا اور ان کی شہادت سُننے سے انکار کر دیا۔ ان دِل دوز واقعات کی توثیق لندن میں وکلاء کے غیر جانب دار عالمی ادارے (Amnesty International) کی اس رپورٹ سے ہوتی ہے جو مسٹر پیٹر آرکر (Peter Archer) لندن کی پارلیمنٹ کے ممبر نے مِصر کا دورہ کرنے کے بعد پبلش کی ہے۔ مسٹر آرکر نے واقعات و حقائق بیان کرنے کے بعد لکھّا ہے:

> "ملزمین کے جُرم یا اُن کی معصومیّت کے بارے میں کوئی رائے زنی کیے بغیر ایمنیٹی انٹرنیشنل بڑے افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کرتی ہے کہ ان مقدّمات کے حالات و حقائق ان الزامات کی تائید کرتے ہیں جو مُلزمین کے ساتھ جبر و تشدّد کا سلوک کرنے کے بارے میں لگائے گئے ہیں۔ اور یہ صورتِ حال مصری انصاف کی غیر جانب داری کو قطعاً مشکوک بنا رہی ہے۔"

ایمنسٹی انٹرنیشنل حکومتِ مصر سے مطالبہ کرتی ہے کہ حکومت ملزمین کے بنیادی انسانی حقوق کا احترام کرے اور انہیں کھلے طور پر منصفانہ مقدمہ کا موقع دے کر بین الاقوامی ساکھ میں اضافہ کرے[1]۔"

تختۂ دار پر لٹکا دیئے گئے

اگست ۱۹۶۶ء کو سیّد قطب اور ان کے دو ساتھیوں کو فوجی ٹربیونل کی طرف سے موت کی سزائیں سنائی گئیں۔ ان سزاؤں پر پوری دنیا کے اندر شدید ردِ عمل ہوا۔ دینی رہنماؤں، سیاسی شخصیتوں، مذہبی اور اصلاحی تنظیموں اور اخبارات و رسائل کی طرف سے سزاؤں میں تبدیلی کی درخواست کی گئی۔ مگر ان کی شنوائی نہ ہو سکی اور بالآخر ۲۵ اگست ۱۹۶۶ء کی صبح کو یہ سزائیں نافذ کر دی گئیں۔ اور یہ بے نظیر شخصیت، جو مصر اور عرب دنیا کے الحاد پرست اور لادین عناصر کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی "اپنے رب سے راضیاً مرضیاً" جا ملی ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

---

[1] بحوالہ رپورٹ جاری کردہ ایمنسٹی انٹرنیشنل فلیٹ اسٹریٹ لندن مورخہ ۱۵ر اپریل ۱۹۶۶ء

سیّد قطب ادب و علم کے میدان میں

سیّد قطب، مصری معاشرے کے اندر ایک ادیب لبیب کی حیثیت سے اُبھرے۔ سیاسی اور اجتماعی نقّاد کے عنوان سے اُنہوں نے نام پیدا کیا اور بالآخر اسلام کے عظیم مفکّر اور داعی اور مفسّر قرآن کے رُوپ میں وہ دنیا سے جامہ شہادت پہنے رخصت ہوئے۔

اخوان المسلمون کے ساتھ منسلک ہونے سے پہلے اُن کے ذہن و فکر نے تغیّرات کے کئی مرحلے طے کیے:

انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بچّوں کے لیے تاریخی اور اسلامی لٹریچر کی تصنیف سے کیا۔ اور اپنے ایک قلمی رفیق عبدالحمید جودہ السحار کے ساتھ مل کر انبیاء کرام کے قصّوں اور کہانیوں پر مشتمل ایک سلسلہ شائع کیا۔ اس سلسلہ کو انہوں نے کہانی کے نہایت پُرکشش اور دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے۔ خُدا کی برگزیدہ شخصیتوں کے واقعات و احوال کے ذریعہ سے وہ بچّوں کے اندر بلند کرداری اور اخلاقی فضیلت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ نئی نسل جب معرکۂ زندگی میں قدم رکھے تو اُس کے سامنے انسانیت و اخلاق کا صرف وہ نمونہ ہو جو اللہ کے پیغمبروں اور نبیوں نے پیش کیا ہے۔ اس رنگ میں مصر کے دُوسرے ادباء نے بھی اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ کامل کیلانی مرحوم تو ساری زندگی "بچّوں کے مصنّف" کہلاتے رہے۔ مگر سیّد قطب کے انداز میں جو سلاست و لطافت اور جذبہ و اخلاص جھلکتا ہے اس میں وہ منفرد نظر آتے ہیں۔ اِس دَور میں انہوں نے بچّوں کے لیے اسلامی اور وطنی گیت بھی لکھے ہیں۔

قلم نے جب مزید ترقی کی طرف قدم اُٹھائے تو اظہارِ خیال کے زاویے بھی بدل گئے۔ جوانی کی پنکھڑیاں کھل رہی تھیں کہ اُن کا پہلا افسانہ "اشواک" (کانٹے) دُنیائے ادب کے اندر نمودار ہوا۔ اس افسانے کے اندر انہوں نے ایک ایسی پاکیزہ محبّت کی داستان بیان کی ہے جس کا انجام ناکامی ہوا ہے۔ اس افسانہ کو پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ وہ ایک ایسے کردار کے ساتھ ہمسفر ہے جو انتہائی کریم النّفس اور بلند اخلاق ہے۔ موصوف افسانے کے انتساب میں لکھتے ہیں:

"اُس کے نام جو میرے ساتھ وادئ پُرخار میں ہمسفر رہی۔ مَیں بھی آبلہ پا ہوا اور وہ بھی آبلہ پا ہوئی۔ مَیں بھی سوختہ نصیبی سے دوچار ہوا اور وہ بھی سوختہ ارماں نکلی۔ پھر وہ الگ راستے پر چل پڑی اور مَیں الگ راستے پر چل پڑا۔ اس حال میں کہ معرکۂ سوز و ساز میں ہم دونوں زخمی ہو چکے تھے۔ نہ اُس کی جان کو قرار مِلا اور نہ میری جان آشنائے سکوں ہوئی۔"

اشواک کے بعد افسانوی طرز کی دو اور کتابیں انہوں نے لکھّیں۔ ایک طفلٌ من القریۃ (گاؤں کا بچہ) اور دوسری المدینۃ المسحورہ (جادو کا شہر)۔ پہلی کتاب میں انہوں نے داستان کے رنگ میں اپنی بچپن کی زندگی اور دیہاتی ماحول کا نقشہ کھینچا ہے۔ دیہاتی زندگی کی سادگی اور طہارت۔ دیومالائی کہانیاں، بیماریاں، جہالت، سخاوت، رواداری اور جوشِ انتقام الغرض ہر ہر پہلو کو بڑے لطیف اسلوب میں بیان کیا ہے۔ جس زمانے میں سیّد قطب نے یہ کتاب لکھّی تھی اس زمانے میں وہ مصر کے نامور ادیب طٰہٰ حسین کے حلقہ سے وابستہ تھے۔ طٰہٰ حسین کے طرز سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے اپنی یہ کتاب بھی

ہو بہو طٰہٰ حسین کی "الایام" کے رنگ میں لکھی۔ اور اسے منسوب بھی طٰہٰ حسین کے نام کیا کہ "امید ہے کہ وہ اس کہانی کو بھی "الایام" کے چند ایام کی حیثیت سے قبول فرمائیں گے" المدینۃ المسحورۃ محض ایک ادبی داستان ہے۔ اور عہد ماضی کے شاہی محلات کا عکس پیش کرتی ہے۔ سیّد نے اپنی زندگی میں صرف یہ تین افسانے رقم کیے ہیں۔

اس دَور کی ایک اور بے نظیر کتاب الاطیاف الاربعۃ ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں چاروں بہن بھائی (سیّد قطب، محمد قطب، حمیدہ قطب اور امینہ قطب) شریک ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے انسان دوست اہلِ قلم کی حیثیّت سے انسانی زندگی کی واردات کو بیان کیا ہے۔ انسان کی خدمت، انسان سے محبّت اور انسانیّت کے لیے قربانی کا جذبہ چاروں کے اندر قدر مشترک ہے۔

سیّد موصوف کو طالب علمی کے دَور میں شعر و ادب اور صحافت سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ دار العلوم قاہرہ میں ان کی طالب علمی اور پھر پروفیسری کا جو زمانہ گزرا ہے وہ اُن کے ادبی ذوق کو نکھارنے اور اُسے ترقی دینے میں بڑا ممد ثابت ہوا۔ اِس دَور میں انہوں نے قاہرہ کے چوٹی کے ادباء اور اربابِ صحافت سے راہ و رسم پیدا کر لی تھی۔ پہلے طٰہٰ حسین کے حلقۂ ارادت سے منسلک ہوتے بلکہ طٰہٰ حسین کے پرائیویٹ سیکرٹری بھی رہے۔ اور پھر عبّاس محمود العقاد کی مجلس ادب و علم کے گُلِ سرسبد بنے۔ مصطفٰے صادق الرافعی کی طٰہٰ حسین اور عقّاد کے ساتھ ٹھنی رہتی تھی۔ مصطفٰے صادق الرافعی بیسویں

صدی کے جاحظ تھے۔ ان کی انشا پردازی میں قرآنی ادب کی چاشنی ہوتی تھی۔ قرآن کی بلاغت و ایجاز اور قرآن کے ادبی و معنوی مقام کو رافعی نے جس قدرت و ندرت اور عربی مبین کے ساتھ بیان کیا ہے اُس کی وجہ سے انہیں "قرآنی ادیب" کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ طٰہٰ حسین اور عقّاد اُن کے مقابلے میں ہیچ نظر آتے ہیں۔ رافعی اور عقّاد کے مجادلات میں سیّد قطب عقّاد کا دفاع کرتے رہے۔ یہ دفاع اگرچہ دفاع ناکام تھا مگر سیّد قطب کو اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ ان کے ادب و انشا کا رشتہ خداوندِ عالم کی کتابِ اعجاز کے ساتھ بندھ گیا۔ انہوں نے ادبی ذوق کی سیرابی اور اسالیب بلاغت اور اصول ایجاز کی جستجو میں قرآن کا مطالعہ کیا۔ اور اسی مطالعہ کے دوران اللہ تعالیٰ نے اُن پر اپنی حکمت و ہدایت کے دروازے بھی وا کر دیے۔ یہ سیّد کے اخلاص اور پاکیزگی اور طلبِ صادق کا کرشمہ ہے کہ قرآن نے اُن کو ادب کے لازوال خزانے بھی عطا کیے اور ہدایت کا ابدی نُور بھی ارزاں فرمایا ؎

جمیع العلم فی القرآن لکن

تقاصر عنه افهام الرّجال

نئے ذہن و ذوق کے تقاضے میں سیّد قطب کے قلم سے جو گوہر ہائے بے بہا دنیائے ادب کی زینت میں اضافہ کا موجب ہوئے وہ یہ ہیں:

۱: مشاهد القیامة فی القرآن: اس کتاب میں سیّد قطب نے مناظر قیامت بیان کیے ہیں۔ یہ مناظر قرآن کی ۱۱۴ سورتوں میں سے ۸۰ سورتوں میں ۱۵۰ مواقع پر بیان کیے گئے ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں: اس کتاب میں مَیں نے

جو چیز بیان کی ہے اُسے میں نے "مناظر" کا نام دیا ہے۔ منظر میں تصویر، حرکت اور تاثیر کے پہلو بھی شامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ مصنّف نے آخرت کے مناظر کی جو نقشہ کشی کی ہے اور جس حیرت انگیز اور مؤثر اسلوب میں واقعہ نگاری کی ہے وہ تعریف و توصیف سے بالا ہے۔ پڑھنے والا صرف الفاظ سے ہی محظوظ نہیں ہوتا بلکہ آیاتِ جنّت کو پڑھتے ہوئے جنّت کے لذائذ اور آیاتِ دوزخ پڑھتے ہوئے دوزخ کی شعلہ سامانیوں کو بھی محسوس کرتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف دعوت کے نقطۂ نظر سے بے مثال ہے بلکہ ادب و فن کا بھی شاہکار ہے۔ سیّد قطب نے ماہر انشاپرداز اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالامال فن کار کے موقلم سے اس کتاب کو زندۂ جاوید صحیفہ بنا دیا ہے۔

۲۔ التصویر الفنی فی القرآن: یہ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل کتاب ہے۔ سیّد قطب کا قلم قرآن کے موضوع پر بڑی پختگی، خود اعتمادی اور دقّت رسی کے ساتھ چلتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ قرآن ان کا اصل موضوع ہے۔ التصویر الفنی میں انہوں نے قرآن کی ادبی قدر و قیمت اُجاگر کی ہے۔ قرآن کی جادُو بیانی، جادُو بیانی کا منبع، قرآن کیسے سمجھا گیا، قرآن کے مناظر کی فنّی نقشہ کشی، حسّی تخییل، فن کے لحاظ سے نظم کلام، قرآنی قصّے۔ قصّوں کے اغراض و مقاصد، قصّہ گوئی میں فنّ اور دین کا امتزاج، قصّہ کے فنّی خصائص، قصّہ میں واقعہ نگاری کا جُز، قرآن کے انسانی نمونے، وجدانی منطق اور قرآن کا طریقِ دعوت ان تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ المجمع العلمی العربی (عربک اکیڈمی) کے تبصرہ کی رُو سے آج تک اس طرز کی کوئی کتاب اس جامعیت کے ساتھ نہیں

لکھی گئی۔ یہ دونوں کتابیں مصر کے مشہور ادارے دار المعارف نے شائع کیں اور علمی وادبی حلقوں میں انہیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مراکش کے مشہور عالم وادیب علال الفاسی کے الفاظ میں: "یہ دونوں کتابیں بتاتی ہیں کہ مصنّف عربی زبان وادب میں بہت اُونچا مرتبہ رکھتا ہے اور قرآن کے اعجازی اسلوب کا اُسے پختہ مذاق حاصل ہے۔" اسی دور میں ادبی نقد ونظر پر بھی ان کی دو کامیاب کتابیں سامنے آئیں۔ النقد الادبی: اصولہ و مناھجہ (تنقید کے اصول ومناہج) ۔ اور طٰہٰ حسین کی کتاب "مستقبل الثقافۃ" پر تنقید۔ عربی ادبیات کا طالب علم ان دونوں کتابوں سے صرف نظر کرکے عربی ادب کے جدید رُجحانات کا کامل احاطہ نہیں کر سکتا۔ مصنّف نقّاد کے فرض اور غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: نقّاد کا اصل کام فنّ کے لحاظ سے ادبی کام کی اصلاح ہے۔ نقّاد یہ واضح کرتا ہے کہ جس ادبی کوشش کا وہ نقد واحتساب کر رہا ہے موضوع کے لحاظ سے اُس کی قدر وقیمت کیا ہے، اظہار وبیان اور احساس ووجدان کی رُو سے اُس کا کیا معیار ہے، چمنستانِ ادب میں اُس کا کیا مقام ہے، ادبی ذخیرے میں اُس سے کیا کچھ اضافہ ہوا ہے، ادیب ماحول سے کس حد تک اثر پذیر اور ماحول پر کس حد تک اثر انداز ہوا ہے، ادیب کی وجدانی اور بیانی خوبیاں کیا ہیں، وہ نفسیاتی اور خارجی عوامل کیا ہیں جو ادیب کی ترتیب وساخت میں حصّہ لے رہے ہیں۔"

صحافت کی طرف رُخ

سیّد قطب اِس دور میں اگرچہ صرف بحرِ ادب میں شناوری کر رہے

تھے مگر ان کے احساس و وجدان کی دنیا ماحول کی ہر لہر سے متاثر ہو رہی تھی۔
یہ وہ دور تھا جب مصر کے سینہ پر انگریزی استعمار دندنا رہا تھا۔ ایک طرف انگریزوں
اور پاشاؤں نے لوٹ کھسوٹ مچا رکھی تھی اور دوسری طرف فلاحین اور عمال
طرح طرح کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ یہ تمام حالات ان کے ذہن و
وجدان کی دنیا پر اپنی پرچھائیاں ڈال رہے تھے۔ چنانچہ انہی جذبات کو لیے ہوئے
سید موصوف نے پہلے ماہنامہ "العالم العربی" کی ادارت کا کام ہاتھ میں لیا اور
پھر "الفکر الجدید" کے نام سے اپنا ایک ماہ نامہ جاری کیا۔ جس کی مالی پشت پناہی
مصر کے ایک نیک دل کتب فروش محمد حلمی المنیاوی نے کی۔ اسی پرچے کے
اندر سید قطب کے رجحانات سوشلزم کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ جو اس وقت
کے حالات کی پیداوار تھے۔ چنانچہ اس پرچے میں انہوں نے متواتر مصر کے
جاگیرداری نظام اور پاشاؤں کی دھاندلیوں پر حملے کیے۔ اور سرمایہ دارانہ
استحصال کو چیلنج کیا۔ حالانکہ اُس وقت جاگیرداری نظام پوری قوت کیساتھ
قائم تھا۔ پاشاؤں کا طبقہ اوج کمال پر تھا اور سرمایہ داریت ملک کی زمامِ اقتدار
پر قابض تھی۔ الفکر الجدید جس سوشلزم کا داعی تھا وہ سوشلزم اس مفہوم کا حامل
نہ تھا جس مفہوم کے ساتھ وہ آج اپنے آپ کو متعارف کرا رہا ہے۔ ان کا
سوشلزم سرمایہ داریت اور جاگیرداری کے ظلم و ستم کے خلاف تھا اور اسلام کی
تلوار سے ان کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔ دولت کی ذخیرہ اندوزی اور اجارہ داری
کو قرآن کی آیات کی روشنی میں ناجائز ثابت کرتا تھا۔ اور قرآن کے اقتصادی
نظام کی طرف رجوع کی دعوت دیتا تھا۔ اُس کا بنیادی نصب العین عدل و

انصاف کا قیام، غربا اور مساکین کی دستگیری اور زیر دستوں کو زبردستوں کے مظالم سے نجات دلانا تھا۔[1]

سفر امریکہ کے نتائج

اسی زمانے میں سیّد موصوف کو امریکہ جانے کا موقع مِل گیا۔ وہاں انہوں نے مغرب کی مادّی تہذیب اور اُس کی قیامت سامانیوں کا بچشمِ خود مشاہدہ کیا۔ اُن کے سامنے مغرب کا مصنوعی جمہوری نظام تھا۔ جس میں رنگ و نسل کی بنیاد پر انسان اور انسان میں تفریق روا رکھی جا رہی تھی اور گورا انسان کالے انسان پر انسانیت سوز مظالم توڑ رہا تھا۔ چنانچہ انہیں یقین ہو گیا کہ جس مغرب کی جمہوریت نوازی کا دنیا میں ڈھول پیٹا جا رہا ہے وہ انسانیت سے کوسوں دُور ہے۔ اور صرف اسلام ہی وہ دینِ حق ہے جو انسانیت کو فلاح و کامرانی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ وہ جب امریکہ سے واپس آئے تو ان کے دل میں نسلی امتیاز، کھوکھلے جمہوری نظام، اور انصاف و حریت کے جھوٹے مدّعیوں کے خلاف جذبات کا شدید تلاطم برپا تھا۔ اور دوسری طرف ان کے دِل میں اسلام کی قدر و قیمت بڑھ گئی اور اسلامی اقدار اور تعلیمات سے ان کی شیفتگی دوبالا ہو گئی۔ امریکہ سے واپسی پر انہوں نے اپنے ان تاثرات کو "امریکا التی رأیت" (امریکہ، جسے مَیں نے دیکھا) نامی کتاب میں پیش کیا۔ امریکہ کا سفر اُن کے لیے زندگی کا زبردست انقلاب بن کر آیا۔ واپسی پر وہ

---

[1] الشہید سیّد قطب ص ۲۶، ۲۷۔

ہمہ تن اسلام کے مطالعہ کے لیے وقف ہو گئے ۔ اور اسلام کے اصل مآخذ سے تشنگی بجھانے میں مشغول ہو گئے ۔ ان کے مطالعہ و جستجو کا یہ حال تھا کہ ان کے یومیہ مطالعہ کے اوقات دس گھنٹوں سے کم نہ ہوتے تھے ۔ اسی مطالعہ کی بدولت اُن کا تعلق مصر کی اسلامی تحریک سے قائم ہوا ۔ اور یُوں ذہنی انقلاب کا سفر جو مشاہد القیامۃ فی القرآن کی تصنیف سے شروع ہوا تھا اخوان المسلمون کی عملی تحریک سے وابستگی پر منتج ہوا[1] ۔ ان کی مشہور اور معرکۃ الآرا کتاب العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام (اسلام کا عدلِ اجتماعی) اسی دور کی تصنیف ہے ۔

"العدالۃ الاجتماعیۃ" کی تالیف

العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام ۱۹۴۸ء میں پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آئی ہے ۔ اب تک اس کے سات ایڈیشن نکل چکے ہیں ۔ ہر ایڈیشن میں سیّد موصوف اپنے تازہ مطالعہ کی بنا پر ترمیم و اضافہ کرتے رہے ہیں[2] ۔ اس کتاب کے ساتویں باب میں سیّد موصوف نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور بنو اُمیّہ کے بارے میں جس نقطۂ نظر کا اظہار کیا تھا ساتویں ایڈیشن میں اُنھوں نے

---

[1] ایضاً ص ۲۷

[2] علال الفاسی لکھتے ہیں : سیّد کی اس تصنیف پر مَیں نے بعض مقامات پر گرفت کی ۔ چنانچہ دُوسرے ایڈیشن میں انھوں نے ان مقامات پر تبدیلی کر دی (روزنامہ العلم ، مراکش ، شمارہ ۲ ستمبر ۱۹۶۶ء)

اُس میں مکمل تبدیلی کر دی تھی - اور کوئی قابلِ اعتراض بات باقی نہیں رہنے دی ہے - یہ تبدیلی ایامِ اسیری میں کر دی گئی تھی مگر حالات کی وجہ سے اس کی طباعت کی کوئی سبیل نہ پیدا ہو سکی - ان کی شہادت کے بعد یہ ترمیم شدہ ایڈیشن چھپ چکا ہے - اور عرب ممالک میں وسیع پیمانے پر تقسیم ہو رہا ہے - اس کتاب کے دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں - اس کا انگریزی ترجمہ "سوشل جسٹس اِن اسلام" کے نام سے امریکن کونسل آف لرنڈ سوسائٹیز واشنگٹن کی جانب سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہو چکا ہے - فارسی، ترکی، انڈونیشی اور اُردو میں بھی ترجمے چھپ چکے ہیں - اِس کا اُردو ترجمہ "اسلام کا عدلِ اجتماعی" کے نام سے اسلامک پبلیکیشنز لاہور نے شائع کیا ہے - یہ ترجمہ ہمارے دوست ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی صاحب (بھارت) نے کیا ہے -

تفسیر "فی ظلال القرآن"

سید قطب کا سب سے عظیم کارنامہ ان کی تفسیر قرآن ہے جو "فی ظلال القرآن" کے نام سے ۸ جلدوں میں چھپ چکی ہے - دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہو رہے ہیں - فارسی میں "در سایۂ قرآن" کے نام سے اس کے دس پارے چھپ چکے ہیں - اِس تفسیر کا آغاز انہوں نے ۱۹۵۴ء کی اسیری سے پہلے کر دیا تھا اور جیل میں اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا - یہ اصطلاحی معنی میں تفسیر نہیں ہے، اور نہ متداول تفاسیر کے اسلوب میں اسے لکھا گیا ہے - یہ دراصل ان تاثرات سے عبارت ہے جو مطالعۂ قرآن کے دوران اُن پر طاری ہوئے ہیں - لیکن ان تاثرات کو مصنف نے اس طرح پیش کیا ہے کہ قرآن کی

ایک ایک آیت کے اندر دعوت و اصلاح اور تنبیہہ و تذکیر اور نور و عرفان کے جو سمندر موجزن ہیں اُن کا عکس کاغذ کے صفحات پر منتقل ہو گیا ہے۔

"فی ظلال القرآن" (قرآن کے زیرِ سایہ) چھ بُنیادی خوبیوں کی حامل ہے:

۱۔ بلند پایہ ادبی اسلوب، جس میں سیّد قطب اکثر قدیم مفسّرین اور محدّثین سے بھی بڑھ گئے ہیں۔

۲۔ تمام معروف تفاسیر سے اُنہوں نے استناد کیا ہے۔ اور اُن سے اخذ کردہ معلومات کو اپنی تفسیر میں اس عالمانہ انداز سے سمو دیا ہے کہ یہ تفسیر ادبی مقالات کا مجموعہ نہیں بلکہ معلومات کا دائرۃ المعارف بن گئی ہے۔

۳۔ اسرائیلیات سے یہ تفسیر مکمّل طور پر خالی ہے۔

۴۔ معتزلہ و خوارج اور اشاعرہ اور ماتریدیہ اور فقہ کے مختلف مکاتبِ فکر کے نزاعات سے جو عام عربی تفسیروں کے اندر ملتے ہیں یہ تفسیر خالی ہے۔

۵۔ پُوری جامعیّت اور تفصیل کے ساتھ ہر ہر بحث کو ادا کیا ہے، اس کے بعد کسی اور کتاب کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

۶۔ پُوری تفسیر کے اندر ایک ایسی شفّاف اور پاکیزہ رُوح جلوہ گر نظر آتی ہے جو یقین و اذعان کی دولت اور ایمان و عقیدہ کی گہرائی اور صبر و عزیمت کی نعمت سے لبریز ہے۔ اِس چیز نے تفسیر کو ایک متحرّک زندگی اور رواں دواں اِسلامی تحریک کی کتاب ہدایت کی شکل دے دی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دُنیا کے تمام علماء نے اس تفسیر کی بڑی تعریف و توصیف کی ہے۔ اور باوجودیکہ یہ مکمّل طور پہ چھپ چُکی ہے اور مکتبوں سے بآسانی مِل

سکتی ہے مگر عرب ممالک کے اخبارات و رسائل اسے مسلسل اپنے کالموں میں نقل کر رہے ہیں۔

تمام تصانیف ایک نظر میں

سیّد موصوف کی تمام تصانیف کی تعداد ۲۲ ہے۔ جن کی مکمل فہرست یہ ہے:

۱۔ فی ظلال القرآن (قرآن کے زیر سایہ)

۲۔ العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام (اسلام کا عدلِ اجتماعی)

۳۔ مشاہد القیامۃ فی القرآن۔ (قرآن میں قیامت کے مناظر)

۴۔ التصویر الفنی فی القرآن (قرآن کے فنّی پہلو)

۵۔ معرکۃ الاسلام والرأسمالیۃ (اسلام اور سرمایہ داری کی کشمکش)

۶۔ السلام العالمی والاسلام[1] (عالمی امن اور اسلام)

۷۔ دراسات اسلامیہ (اسلامی مقالات)

۸۔ النقد الادبی: اصولہ و مناہجہ (ادبی تنقید کے اصول و مناہج)

۹۔ نقد کتاب مستقبل الثقافۃ ("مستقبل الثقافۃ" پر تنقیدی نظر)

---

[1] "السلام العالمی والاسلام" اپنے موضوع کی نہایت بے نظیر اور عمیق کتاب ہے۔ مراکش کے مجاہد کبیر علال الفاسی لکھتے ہیں: "اے کاش، یہ میری تصنیف ہوتی" روزنامہ العلم مراکش، شمارہ ۲ ستمبر ۱۹۶۶ء

۱۰۔ کتب و شخصیات (کتابیں اور شخصیتیں)

۱۱۔ نحو مجتمع اسلامی (اسلامی معاشرہ کے خدوخال)

۱۲۔ امریکہ التی رأیت (امریکہ جسے میں نے دیکھا)

۱۳۔ اشواک (افسانہ)

۱۴۔ طفل من القریة (گاؤں کا بچّہ)

۱۵۔ المدینة المسحورة (سحر زدہ شہر)

۱۶۔ الاطیاف الاربعة (چاروں بہن بھائیوں کے افکار و تخیّلات کا مجموعہ)

۱۷۔ القصص الدینیة (انبیاء کے قصّے، باشتراک جودہ السحّار)

۱۸۔ قافلة الرخیق (مجموعہ اشعار)

۱۹۔ حلم الفجر (مجموعہ اشعار)

۲۰۔ الشاطئ المجہول (مجموعہ اشعار)

۲۱۔ مہمة الشاعر فی الحیاة (زندگی کے اندر شاعر کا اصل وظیفہ)

۲۲۔ معالم فی الطریق (نشانِ راہ، ہم نے اس کا نام جادہ و منزل تجویز کیا ہے)

شعروسخن سے شغف

سیّد موصوف کی طبعِ رسا نے شعروسخن کے اندر بھی جولانیاں دکھائی ہیں۔ ان کے اشعار کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں۔ شعروسخن سے اُن کا لگاؤ ان کی ادبی زندگی کے آغاز میں ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے اساتذہ کی صحبت نے اس جذبہ کو مہمیز کا کام دیا۔ ان کی شاعری میں تمام اصنافِ سخن ملتی ہیں البتّہ قصیدہ سرائی

اور مدّاح گوئی کو انہوں نے ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ صنف ان کی طبع بیباک اور فطرت پاکیزہ سے ہم آہنگ نہ تھی۔ وہ شروع سے ریاکاری اور تملّق پیشگی سے متنفّر تھے۔ ان کا سب سے پہلا مجموعہ اشعار قافلۃ الرقیق (غلاموں کا کارواں) ہے۔ وہ اپنے اس مجموعہ سے زیادہ خوش نہ تھے۔ آخری ایّام میں وہ اس مجموعہ کو اپنی "دورِ جاہلیّت" کی یادگار کہتے رہے۔ ان کی تمنا تھی کہ اگر اس مجموعہ کے تمام نسخے اُن کے ہاتھ لگ جائیں تو ان کے اندر وہ تخیّل، موضوع اور مقصد و غایت کے لحاظ سے جوہری تبدیلی کر ڈالیں۔ سیّد موصوف کی آخری نظم جو انہوں نے اپنے آخری ایّام اسیری میں کہی ہے۔ بڑی مؤثر اور دلنشین ہے، اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں[1]

اخی انت حرٌّ وراء القیود اخی انت حرٌّ تبلک السدود

اذا کنت باللہ مستعصما فماذا یضیرک کید العبید

اے میرے ہمدم تو طوق و سلاسل کے اندر بھی آزاد ہے۔
اے میرے دمساز! تو آزاد ہے، رکاوٹوں کے باوجود
اگر تیرا اللہ پر بھروسہ ہے
تو اِن غلام فطرت انسانوں کی چالیں تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

---

[1] یہ اشعار ہم نے ایک طویل نظم سے لیے ہیں جو ماہنامہ الایمان، مراکش، بابت اکتوبر و نومبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی ہے۔

اخی ستبید جیوش الظلام ویشرق فی الکون فجر جدید
فاطلق لروحک اشراقها تری الفجر یرمقنا من بعید

برادرم! تاریکی کے لشکر مٹ کر رہیں گے۔
اور دُنیا میں صبح نو طلوع ہو کر رہے گی۔
تو اپنی رُوح کو ضوفشاں ہونے دے۔
وہ دُور دیکھ صبح ہمیں اشارے کر رہی ہے۔

اخی قد سرت من یدیک الدماء ابت ان تشل بقید الاماء
سترفع قربانها للسماء مخضبۃ بوسام الخلود

جانِ برادر! تیرے ہاتھوں سے خون کے فوّارے چھوٹے
مگر تیرے ہاتھوں نے کمترین مخلوق کی زنجیروں کے اندر بھی شل ہونے سے انکار کر دیا۔
تیرے ان ہاتھوں کی قربانی آسمان پر اُٹھ جائے گی (منظور ہوگی)
اس حالت میں کہ یہ ہاتھ خلعتِ دوام سے گُلرنگ ہوں گے۔

اخی ان ذرفت علی الدموع وبللت قبری بها من خشوع
فاوقد لهم من رفاتی الشموع وسیروا بها نحو مجد تلید

میرے ہمسفر! اگر تو مجھ پر آنسو بہائے
اور میری قبر کو اُن سے تر کر دے

تو میری ہڈیوں سے ان تاریکی میں رہنے والوں کے لیے شمع فروزاں کرنا۔
اور ان شمعوں کو ابدی شرف کی جانب لے کر بڑھنا۔

اخی ان امت دون احبابنا　　فروضات ربّی اعدت لنا
واطیارھا رفرفت حولنا　　فطوبی لنا فی دیار الخلود

میرے رفیق! اگر میں احباب کو چھوڑ کر موت کی آغوش میں چلا بھی جاؤں، تو
کوئی خسارہ نہیں۔
میرے ربّ کے باغات ہمارے لیے تیار ہیں۔
ان کے مرغانِ خوشنوا ہمارے اردگرد محوِ پرواز ہیں۔
اس ابدی دیار کے اندر ہم خوش و خرّم ہیں۔

اخی اننی ماسئمت الکفاح　　ولا انا القیت عنّی السلاح
وان طوقتنی جیوش الظلام　　فانی علی ثقۃ بالصباح

میرے دوست! معرکہ عشق سے میں ہرگز نہیں اُکتایا۔
اور میں نے ہرگز ہتھیار نہیں ڈالے۔
اگر تاریکی کے لشکر مجھے چاروں طرف سے گھیر بھی لیں
تو بھی مجھے صُبح کے طلوع کا پختہ یقین ہے۔

فان انامت فانی شہید　　　　وانت ستمضی بنصر جدید

فقد اختارنا اللہ فی دعوتہ　　　　وانا سنمضی علی سنتہ

اگر مَیں مرجاؤں تو مجھے شہادت کا درجہ نصیب ہوگا۔
اور تُو انشاء اللہ نئی کامرانی کے جلو جانب منزل رواں دواں رہے گا۔
اللہ تعالیٰ نے اپنی دعوت کے لیے ہمارے نام قرعہ فال ڈالا ہے۔
بیشک ہم سنّت الٰہی پر گامزن رہیں گے۔

فمنا الذین قضوانحبہم　　　　ومنا الحفیظ علی ذمتہ

ہم میں سے کچھ لوگ تو اپنا فرض انجام دے گئے۔
اور کچھ اپنے عہد و پیمان پر ڈٹے ہوئے ہیں۔

سأفدی ولکن لرب و دین　　　　وامضی علی سنتی فی یقین

فاما الی النصر فوق الانام　　　　واما الی اللہ فی الخالدین

میں بھی اپنے آپ کو نچھاور کروں گا، لیکن صرف پروردگار اور دین حق پر۔
اور یقین واذعان میں سرشار اپنے راستے پر چلتا رہوں گا۔
یہاں تک کہ یا تو اس دُنیا پر نصرت سے بہرہ یاب ہو جاؤں
اور یا اللہ کی طرف چلا جاؤں اور زندگی جاوداں پانے والوں میں شامل ہو
جاؤں۔

معالم فی الطریق

"معالم فی الطریق" سیّد موصوف کی آخری تصنیف ہے، جس میں اُن کی نئی تحریروں کے ساتھ کچھ پُرانی تحریریں بھی ترمیم و اضافہ کے بعد شامل کی گئی ہیں۔ اِسی کتاب کو ہم "نشانِ راہ" کے نام سے اُردو دان احباب کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ یہی وہ کتاب ہے جس نے سیّد قطب کو تختۂ دار تک پہنچایا ہے۔ جہاں تک سیّد قطب کی انقلابی شخصیت اور تحریکی جوش و ولولہ کا تعلّق ہے بے شک اس میں وہ اپنے دَور کے چند گِنے چُنے لوگوں میں سے ہیں۔ جب مصر میں فوجی انقلاب برپا ہوا تھا اُس میں سیّد قطب نے جو کردار ادا کیا تھا۔ اُس کی بنا پر بعض مصری مصنّفین نے ان کو "انقلابِ مصر کا میرابو" کا لقب دیا ہے۔ "میرابو" سے اُن کا اشارہ اُس فرانسیسی رائٹر کی طرف ہے جو فرانس کے اندر جاگیرداری اور استبداد کے خلاف انقلاب برپا کرنے کے لیے عوام کو اُکساتا رہا ہے۔ سیّد قطب کی کتاب "معرکۃ الاسلام والرأسمالیۃ" میں یہ انقلابی رُوح صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ اور یہ اُس دَور میں لکھی گئی ہے جب وہ تمام بڑے بڑے جغادری جو اس وقت "اشتراکیت" اور "مساوات" اور اسی نوعیّت کے دُوسرے نعروں سے ہنگامہ نشور برپا کیے ہوئے ہیں منقار زیرِ پر تھے۔ "معالم فی الطریق" میں انہوں نے اسلامی نظریہ اور اِسلامی تنظیم کے بنیادی خدّوخال بیان کیے ہیں۔ اس کتاب کی پُوری اسکیم جس بنیادی نقطہ پر مرکوز ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح اسلام کے صدرِ اوّل میں اِسلامی معاشرہ ایک مستقل اور جُداگانہ معاشرہ کی صورت میں ترقّی ونمو

کے فطری مراحل طے کرتا ہوًا بامِ عروج کو پہنچا تھا اِسی طرح آج بھی ویسا صحیح اسلامی معاشرہ وجود میں لانے کے لیے اُسی طریقِ کار کو اختیار کیا جانا لازم ہے۔ اس اسلامی معاشرے کو اِردگرد کے جاہلی معاشروں سے الگ رہ کر اپنا تشخص قائم کرنا ہوگا۔

فردِ قرار دادِ جُرم

لیکن مصری حکّام نے سیّد قطب کی اس صحیح اسلامی دعوت کو یہ معنی پہناتے کہ اِس میں حکومتِ وقت کے خلاف انقلاب برپا کرنے کے لیے لوگوں کو اُکسایا گیا ہے۔ کتاب میں سیّد قطب نے جو کچھ کہا ہے وہ قارئین کتاب کے مطالعہ سے معلوم کرلیں گے۔ اس لیے کتاب کے مضامین کو یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتّہ اس کتاب کے مختلف اقتباسات سے جو فردِ جُرم تیار کی گئی ہے، وہ ہم ہو بہو نقل کیے دیتے ہیں۔ یہ فردِ جُرم "مسلّح افواج کے میگزین" (مجلّة القوات المسلحة) کے نمبر ۴۴۶، شمارہ یکم اکتوبر ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے کہ سیّد قطب کے خلاف فوجی ٹربیونل میں مقدّمہ چل رہا تھا۔ اس میگزین نے پہلے تو سیّد قطب کو باغی اور غدّار کہا ہے۔ اور ان پر الزام عاید کیا ہے کہ وہ مصر کے اندر وسیع پیمانے پر توڑ پھوڑ کرنا چاہتے تھے اور مصری حُکّام اور مصر کے نامور ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو قتل کرنے کی اسکیم تیار کر رہے تھے۔ اس کے بعد میگزین نے ان الزامات کے ثبوت کے لیے "معالم فی الطریق" کی عبارتوں کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے اور لکھا ہے:

"مصنّف (سیّد قطب) کا دعویٰ ہے کہ مغرب میں جمہوریّت کا قریب قریب دیوالیہ نکل چکا ہے۔ لہٰذا اب اُس کے پاس ایسی "اقدار" باقی نہیں رہی ہیں جو وہ انسانیّت کی خدمت میں پیش کر سکے۔ مارکسزم کے بارے میں بھی اُس کی یہ رائے ہے کہ مشرقی کیمپ کا یہ نظریہ بھی اب پسپا ہو رہا ہے۔ انسانی فطرت اور اُس کے مقتضیات کے ساتھ اس کی کشمکش برپا ہے۔ یہ نظریہ صرف پامال شُدہ اور زبوں ماحول کے اندر پنپ سکتا ہے۔ اس کے بعد مصنّف یہ فیصلہ دیتا ہے کہ اب انسانیّت کو نئی لیڈرشپ کی ضرورت ہے جو مادّی تہذیب کو جس تک انسانیّت یورپ کے عبقری ذہن کی بدولت پہنچی ہے، قائم اور بحال رکھ سکے اور اُسے مزید نشو ونما دے سکے۔ وہ کہتا ہے: یورپ کی علمی تحریک بھی اب اپنا رول ادا کر چکی ہے اور اٹھارہویں اور اُنیسویں صدی کے دَوران وہ اپنے کمال کو پہنچ گئی تھی۔ اب اُس کے پاس کوئی سرمایۂ حیات باقی نہیں رہا ہے۔ یہی حال وطنی اور قومی نظریات کا ہے۔ لہٰذا اُمّتِ مسلمہ کے وجود کو بحال کیا جانا ناگزیر ہے۔ ان خیالات کے بعد مصنّف یہ دعویٰ کرتا ہے کہ آج دُنیا جاہلیّت کے اندر غرق ہے۔ اس جاہلیّت نے دُنیا کے اندر اللہ کے اقتدار پر اور اللہ کی حاکمیّت پر جو الوہیت کی صفت خاص ہے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔"

"مصنّف قرآن کو عقیدہ کا اساسی مآخذ قرار دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم جاہلی معاشرے کے تسلّط سے نجات حاصل کریں، اور اُس کے ساتھ مصالحت کی روش اختیار نہ کریں اور نہ اُس کے ساتھ وفاداری کا

موقف پسند کریں۔ ہمارا مشن موجودہ جاہلی نظام کو بنیادی طور پر تبدیل کر ڈالنا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی اقدار اور تصورات میں ذرہ بھر بھی تبدیلی نہ کرنی چاہیئے، اور نہ جاہلی نظام کے ساتھ کسی مقام پر سودا بازی کا خیال تک کرنا چاہیئے۔ یہ مہم سرانجام دینے کے لیے ہمیں غیر معمولی قربانیاں دینا ہوں گی۔"

"اس فیصلہ کے بعد مصنّف مختلف اسالیب اختیار کر کے یہ دعوت دیتا ہے کہ ارضی اقتدار کے خلاف انقلاب برپا کرو جس نے الوہیت کی صفت خاص پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ اُس کا بیان ہے کہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلّم) بھی عرب قومیت کی تحریک برپا کر کے قبائل عرب کو اپنے گرد جمع کر سکتے تھے۔ اور عربوں کے سلب شدہ علاقوں کو استعماری سلطنتوں (رومن اور فارسی امپائر) سے آزاد کرانے کے لیے اُن کے قومی جذبات بھڑکا سکتے تھے، لیکن یہ صحیح راستہ نہیں تھا کہ دُنیا رُومی اور فارسی طاغوتوں کے چنگل سے نکل کر عربی طاغوت کے چنگل میں گرفتار ہو جائے۔"

"طاغوت سے مراد ہر وہ معبود ہے جو اللہ کے ماسوا ہو۔ طاغوت کا لفظ بُت کدوں کیلیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ اسی مفہوم کی بنا پر طاغوت "گمراہی کے سرغنوں" اور الٰہی اقتدار پر دست درازی کے لیے استعمال کیا گیا۔"

"مصنّف کا بیان ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) دین اسلام لے کر آئے تھے۔ اس وقت عرب معاشرہ انتہائی حد تک بگڑ چکا تھا۔ تقسیم دولت اور عدل و انصاف کا نظام تباہ ہو چکا تھا۔ محدود اقلیت مال و دولت اور تجارت کی اجارہ دار بنی ہوئی تھی۔ اور سُودی کاروبار کے ذریعہ اپنی دولت

میں مزید اضافہ کرتی جارہی تھی۔ رہی اکثریت تو اس کے پاس بھوک اور افلاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس پر مصنّف یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اللہ سُبحانہٗ جانتا ہے کہ معاشرے کے اندر اجتماعی عدل کا نظام ایک ایسے عقیدہ پر استوار ہونا چاہیئے جو ہر معاملے کا فیصلہ اللہ کی طرف لوٹاتا ہو۔ اور معاشرہ تقسیم دولت کے بارے میں اللہ کے عادلانہ فیصلوں کو خوش دلی کے ساتھ قبول کرتا ہو۔ ایسا نظام اُس صورت میں خالصتہً الٰہی نظام بن کر نمودار نہ ہو سکتا تھا اگر اسلام قومی نعرے یا اجتماعی تحریک (یعنی لادینی تحریک) سے اپنی دعوت کا آغاز کرتا۔"

"مصنّف کا یہ نظریہ ہے کہ عقیدہ فوری طور پر ایک متحرّک معاشرے کی شکل میں اُبھر آنا چاہیئے۔ ایک اور مقام پر وہ لکھتا ہے کہ جس جاہلیّت سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سابقہ درپیش تھا وہ ایک "مجرّد نظریہ" نہ تھی، بلکہ ایک متحرّک اور توانا معاشرہ تھی، اور معاشرے کی لیڈرشپ کے آگے سرنگوں تھی۔ لہٰذا انسان کی پُوری کی پُوری زندگی اللہ کی طرف لوٹ جانی چاہیئے۔ انسان زندگی کے کسی معاملے اور کسی پہلو میں اپنی خودمختاری کی بنا پر کوئی فیصلہ کریں۔ نیز جاہلی معاشرے کے اندر ایک نیا متحرّک اور توانا معاشرہ اُبھر آنا چاہیئے جو جاہلی معاشرے سے بالکل الگ تھلگ اور مستقل ہو۔ اور اس جدید معاشرے کا محور ایک نئی قیادت ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے حینِ حیات یہ قیادت آپ کے لیے مخصوص تھی اور آپ کے بعد ہر وہ قیادت یہ منصب سنبھال سکتی ہے جو انسانوں کو صرف اللہ

کی الوہیت، حاکمیت، اقتدار اور شریعت کے آستانہ پر جھکاتے۔ جو شخص یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں وہ جاہلیت کے متحرک معاشرے سے قطع تعلق کرے جس سے وہ نکل کر اسلامی معاشرے میں داخل ہو رہا ہے، اسی طرح جاہلی قیادت سے بھی رشتہ منقطع کر لے، چاہے وہ کاہنوں، پروہتوں، جادوگروں اور قیافہ شناسوں کی مذہبی قیادت ہو، یا سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی قیادت ہو جیسا کہ قریش کو حاصل تھی۔ وہ اپنی تمام تر وفاداریاں نئے اسلامی معاشرے یا اسلامی جماعت کے لیے مخصوص کر دے۔ مسلم معاشرہ ایک کھلا ہوا معاشرہ ہوتا ہے اُس میں ہر نسل و قوم اور ہر رنگ و لسان کے لوگ شامل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی تہذیب کبھی بھی محض "عربی تہذیب" یا "قومی تہذیب" نہ تھی بلکہ وہ ہمیشہ اسلامی اور نظریاتی تہذیب تھی۔"

"مصنف یہ تسلیم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حکم دیا ہے کہ جو قتال کے لیے آئے اُس سے قتال کیا جائے اور جو قتال سے دست بردار ہو جائے اُس سے ہاتھ روک لیا جائے۔ لیکن بایں ہمہ مصنف یہ بھی کہتا ہے کہ اسلام نے صرف دفاع کے لیے جہاد نہیں کیا۔ بلکہ اسلام روزِ اوّل سے یہ نصب العین رکھتا ہے کہ اُن تمام نظاموں اور حکومتوں کو ختم کیا جائے گا جو انسان پر انسان کی حاکمیت قائم کرتی ہیں۔ اسلام کے غلبہ کے بعد افراد کو فکری آزادی نہیں ہو گی کہ وہ اپنی منشا سے جس دین کو چاہیں اختیار کریں۔"

"مصنف نے قرآن کی آیات سے ثابت کیا ہے کہ اگر "اسلامی معاشرے"

کے قیام کے راستے میں مادّی موانع حائل ہو رہے ہوں تو ان کا طاقت کے ذریعہ ازالہ ضروری ہے۔ یہ مصنّف کی طرف سے ایک گھپلا ہے۔ قرآن کی جن آیات سے اُس نے استشہاد کیا ہے وہ قتال فی سبیل اللہ کی دعوت دیتی ہیں نہ کہ قتل و غارت پر اُکساتی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ مصنّف نے باصرار کئی مقامات پر "طاقت" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور وہ بار بار اس سے یہ مُراد لیتا ہے: "رکاوٹوں کا ازالہ"۔ "رائج الوقت نظام کا خاتمہ"۔ "قوانین کا ابطال" وہ کہتا ہے: اگر اللہ تعالیٰ نے ایک مخصوص وقت میں جماعت مسلمہ کو جہاد سے روک دیا تھا تو یہ صرف منصوبہ بندی کا تقاضا تھا، اصولی فیصلہ نہ تھا۔ مصنّف ہر حکمران کو "شریکِ خدا" تصوّر کرتا ہے، اور انسان کے انفرادی حقوق کی پُرزور حمایت کرتا ہے (اس بارے میں مصنّف نے العدالۃ الاجتماعیۃ میں تفصیل سے بحث کی ہے)"

"دوسری طرف مصنّف یہ بیان کرتا ہے کہ وہ معاشرہ جس میں لوگوں کی اجتماعی زندگی رائے و انتخاب کی آزادی پر استوار ہو وہ متمدّن و مہذّب معاشرہ ہوتا ہے۔ لیکن جس معاشرے کی تشکیل میں لوگوں کی آزادانہ رائے کا حصّہ نہ ہو وہ معاشرہ پسماندہ ہے یا اسلامی اصطلاح میں وہ جاہلی معاشرہ ہے۔"

یہ ہے وہ فردِ جُرم جو سیّد قطب پر لگائی گئی ہے۔ اور اسے معالم فی الطریق کے مضامین سے کشید کیا گیا ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سیّد قطب نے اس کتاب میں انقلاب کی اسکیم پیش کی ہے اور اپنے بہن بھائیوں

اور رفقاء کی مدد سے وہ اس اسکیم کو نافذ کرنا چاہتے تھے۔

سیّد قطب اور مولانا مودودی

مصر کے ماہ نامہ الکاتب نے جو مصر کے کمیونسٹ عناصر کا ترجمان ہے۔ سیّد قطب اور ان کے ساتھیوں کے خلاف "عدالتی کارروائی" کے دَوران ایک مفصّل مضمون شائع کیا تھا۔ اس مضمون کا عنوان ہے: "اخوان کے تشدّد پسندانہ نظریات کے مآخذ"۔ اس مضمون کے آغاز میں مضمون نگار نے لکھّا ہے کہ:

"فوجی ٹریبونل نے "معالم فی الطریق" کے مآخذ پر بھی بحث کی ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر ٹریبونل کے صدر نے سیّد قطب سے یہ سوال کیا کہ "کیا یہ خیالات تم نے ابوُالاعلیٰ مودودی کی تصنیفات سے نہیں نقل کیے"؟ سیّد قطب نے جواب دیا: "مَیں نے مولانا مودودی کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے" عدالت کی طرف سے پھر یہ سوال کیا گیا کہ: "تمہاری دعوت اور ابوُالاعلیٰ مودودی کی دعوت میں کیا فرق ہے؟" سیّد نے کہا: لا فرق، (کوئی فرق نہیں ہے)۔

اس کے بعد مضمون نگار جو مصر کی کمیونسٹ پارٹی کا اہم رکن ہے لکھتا ہے:

"اسلامی اتحاد کا نظریہ برطانوی استعمار اور امریکی امپریلیزم کا ایجاد کردہ ہے اور ۱۹۴۷ء سے اسے اشتراکیت کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس نظریہ کی جنم بھومی پاکستان ہے۔ پاکستان ہی میں یہ پیدا ہوُا اور پھلا پھُولا ہے۔ مودودی اسی مُلک میں رہتا ہے۔ سعید رمضان نے بھی کئی سال اس مُلک میں بسر کیے ہیں۔ اس لیے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے کہ اخوان کی تحریک کو سنٹو کی طرف سے مالی امداد دی گئی ہے۔ اور یہ بھی

کوئی نرالی بات نہیں ہے کہ سامراج از سرِ نو اپنا محبوب مہرہ استعمال کر رہا ہے۔
یعنی مذہب کا استحصال، اور "اسلامی فوجی معاہدہ" کی تشکیل ان مقاصد کی تکمیل
کے لیے سامراج کا اصل سہارا ان ملکوں کی رجعت پسندانہ طاقتیں ہیں۔ اور یہ مِل جُل
کر وطن پرستوں اور اشتراکی طاقتوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔"

ان تمہیدی کلمات کے بعد مضمون نگار نے دعویٰ کیا ہے کہ سیّد قطب نے مولانا مودودی کے افکار و نظریات کا سرقہ کیا ہے اور انہیں "معالم فی الطریق" کے اندر مدوّن کر دیا ہے۔ مضمون نگار نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پہلے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی تاریخ بیان کی ہے۔ اور اس کے بعد مولانا مودودی اور سیّد قطب کے افکار کا موازنہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ سیّد قطب نے اپنی کتاب میں "حاکمیّت" اور "جاہلیّت" اور ایسی ہی دوسری جو اصطلاحیں استعمال کی ہیں وہ مودودی کا نتیجۂ فکر ہیں جنہیں وہ عرصۂ دراز سے استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں۔ چنانچہ مضمون نگار نے اس کے ثبوت میں مولانا مودودی کی مختلف تصنیفات مثلاً اسلامی قانون، دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات، اسلامی تحریک کی اخلاقی بنیادیں، مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل، اسلام کا نظامِ حیات وغیرہ سے مفصّل اقتباسات پیش کیے ہیں۔ اسی طرح پردے اور عورت کے بارے میں اور انفرادی ملکیّت کے بارے میں سیّد قطب کے نظریات کو مولانا مودودی کے نظریات کا "چربہ"[1] بتایا ہے اور لکھا ہے

---

[1] قارئین کے لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ یہی الزام یہاں (باقی ص ۵۹ پر)

کہ عورت کے بارے میں مولانا مودودی کا جو نظریہ ہے اُسی کی بنا پر سیّد قطب قاہرہ کی ایکٹرسوں اور ایکٹروں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ مضمون نگار نے ساری بحث کے بعد آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سیّد قطب کی تصنیف "معالم فی الطریق" درحقیقت مولانا مودودی کی تحریروں کی تشریح اور تفسیر ہے۔ اور لکھا ہے کہ "اس کتاب کا ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس کی بُنیاد اور جڑ مودودی کی تحریروں میں نہ ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ مودودی صاف گو ہے اور سیّد قطب ایچ پیچ کے ساتھ بات کہتا ہے۔"

بہرحال اب اصل کتاب قارئین کے سامنے ہے، وہ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ سیّد قطب کی اصل دعوت کیا ہے۔ رہی یہ بات کہ سیّد قطب اور مولانا مودودی کے افکار میں ہم آہنگی یا توارد ہے تو اس میں کیا تعجب کی بات ہے۔ جو شخص بھی صاف ذہن اور اخلاص و عزیمت کے ساتھ کتاب و سنّت کا مطالعہ کرے گا وہ اُسی نتیجے پر پہنچے گا جس پر سلف صالحین پہنچے تھے۔ یا جو آج مولانا مودودی، سیّد قطب اور دوسرے علمائے حق بیان کر رہے ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین

خلیل احمد حامدی۔ اچھرہ، لاہور۔ یکم مارچ ۱۹۶۸ء

(بقیہ حاشیہ ص ۵۸ سے) پر چند لوگ مولانا مودودی پر لگا رہے ہیں کہ انہوں نے سیّد قطب کی نقّالی کی ہے۔ حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ دونوں کے مآخذ ایک ہی ہیں یعنی قرآن و سُنّت۔

○

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ
عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا
بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٣٠﴾ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ
فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي
أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ﴿٣١﴾ نُزُلًا مِنْ غَفُورٍ
رَحِيمٍ ﴿٣٢﴾ (حٰمٓ السجدہ: ۳۰ تا ۳۲)

"جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ "نہ ڈرو، نہ غم کرو، اور خوش ہو جاؤ اُس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دُنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی، وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہوگی، یہ ہے سامانِ ضیافت اُس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے۔"

○

چوں می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لاالٰہ را

(اقبالؒ)

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مُسلماں ہونا

(اقبالؒ)

مَیں ظلمتِ شب میں لیکے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مِرا شعلہ بار ہوگا،

(اقبالؔ)

بسمِ اللہِ الرّحمٰنِ الرّحیم

مقدّمہ مصنّف

انسانیت کی زبوں حالی

آج انسانیت جہنم کے کنارے کھڑی ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ ہمہ گیر تباہی کا خطرہ اس کے سر پر منڈلا رہا ہے، کیوں کہ یہ خطرہ تو محض ظاہری علامت ہے، اصل مرض نہیں۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ آج انسانیت کا دامن ان اقدار حیات سے خالی ہو چکا ہے، جن سے اسے نہ صرف صحت مندانہ بالیدگی حاصل ہوتی ہے، بلکہ حقیقی ارتقاء بھی نصیب ہوتا ہے۔ خود اہلِ مغرب پر بھی اپنا یہ روحانی افلاس خوب اچھی طرح آشکارا ہو چکا ہے، کیوں کہ تہذیب مغرب کے پاس انسانیّت کے سامنے پیش کرنے کے لیے آج کوئی صحتّ مند قدرِ حیات باقی نہیں، بلکہ اس کے روحانی دیوالیہ پن کا تو آج یہ حال ہے کہ اسے خود اپنے وجود و بقاء کے

لیے بھی کوئی ایسی معقول بنیاد یا وجۂ جواز نہیں مل رہی جس سے اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنے ضمیر اجتماعی ہی کو مطمئن کر سکتی۔ جمہوریت مغرب میں بانجھ ثابت ہو چکی ہے جس کی وجہ سے مغرب مشرقی افکار و نظریات اور نظام ہائے حیات کی خوشہ چینی پر مجبور نظر آتا ہے۔ سوشلزم کے پردے میں مشرقی کیمپ کے اقتصادی تصورات کو جس طرح مغرب میں اپنایا جا رہا ہے، وہ اس کی ایک نمایاں مثال ہے

دوسری طرف خود مشرقی کیمپ کا حال بھی پتلا ہے۔ مشرق کے اجتماعی نظریات کو لیجئے، ان میں مارکسزم پیش پیش ہے۔ یہ نظریہ شروع میں مشرقی دنیا، بلکہ خود اہل مغرب کی ایک کثیر تعداد کو بھی، اپنی جانب کھینچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی کامیابی کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ محض ایک نظام ہی نہ تھا بلکہ اس پر عقیدہ کی چھاپ بھی لگی ہوئی تھی۔ مگر اب مارکسزم بھی فکری اعتبار سے مات کھا چکا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اب یہ ایک ایسی ریاست کا نظام بن کر رہ گیا ہے جسے مارکسزم سے دُور کا واسطہ بھی نہیں، تو کوئی مبالغہ نہ ہو گا۔ بہ حیثیت مجموعی یہ نظریہ انسانی فطرت کی ضد واقع ہوا ہے، اور انسانی فطرت کے تقاضوں سے متحارب ہے۔ یہ صرف خستہ اور زبوں ماحول ہی پھل پھول سکتا ہے۔ یا پھر اس کے لیے وہ ماحول سازگار ہوتا ہے جو طویل عرصہ تک ڈکٹیٹر شپ کو برداشت کرتے کرتے اس سے مانوس ہو چکا ہو۔ لیکن اب تو اس طرح کے پامال اور بے جان ماحول میں بھی اس کا مادہ پرستانہ اقتصادی تجربہ ناکام ثابت ہو رہا ہے۔ حالانکہ یہی وہ واحد پہلو ہے جس پر اس کی پوری عمارت قائم ہے، اور جس پر اسے ناز ہے۔ روس اشتراکی نظام کے علمبردار ملکوں کا سرخیل ہے۔ مگر اس کی غذائی پیداوار روز بروز

گھٹتی جا رہی ہے۔ حالانکہ زار کے عہد میں بھی روس فاضل اناج پیدا کرتا رہا ہے۔ مگر اب وہ باہر سے اناج درآمد کر رہا ہے۔ اور روٹی حاصل کرنے کے لیے اپنے سونے کے محفوظ ذخائر تک بیچ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اجتماعی کاشت کا نظام یکسر ناکام ہو چکا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ نظام جو انسانی فطرت کے سراسر خلاف ہے اپنے ہاتھوں شکست کھا چکا ہے۔

قیادتِ نو کی ضرورت

اِن حالات کی روشنی میں یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ انسانیت اب ایک نئی قیادت کی محتاج ہے۔ اب تک انسانیت کی یہ قیادت اہلِ مغرب کے ہاتھ میں تھی مگر اب یہ قیادت رُو بہ زوال ہے۔ اور جیسا کہ ہم اُوپر عرض کر چکے ہیں، اس قیادت کے زوال کا یہ سبب نہیں ہے کہ مغربی تہذیب مادّی لحاظ سے مفلس ہو چکی ہے، یا اقتصادی اور عسکری اعتبار سے مضمحل ہو گئی ہے۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مغربی انسان ان زندگی بخش اقدار سے محروم ہو چکا ہے جن کی بدولت وہ قیادت کے منصب پر فائز رہ سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب تاریخ کے اسٹیج پر اس کا رول تمام ہو چکا ہے اور ایک ایسی قیادت کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے جو ایک طرف یورپ کی تخلیقی ذہانت کے نتیجے میں حاصل ہونے والی مادّی ترقی کی حفاظت کر سکے اور اُسے مزید نشو و نما دے سکے، اور دوسری طرف انسانیت کو ایسی اعلیٰ اور اکمل اقدارِ حیات بھی عطا کر سکے، جن سے انسانی علم اب تک نا آشنا رہا ہے، اور ساتھ ہی انسانیت کو ایک ایسے طریقِ زندگی سے بھی رُوشناس کرا سکے جو انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہو، مثبت اور تعمیری

ہو، اور حقیقت پسندانہ ہو۔ یہ حیات آفرین اقدار اور منفرد نظامِ حیات صرف اسلام کے پاس ہے۔ اسلام کے سوا کسی اور ماخذ سے اس کی جستجو لاحاصل ہے۔

علمی ترقی کی تحریک بھی اب اپنی افادیت کھو چکی ہے۔ اس تحریک کا آغاز سولہویں صدی عیسوی میں علمی بیداری کے ساتھ ہی ہو گیا تھا، اٹھارہویں اور انیسویں صدی اس کا زمانہ عروج تھا، مگر اب اس کے پاس بھی کوئی سرمایۂ حیات باقی نہیں رہا ہے۔

تمام وطنی اور قومی نظریات جو اس دور میں نمودار ہوئے، اور وہ تمام اجتماعی تحریکیں جو ان نظریات کی بدولت برپا ہوئیں ان کے پاس بھی اب کوئی نیا حربہ باقی نہیں رہا ہے۔ الغرض ایک ایک کر کے تمام انفرادی اور اجتماعی نظریات اپنی ناکامی کا اعلان کر چکے ہیں۔

اِسلام کی باری

اس انتہائی نازک، ہوش رُبا اور اضطراب انگیز مرحلے میں تاریخ کے اسٹیج پر اب اسلام اور اُمّتِ مسلمہ کی باری آئی ہے۔ اسلام موجودہ مادّی ایجادات کا مخالف نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو مادّی ترقی کو انسان کا فرض اوّلیں قرار دیتا ہے۔

زمین پر نیابتِ الٰہی کے منصب پر فائز ہونے کے بعد پہلے دن سے ہی اس کو جتا دیا تھا کہ مادّی ترقی کا حصول اس کا فرض اوّلیں ہے۔ چنانچہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اسلام چند مخصوص شرائط کے تحت مادّی جدّوجہد کو عبادتِ الٰہی کا درجہ دیتا ہے۔ اور اسے تخلیق انسانی کی غرض وغایت کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ تصوّر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ
خَلِيْفَةً (بقرہ : ۳۰)

اور یاد کرو جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین
میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ
(ذاریات : ۵۶)

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ
وہ میری بندگی کریں۔

اللہ تعالیٰ نے اُمتِ مسلمہ کو جس مقصد کے لیے اٹھایا ہے اب وقت آگیا ہے کہ اُمتِ مسلمہ اپنے اس مقصدِ وجود کو پورا کرے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ
(آلِ عمران : ۱۱۰)

تم دنیا میں وہ بہترین گروہ ہو جسے انسانوں کی ہدایت کے لیے
میدان میں لایا گیا ہے ، تم نیکی کا حکم دیتے ہو ، بدی سے روکتے ہو
اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا
شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ

شہیدًا (بقرہ : ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ اور رسول تم پر گواہ ہو۔

اِسلام اپنا رول کیسے ادا کر سکتا ہے

اسلام اپنا رول اس وقت تک ادا نہیں کر سکتا جب تک وہ ایک معاشرے کی صورت میں جلوہ گر نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں اپنا صحیح رول ادا کرنے کے لیے اسلام کے لیے ایک اُمّت اور قوم کی شکل اختیار کرنا ناگزیر ہے۔ دنیا نے کسی دَور میں، اور بالخصوص دَورِ حاضر میں، کبھی ایسے خالی خولی نظریہ پر کان نہیں دھرا جس کا عملی مظہر اُسے جیتی جاگتی سوسائٹی میں نظر نہ آتے۔ اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُمّتِ مسلمہ کا "وجود" کئی صدیوں سے معدوم ہو چکا ہے کیونکہ امّتِ مسلمہ کسی ملک کا نام نہیں ہے جہاں اسلام بستا رہا ہے، اور نہ کسی "قوم" سے عبارت ہے جس کے آباؤ اجداد تاریخ کے کسی دَور میں اسلامی نظام کے سائے میں زندگی گزارتے رہے ہیں بلکہ یہ اس انسانی جماعت کا نام ہے جس کے طور طریق، افکار و نظریات، قوانین وضوابط، اقدار اور معیار ردّ و قبول سب کے سوتے اِسلامی نظام کے منبع سے پھُوٹتے ہیں۔ ان اوصاف و امتیازات کی حامل اُمّتِ مسلمہ اُسی لمحہ سے نہاں خانۂ عدم کی نذر ہو چکی ہے جس لمحہ روئے زمین پر شریعتِ الٰہی کے تحت حکمرانی و جہانبانی کا فریضہ معطّل ہوا ہے۔ لیکن اگر اسلام کو دوبارہ وہ کردار ادا کرنا ہے جس کے لیے آج انسانیت چشم براہ ہے تو ناگزیر ہے کہ پہلے امّتِ مسلمہ کے اصل وجود کو بحال کیا جائے، اور اُس امّتِ مسلمہ کو از سرِ نو زندہ

کیا جائے جس پر کئی نسلوں کا ملبہ پڑا ہوا ہے، جو غلط نظریات کے انباروں میں دبی پڑی ہے، جو خود ساختہ اقدار و روایات کے اندر مدفون ہے اور جو اُن باطل قوانین و دساتیر کے ڈھیروں میں پنہاں ہے جن کا اسلام اور اسلام کے طریقۂ حیات سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے مگر اس کے باوجود اب تک اس خام خیالی میں مبتلا ہے کہ اس کا وجود قائم و دوائم ہے اور نام نہاد "عالم اسلامی" اُس کا مسکن ہے!

میں اس بات سے بے خبر نہیں ہوں کہ تجدید و احیاء کی کوشش اور حصول قیادت کے درمیان بڑا طویل فاصلہ ہے۔ ادھر امتِ مسلمہ کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے اصل "وجود" کو عرصۂ طویل سے فراموش کر چکی ہے، اور تاریخ کے اسٹیج سے رخصت ہوئے اُسے زمانۂ دراز گزر چکا ہے۔ غیر حاضری کے اس طویل وقفے میں انسانی قیادت کے منصب پر مختلف نظریات و قوانین، اقوام اور کلچر اور روایات قابض پائی گئی ہیں۔ یہی وہ دَور تھا جس میں یورپ کے عبقری ذہن نے سائنس، کلچر، قانون اور مادّی پیداوار کے میدان میں وہ حیرت ناک کارنامے انجام دیئے، جن کے باعث اب انسانیت مادّی ترقی اور ایجادات کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی ہے۔ چنانچہ ان کمالات پر یا ان کمالات کے مُوجدین پر آسانی اُنگلی نہیں دھری جاسکتی۔ خصوصًا اس حالت میں جب کہ وہ خطّۂ زمین بھی جسے "دنیائے اسلام" کے نام سے پُکارا جاتا ہے ان ایجادات سے قریب قریب خالی ہے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود اسلام کا احیاء نہایت ضروری ہے۔ احیائے اسلام کی ابتدائی کوشش اور حصولِ امامت کے درمیان خواہ کتنی ہی

لمبی مسافت حائل ہو اور خواہ کتنی ہی گھاٹیاں سدِّ راہ ہوں ، احیائے اسلام کی تحریک سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو اس راہ میں پہلا قدم ہے اور ناگزیر مرحلہ !

امامتِ عالم کے لیے ناگزیر صلاحیّت کیا ہے ؟

ہمیں اپنا کام علی وجہ البصیرت کرنے کے لیے متعین طور پر یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کیا صلاحیتیں ہیں جن کی بنا پر اُمّتِ مُسلمہ امامت عالم کا فریضہ ادا کر سکتی ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہے تاکہ ہم تجدید و احیاء کے پہلے ہی مرحلے میں ان صلاحیتوں کی تفصیل اور تشخیص میں کسی غلطی کا شکار نہ ہو جائیں۔

اُمّتِ مُسلمہ آج اس بات پر نہ قادر ہے اور نہ اس سے یہ مطلوب ہے کہ وہ انسانیت کے سامنے مادّی ایجادات کے میدان میں ایسے خارق عادة تفوّق کا مظاہرہ کرے ، جس کی وجہ سے اُس کے آگے انسانوں کی گردنیں جُھک جائیں ، اور یُوں اپنی اس مادّی ترقی کی بدولت وہ ایک بار پھر اپنی عالمی قیادت کا سکّہ منوالے۔ یورپ کا عبقری دماغ اس دوڑ میں بہت آگے جا چکا ہے۔ اور کم از کم آئندہ چند صدیوں تک اس امر کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی کہ یورپ کی مادّی ترقی کا جواب دیا جا سکے یا اس پر تفوّق حاصل کیا جا سکے۔

لہٰذا ہمیں کسی دوسری صلاحیّت کی ضرورت ہے۔ ایسی صلاحیّت جس سے تہذیب حاضر عاری ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مادّی ترقی کے پہلو کو سرے سے نظر انداز کر دیا جائے۔ بلکہ اس معاملے میں بھی پوری جانفشانی اور جدّ و جہد لازم ہے۔ لیکن اس نقطۂ نظر سے نہیں کہ ہمارے نزدیک موجودہ مرحلے میں یہ

انسانی قیادت کے حصول کے لیے کوئی ناگزیر صلاحیت ہے، بلکہ اس نقطۂ نظر سے کہ یہ ہمارے وجود و بقا کی ایک ناگزیر شرط ہے۔ اور خود اسلام جو انسان کو خلافتِ ارضی کا وارث قرار دیتا ہے، اور چند مخصوص شرائط کے تحت کارِ خلافت کو عبادتِ الٰہی اور تخلیقِ انسانی کی غرض و غایت خیال کرتا ہے، مادّی ترقی کو ہم پر لازم ٹھیراتا ہے۔

انسانی قیادت کے حصول کے لیے مادّی ترقی کے علاوہ کوئی اور صلاحیت درکار ہے۔ اور یہ صلاحیت صرف وہ عقیدہ اور نظامِ زندگی ہو سکتا ہے جو انسانیت کو ایک طرف یہ موقع دے کہ وہ مادّی کمالات کا تحفظ کرے، اور دوسری طرف وہ انسانی فطرت کی ضروریات اور تقاضے ایک نئے نقطۂ نظر کے تحت اُس طمطراق کے ساتھ پُورا کرے جس طرح موجودہ مادّی ذہن نے پُورا کیا ہے۔ اور پھر یہ عقیدہ اور نظامِ حیات عملاً ایک انسانی معاشرے کی شکل اختیار کرے یا بالفاظِ دیگر ایک مُسلم معاشرہ اُس کا نمائندہ ہو۔

عہدِ حاضر کی جاہلیّت

موجودہ انسانی زندگی کی بُنیادیں اور ضابطے جس اصل اور منبع سے ماخوذ ہیں اُس کی رُو سے اگر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آج ساری دنیا "جاہلیت" میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور "جاہلیت" بھی اس رنگ ڈھنگ کی ہے کہ یہ حیرت انگیز مادّی سہولتیں اور آسائشیں اور بلند پایہ ایجادات بھی اُس کی قباحتوں کو کم یا ہلکا نہیں کر سکتیں۔ اس جاہلیّت کا قصر جس بنیاد پر قائم ہے، وہ ہے اس زمین پر خدا کے اقتدارِ اعلیٰ پر دست درازی، اور حاکمیّت

جو الوہیت کی مخصوص صفت ہے اُس سے بغاوت۔ چنانچہ اس جاہلیّت نے حاکمیّت کی باگ ڈور انسان کے ہاتھ میں دے رکھی ہے۔ اور بعض انسانوں کو بعض دوسرے انسانوں کے لیے ارباب من دون اللہ کا مقام دے رکھا ہے۔ اس سیدھی سادی اور ابتدائی صورت میں نہیں جس سے قدیم جاہلیّت آشنا تھی بلکہ اس طنطنے اور دعوے کے ساتھ کہ انسانوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ خود افکار و اقدار کی تخلیق کریں، شرائع و قوانین وضع کریں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے لیے جو چاہیں نظام تجویز کریں۔ اور اس سلسلہ میں انہیں یہ معلوم کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے لیے کیا نظام اور لائحہ عمل تجویز کیا ہے، کیا ہدایت نازل کی ہے اور کس صورت میں نازل کی ہے۔ اس باغیانہ انسانی اقتدار اور بے لگام تصورِ حاکمیّت کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ خلق اللہ ظلم و جارحیّت کی چکّی میں پس رہی ہے۔ چنانچہ اشتراکی نظاموں کے زیر سایہ انسانیت کی جو تذلیل ہو رہی ہے، یا سرمایہ دارانہ نظاموں کے دائرے میں سرمایہ پرستی اور جوع الارضی کے عفریت نے افراد و اقوام پر ظلم و ستم کے جو پہاڑ توڑ رکھے ہیں وہ در اصل اُسی بغاوت کا ایک شاخسانہ ہے، جو زمین پر خداوند تعالیٰ کے اقتدار کے مقابلے میں دکھائی جا رہی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کو جو تکریم اور شرف عطا کیا ہے انسان اُسے خود اپنے ہاتھوں پامال کر کے نتائج بد سے دوچار ہے۔

اِسلام اور جاہلیّت کا اصل اِختلاف

اس بارے میں صرف اسلامی نظریۂ حیات ہی منفرد خصوصیّت کا علمبردار

ہے۔ اِسلامی نظامِ حیات کے سوا آپ جس نظام کو بھی لیں گے آپ دیکھیں گے کہ اُس میں انسان دوسرے انسانوں کی کسی نہ کسی شکل میں عبودیت کرتا نظر آتا ہے۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا نظامِ حیات ہے جس میں انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کی عبودیت سے آزاد ہو کر صرف خدائے واحد کی عبودیت اور بندگی کے لیے مخصوص ہو جاتا ہے، صرف اللہ کی بارگاہ سے رشد وہدایت کی روشنی حاصل کرتا ہے اور صرف اُسی کے آگے سرافگندہ ہوتا ہے۔

یہی وہ نقطہ ہے جہاں اسلام اور غیر اسلامی طرزِ حیات کی راہیں جُدا جُدا ہو جاتی ہیں۔ یہ ہے وہ نیا اور نرالا تصوّرِ زندگی جسے ہم انسانیت کی خدمت میں آج پیش کر سکتے ہیں۔ یہ تصوّر انسانی زندگی کے تمام عملی پہلوؤں پر گہرے اثرات ڈالتا ہے۔ یہی وہ نادر خزانہ ہے جس سے آج انسانیت محروم ہے۔ اس لیے کہ مغربی تہذیب اس سلسلہ میں بانجھ ہے، اور یورپ کی حیران کُن تخلیقی صلاحیتیں بھی ——— خواہ وہ مغربی یورپ ہو یا مشرقی یورپ ——— اس خزانے تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر ہیں!

یہ بات ہم پُورے دعوے سے کہتے ہیں کہ ہم ایک ایسے نظامِ حیات کے داعی ہیں جو نہایت درجہ کامل اور ہر لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے۔ پوری نوعِ انسانی ایسے گنجِ گراں مایہ سے خالی ہے۔ دیگر مادّی مصنوعات کی طرح وہ اسے "پیدا" کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اُوپر عرض کیا ہے، اس نظامِ نو کی خوبی اُس وقت تک نمایاں نہیں ہو سکتی، جب تک

اسے عمل کے قالب میں نہ ڈھالا جائے گا۔ پس یہ ضروری ہے کہ ایک اُمّت عملاً اپنی زندگی اس کے مطابق استوار کر کے دکھائے۔ اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہے کہ کسی ایک اسلامی ملک میں احیائے دین کی مہم کی طرح ڈالی جائے۔ احیائے نو کی یہی وہ ناگزیر کوشش ہے، جو طویل یا مختصر مسافت کے بعد، بالآخر انسانی امامت وقیادت کے قبضہ پر منتج ہو گی۔

احیائے دین کا کام کیسے ہو؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احیائے اسلام کی مہم کا آغاز کس طرح ہو؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ پہلے ایک ہراوّل دستہ وجود میں آئے جو اس کارِ عظیم کا عزمِ صمیم لے کر اُٹھے۔ اور پھر مسلسل منزل کی طرف پیش قدمی کرتا چلا جائے۔ اور جاہلیت کے اس بیکراں سمندر کو چیرتا ہوا آگے کی جانب رواں دواں رہے جس کی لپیٹ میں پوری دنیا آچکی ہے۔ وہ اپنے سفر کے دوران اِس ہمہ گیر جاہلیت سے یک گونہ الگ تھلگ بھی رہے اور یک گونہ وابستہ بھی۔ یہ ہراوّل دستہ جس منزل تک پہنچنا چاہتا ہے ضروری ہے کہ اُسے اپنے راستے کے نقوش اور سنگ ہائے میل پوری طرح معلوم ہوں، جنہیں دیکھ کر وہ اپنی مہم کے مزاج و طبیعت، اپنے فرض کی حقیقت و اہمیت، اپنے مقصد کی کُنہ، اور اس سفرِ طویل کا نقطۂ آغاز پہچان سکے۔ نہ صرف یہ بلکہ اُسے یہ بھی شعور حاصل ہونا ضروری ہے کہ اس عالم گیر جاہلیت کے مقابلے میں اُس کا مؤقف کیا ہے؟ کس کس پہلو میں وہ دوسرے انسانوں سے ملے، اور کس کس مقام پر اُن سے جُدا ہو؟ وہ خود کن خوبیوں اور صلاحیتوں کا حامل ہے؟ اور اردگرد کی جاہلیت کن کن خصوصیات و

خصائص سے مسلح اور لیس ہے ؟ نیز وہ اہلِ جاہلیت کو کیسے اسلام کی زبان میں خطاب کرے، اور کن کن مسائل و مباحث میں خطاب کرے ؟ اور پھر اُسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ ان تمام امور میں کہاں سے اور کیسے رہنمائی حاصل کرے ؟

ان نقوشِ راہ اور سنگ ہائے میل کا تعیّن اور تشخّص اسلامی عقیدہ کے ماخذ اوّلین کی روشنی میں ہوگا۔ ماخذ اوّلین سے ہماری مراد قرآن حکیم ہے۔ اس کتاب کی بنیادی تعلیمات ان نقوشِ راہ کی نشان دہی کریں گی۔ یا پھر وہ تصوّر اس بارے میں رہنمائی کرے گا، جو قرآن حکیم نے اس پاکیزہ و برگزیدہ جماعت کے دلوں پر نقش کر دیا تھا جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اندر اپنی حکمت و قدرت کے محیّر العقول کرشمے دکھائے۔ اور ایک مرتبہ تو اس جماعت نے تاریخ انسانی کا دھارا بدل کر اُس رُخ پر موڑ دیا جو مشیّتِ خداوندی کو مطلوب و مقصود تھا۔

حقیقتِ مُنتظَر

اِسی ہراول دستے کے لیے جسے میں " حقیقتِ مُنتظَر " سمجھتا ہوں، میں نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کے چار ابواب میری تفسیر " فی ظلال القرآن " سے ماخوذ ہیں، جن میں مَیں نے موضوع کی رعایت سے کچھ ترمیم و اضافہ کر دیا ہے۔ اس مقدمہ کے علاوہ بقیہ آٹھ ابواب میں نے مختلف اوقات میں قلمبند کیے ہیں۔ قرآن حکیم کے پیش کردہ ربّانی نظریۂ حیات پر غور و فکر کے دَوران مختلف اوقات میں مجھ پر جو حقائق منکشف ہوئے، وہ مَیں نے ان ابواب میں سپردِ قلم کر دیئے ہیں۔ یہ خیالات بظاہر بے جوڑ اور مُنتشر معلوم ہوں گے مگر ایک بات ان سب میں مُشترک ملے گی، اور وہ یہ کہ یہ خیالات " معالم فی الطریق "

ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ہر راستے کی علامات کا یہی حال ہوتا ہے ۔ مجموعی طور پر یہ گزارشات "معالم فی الطریق" کی پہلی قسط ہیں ۔ اور اُمید ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کتاب کو پیش کرنے کی توفیق دی ہے ، اس موضوع پر اور بھی چند مجموعے پیش کرنے کی توفیق نصیب ہو گی ۔ وباللہ التوفیق ۔

بابِ اوّل

قرآن کی تیار کردہ لاثانی نسل

اسلام کے نام لیواؤں کو تاریخ اسلام کا ایک نمایاں پہلو خاص طور پر پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ کیوں کہ یہ پہلو دعوت کے طریقِ کار اور رُجحان پر نہایت گہرا اور فیصلہ کُن اثر ڈالتا دکھائی دیتا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ دعوتِ اسلامی کے علمبردار خواہ کسی مُلک اور زمانے سے تعلق رکھتے ہوں اس پہلو پر زیادہ سے زیادہ غور کریں۔ یہ پہلو اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ دعوتِ اسلامی نے ایک زمانے میں ایسی انسانی نسل تیار کی تھی جس کی مثال پوری اسلامی تاریخ، بلکہ پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس نسل سے مراد رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحابۂ کرام ہیں۔ اس نسل کے بعد تاریخی ادوار میں دعوتِ اسلامی کے ہاتھوں اس طرز اور کردار کی جمعیت پھر وجود میں نہیں آئی۔ اگرچہ تاریخ کے ہر دَور میں اس

کردار کے افراد تو بلاشبہ پائے گئے ہیں، مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک ہی خطے میں بڑی تعداد میں اس طرز اور کردار کے لوگ جمع ہو گئے ہوں۔ جس طرح اسلام کے اوّلین دَور میں جمع ہوئے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کا ثبوت تاریخ کے صفحات سے ملتا ہے۔ اور اس کی تہ میں ایک خاص راز پنہاں ہے، ہمیں اس بدیہی حقیقت کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ اُس راز تک رسائی حاصل کر سکیں۔

صحابۂ کرام کے بعد ایسی لاثانی جمعیت کیوں وجود میں نہ آئی؟

اِسلام کی دعوت وہدایت جس کتاب میں موجود ہے وہ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب کو پیش کرنے والی ہستی ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ——— کی تعلیمات واحادیث اور سیرت پاک آج بھی اُس طرح ہماری نگاہوں کے سامنے ہے جس طرح وہ اُس پہلی اسلامی جمعیت کی نگاہوں کے سامنے تھی جس کا تاریخ کے اسٹیج پر دوبارہ اعادہ نہ ہو سکا ——— فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس اِس جمعیت کے قائد تھے، اور اب یہ صورتِ حال نہیں ہے۔ لیکن کیا یہی فرق اسلام کی مثالی تنظیم کے دوبارہ وجود میں نہ آنے کا سبب ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک اگر دعوتِ اسلامی کے قیام اور بار آور ہونے کے لیے حتمی اور ناگزیر ہوتا تو اللہ تعالیٰ اِسے اسلام کو ہرگز عالمگیر دعوت اور پُوری انسانیت کا دین کا نہ قرار دیا ہوتا، اور نہ اسے انسانیت کے لیے آخری پیغام کی حیثیت

دی ہوتی، اور نہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے معاملات ومسائل کی اصلاح کی ذمہ داری قیامت تک کے لیے اس کے سپرد کی ہوتی۔ اللہ تعالےٰ نے قرآن حکیم کی حفاظت کا خود ذمہ لیا ہے۔ اس لیے کہ وہ علیم وخبیر جانتا ہے کہ اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی برپا ہو سکتا ہے، اور اپنے ثمرات سے انسانیت کو بہرہ ور کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس دعوت کو جب ۲۳ سال گزر گئے، اور وہ اوج کمال تک پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے جوارِ رحمت میں طلب فرمالیا۔ اور آپؐ کے بعد اِس دین کو زمانۂ آخر تک کے لیے جاری وساری کر دیا۔ پس رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود گرامی کا نگاہوں سے اوجھل ہو جانا معیاری اسلامی جمعیت کے فقدان کا باعث نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اس کی پہلی وجہ

تو پھر ہمیں اس کا کوئی اور سبب تلاش کرنا چاہیئے اس سلسلے میں ہمیں اُس چشمۂ صافی پر بھی نگاہ ڈالی لینی چاہیئے جس سے پہلی اسلامی نسل نے اسلام کا فہم وشعور حاصل کیا۔ شاید اس کے اندر ہی کوئی تغیّر واقع ہو چکا ہو! اُس طریقِ کار کا بھی جائزہ لے لینا چاہیئے جس کے مطابق اس نے تربیّت حاصل کی، ممکن ہے اُس میں تبدیلیوں نے راہ پالی ہو! جس چشمہ سے صحابۂ کرام کی عظیم المرتبت جماعت نے اسلام کا فہم حاصل کیا وہ صرف قرآن تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور تعلیمات اس چشمے سے پھوٹنے والے سوتے تھے۔ چنانچہ جب اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ دریافت کیا

گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیسے تھے ؟ تو آپؓ نے فرمایا: کان خلقہ القرآن (آپؐ کے اخلاق قرآن کا چلتا پھرتا نمونہ تھے)۔ الغرض صرف قرآن حکیم ہی وہ واحد سرچشمہ تھا جس سے صحابۂ کرام سیراب ہوتے تھے، یہی وہ سانچہ تھا جس میں وہ اپنی زندگیوں کو ڈھالتے تھے، اسی سے وہ اکتساب فیض کرتے تھے۔ صرف قرآن پر اُن کا اکتفاء کر لینا اس وجہ سے نہ تھا کہ اس وقت دنیا میں کسی اور تہذیب و تمدّن اور ثقافت کے آثار موجود نہ تھے، علمی تحقیقات اور سائنسی کمالات کا وجود ناپید تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام مظاہر گوناگوں شکلوں میں موجود تھے۔ مثلاً رومی تہذیب موجود تھی، رومی علم و حکمت اور رومی قانون و نظام کا ڈنکا بج رہا تھا جو آج بھی یورپ کی تہذیب کی بنیاد ہے یا کم از کم موجودہ یورپ اُس کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ یونانی تہذیب کا ترکہ بھی منطق و فلسفہ اور ادب و فن کے رنگ میں موجود تھا جو آج تک مغرب کے فکر و نظر کا مرجع ہے۔ عجمی تہذیب و تمدّن، عجم کا آرٹ، اُس کی شاعری، اس کا روایتی ادب اور اس کے عقائد اور نظامہائے حکومت کا غلغلہ تھا۔ اور بھی کئی تہذیبیں جزیرۃ العرب کے قریب یا دُور پائی جاتی تھیں، مثلاً ہندی تہذیب اور چینی تہذیب۔ رومی اور عجمی دونوں تہذیبوں کے دھارے جزیرۃ العرب کے ساتھ ساتھ شمال اور جنوب میں بہ رہے تھے۔ مزید برآں یہودی اور مسیحی آبادیاں خود جزیرۃ العرب کے وسط میں موجود تھیں۔ لہٰذا ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ صحابۂ کرام ——— پہلی اسلامی نسل ——— کا صرف کتاب الٰہی پر اکتفاء کرنا اور فہم دین کی خاطر کسی اور

چشمہ سے رجوع نہ کرنا فکر و نظر کے جمود اور تہذیب و تمدن سے بیگانگی کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ یہ ایک سوچے سمجھے منصوبے اور طے کردہ طریقِ کار کی بنا پر تھا۔ اس امر کی دلیل خود جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عمل سے ملتی ہے۔ آنجناب ؐ نے ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تورات کے چند اوراق دیکھے۔ آپ ؐ دیکھ کر ناراض ہوئے اور فرمایا: "واللہ لو کان موسیٰ حیا بین اظہرکم ما حلّ لہ اِلّا ان یتبعنی"[1] (خدا کی قسم، اگر موسیٰ بھی آج تمہارے اندر موجود ہوتے تو میری ہی اطاعت کرتے)۔

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادۃً اسلام کی اس اوّلین نسل کو جو ابھی دورِ تعمیر سے گزر رہی تھی صرف ایک ہی چشمہ سے اکتسابِ فیض کرنے پر محدود رکھا، اور وہ تھا قرآن حکیم۔ آپ ؐ کا منشا یہ تھا کہ اس جماعت کے دل صرف کتاب اللہ ہی کے لیے خالص ہو جائیں، اور اُسی کے پیش کردہ نظامِ حیات کے مطابق وہ اپنے حالات کی اصلاح کریں۔ اس لیے آنجناب ؐ یہ دیکھ کر غضب آلود ہو گئے کہ عمر ——— رضی اللہ عنہ ——— قرآن کے بجائے ایک دوسرے ماخذ کی طرف مائل ہیں۔ دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی لاثانی نسل تیار کرنا چاہتے تھے جس کا دل و دماغ نہایت پاکیزہ اور مطہر ہو، جس کا احساس و شعور انتہائی صاف و

---

[1] یہ حضرت جابر رضؓ کی روایت ہے، اور اسے حافظ ابو یعلیٰ نے حماد اور شعبی کی سند سے روایت کیا ہے۔ (مصنّف)

شفاف ہو اور جس کی تعمیر میں قرآن کے طریقۂ تربیت و تعلیم کے سوا کسی دوسرے طریقہ کو دخل نہ ہو۔

یہ نسل یا جمعیت تاریخ میں لاثانی اور یکتا تنظیم سمجھی گئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اُس نے دین کے فہم اور تربیت کا اکتساب صرف ایک ہی ماخذ سے کیا۔ مگر بعد کے ادوار میں یہ صورت پیش آئی کہ اس چشمے کے اندر اور بھی متعدد چشموں کی آمیزش ہو گئی۔ بعد کی نسلوں نے جس چشمہ سے اخذ و اکتساب کیا اُس کا حال یہ تھا کہ اُس میں یونانی فلسفہ و منطق، قدیم عجمی قصّے کہانیاں، اسرائیلیات، مسیحی الٰہیات اور دوسرے مذاہب اور تمدّنوں کے بچے کھچے آثار مخلوط ہو چکے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم کی تعبیرات پر ان تمام چیزوں کا عکس پڑا، علم الکلام ان سے متاثر ہوا، فقہ اور اصول فقہ ان کے دخل سے نہ بچ سکے۔ نسل اوّلین کے بعد جتنی نسلیں اُٹھیں وہ اسی مخلوط چشمے سے اکتساب و استفادہ کرتی رہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صحابۂ کرام جیسی کامل و خالص ہیئت اجتماعیہ دوبارہ منصۂ ظہور پہ نہ آسکی۔ اور ہم یہ بات کسی شک و شبہ کے بغیر کہتے ہیں کہ بعد کی نسلوں اور اسلام کی پہلی یکتا و ممتاز جمعیت میں جو نمایاں اختلاف نظر آتا ہے اُس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ بعد میں اسلام کے اوّلین منبع رشد و ہدایت میں ان مختلف مآخذ اور گوناگوں چشموں کا اختلاط ہو گیا جن میں سے بعض کی جانب ہم اُوپر اشارہ کر آئے ہیں۔

دوسری وجہ

اس فرق کو پیدا کرنے میں ایک اور اساسی عامل بھی کارفرما رہا ہے۔

صحابہ کرام نے قرآن سے اکتسابِ فیض کا جو طریقہ اختیار کیا تھا بعد کے ادوار میں اُس میں بھی تبدیلی رونما ہو گئی ـــــــــ صحابہ کرام قرآن کی تلاوت اور اس میں تدبّر اس غرض کے لیے نہیں کرتے تھے کہ اپنی معلومات کو بڑھائیں، یا ادبی ذوق کو تسکین دیں، یا ذہنی تفریح کا سامان مہیا کریں۔ ان حضرات میں سے کوئی فرد بھی کبھی اس غرض کے لیے قرآن نہیں سیکھتا تھا کہ وہ اپنی معلوماتِ عامہ کا دائرہ وسیع کرنا چاہتا ہے، علمی اور قانونی رموز و مسائل میں اپنے سابقہ علم کے اندر اضافہ کرنا چاہتا ہے، یا کسی بھی پہلو سے اپنی علمی کسر کو پُورا کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ وہ قرآن کی طرف اس لیے رجوع کرتا تھا تاکہ وہ یہ معلوم کرے کہ اس کی انفرادی زندگی کے بارے میں مالک الملک نے کیا ہدایات دی ہیں؟ جس معاشرے کے اندر وہ سانس لے رہا ہے اُس کی اجتماعی زندگی کے لیے کیا احکام ہیں؟ اُس مخصوص نظامِ حیات کے بارے میں جس کا وہ اور اس کی جماعت علمبردار ہے پروردگارِ عالم کی طرف سے کیا تفصیلات دی گئی ہیں؟۔ اس برگزیدہ جماعت کا ہر فرد میدانِ جنگ میں لڑنے والے سپاہی کی مانند اللہ کے احکام موصول ہوتے ہی ان پر بلاچون وچرا کاربند ہو جاتا تھا۔ وہ ایک ہی نشست میں قرآن حکیم کی کئی سُورتیں نہیں پڑھ ڈالتا تھا۔ اُسے احساس تھا کہ اس طرح اُس کے کندھوں پر یکدم بہت سے فرائض اور ذمّہ داریوں کا بوجھ آ پڑے گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ دس آیات کی تلاوت کرتا، انہیں حفظ کرتا، اور ان کو عملی زندگی پر نافذ کرتا۔ اسی طریقہ تعلیم کی تفصیل ہمیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک

روایت سے ملتی ہے[1]

احکامِ خداوندی کی تعمیل کے اس احساس نے ان حضرات پر نہ صرف روحانی لذّت و تسکین کے بے شمار افق وا کر دیئے بلکہ علم و عرفان کی بے شمار راہیں بھی اُن پر کھول دیں۔ وہ اگر صرف کیف و نشاط اور مجرّد علم و آگہی کے ارادے سے قرآن کو پڑھتے تو یہ غیر محدود روحانی حظہ انہیں ہرگز حاصل نہ ہو سکتا تھا، اور وہ علم و عرفان کے بحر ناپیدا کنار میں شناوری نہ کر سکتے تھے۔ پھر احساس اطاعت گزاری نے اُن کے لیے عمل کو بھی نہایت درجہ آسان کر دیا، خدا کے احکام ان کے لیے بوجھ بننے کے بجائے ہلکے پھلکے اور حد درجہ آسان ہو گئے، قرآن کی تعلیمات اُن کے نفوس میں اِس طرح اُتر گئیں کہ ان کی زندگیاں اسلام کا چلتا پھرتا نمونہ بن گئیں، وہ ایک ایسی ثقافت کا عملی پیکر بن گئے جو ذہن کی تختیوں اور کتاب کے صفحات تک محدود نہیں تھی بلکہ ایک ایسی عملی تحریک کی شکل میں جلوہ گر تھی جس نے انسانی زندگی کا دھارا بدل کر رکھ دیا۔

قرآن اپنے خزانوں کی کنجیاں صرف ان لوگوں کو عطا کرتا ہے جو اس احساس و جذبہ کے ساتھ اُس کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں کہ قرآن سمجھ کر اُس پر عمل پیرا ہوں گے۔ قرآن اس لیے نہیں نازل ہوا کہ وہ لذّت دماغی اور

---

[1] حضرت عبداللہ بن مسعود کی اس روایت کو حافظ ابن کثیر نے اپنے مقدمہ تفسیر میں نقل کیا ہے (مصنف)

تسکینِ ذوق کی کتاب بن کر رہ جائے، یا محض ادب و فن کا شہ پارہ قرار پائے، یا اسے قصّے کہانیوں اور تاریخ کا دفتر سمجھا جائے۔ اگرچہ اُس کے مضامین ضمنی طور پر ان تمام خوبیوں سے مالا مال ہیں مگر اُس کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ وہ کتابِ زندگی ہو، وہ انسان کا رہنما ہو۔ وہ یہ بتانے کے لیے آیا ہے کہ مالک الملک کو زندگی کا کون سا ڈھب محبوب ہے۔ اسی مقصد و مدّعا کے پیشِ نظر وہ صحابۂ کرام کو تدریج کے ساتھ اپنے مخصوص طریقِ زندگی کی تربیت دیتا رہا اور ٹھیر ٹھیر کر وقفوں سے ان پر احکام و ہدایات نازل کرتا رہا۔ اِسی تدریجی طریقِ تعمیر و تربیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :-

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا۔ (بنی اسرائیل : ۱۰۶)

اور اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کرکے نازل کیا ہے تاکہ تم ٹھیر ٹھیر کر اسے لوگوں کو سُناؤ، اور اسے ہم نے (موقع موقع سے) بتدریج اُتارا ہے۔

قرآنِ کریم یکبارگی نازل نہیں ہوا۔ بلکہ اِسلامی معاشرے کے اندر جیسے جیسے نو بہ نو ضروریات پیدا ہوتی گئیں، لوگوں کے فہم و شعور میں بالیدگی اور وسعت رونما ہوتی گئی، عام انسانی زندگی ارتقاء سے ہمکنار ہوتی گئی، اور اسلامی جماعت کو عملی میدان میں مشکلات و مسائل سے سابقہ پیش آتا گیا اس کے مطابق قرآن کا نزول ہوتا گیا۔ ایک آیت یا چند آیات مخصوص نوعیت

کے حالات اور مخصوص واقعات کی مناسبت سے اُترتیں، اور اُن اُلجھنوں کو حل کرتیں جو لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتیں، اُن حالات کی نوعیت واضح کرتیں اور اُن سے نمٹنے کے لیے لائحہ عمل متعین کرتیں جن میں وہ گھرے ہوتے تھے۔ ان کے شعور و احساس کی لغزشوں اور معاملات کی غلطیوں کی تصحیح کرتیں، ہر ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ سے اُن کے تعلق کو استوار کرتیں، اور انہیں اپنے پروردگار سے اُس کی اُن صفات کی روشنی میں متعارف کراتیں جو اس کائنات پر ہمہ پہلو اثر انداز ہو رہی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس حقیقت کا اچھی طرح احساس کر لیا تھا کہ وہ زندگی کا ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی اور نگرانی اور ملأ اعلیٰ کی معیت میں بسر کر رہے ہیں۔ اور رحمتِ خداوندی کے سایۂ عاطفت میں سفرِ حیات طے کر رہے ہیں۔ اس احساس کی وجہ سے ان کی عملی زندگی اُس مقدس قانونِ حیات کے مطابق ڈھل جاتی تھی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں تعلیم کیا جا رہا تھا۔

پس معلوم ہوا کہ "تعلیم برائے تعمیل" کے اِس مخصوص طریقِ کار نے صحابۂ کرام کی لاثانی اور مبارک و منفرد تنظیم تیار کی۔ اور بعد کی نسلیں جس طریقِ کار کی روشنی میں تیار ہوئیں وہ "تعلیم برائے تحقیق و تفریح" سے عبارت تھا۔ اور لاریب یہ وہ دوسرا اساسی عامل ہے جس نے بعد کی نسلوں کو پہلی لاثانی اسلامی نسل سے بالکل مختلف کر دیا۔

تیسری وجہ

ایک تیسرا عامل بھی اس تاریخی حقیقت میں کارفرما نظر آتا ہے۔ اُس کا

جائزہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عہدِ رسالت میں ایک شخص جب حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتا تو وہ اپنے دَورِ جاہلیت کو یک قلم ترک کر دیتا تھا۔ دائرہ اِسلام میں قدم رکھتے ہی وہ یہ محسوس کرتا کہ وہ کتابِ حیات کا ایک نیا ورق اُلٹ رہا ہے، اور ایک نئے دَور میں داخل ہو رہا ہے جو گزشتہ جاہلی زندگی سے یکسر مختلف ہے۔ وہ جاہلی زندگی کے تمام معمولات کو شک و شبہ اور خائف نگاہوں سے دیکھتا۔ اُس پر یہ خیال طاری رہتا کہ یہ تمام ناپاک اور پلید کام تھے، ان میں اور اِسلام میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ پھر اسی احساس اور قلبی دھڑکن کے ساتھ وہ اسلام کی طرف لپکتا تاکہ وہاں سے نورِ ہدایت حاصل کرے۔ اور اگر کبھی اُس کا نفس امّارہ غالب آجاتا یا ترک شدہ عادات کی کشش اس پر غالب آجاتی یا اسلام کے احکام کی تعمیل میں اس سے کوئی تساہل ہو جاتا تو وہ احساسِ گناہ و لغزش سے بے چین ہو جاتا اور فوراً توبہ کرتا، وہ اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اپنے گناہ کی تلافی اور رُوح کی تطہیر کی ضرورت محسوس کرتا۔ اور دوبارہ قرآنی ہدایت کے مطابق مکمّل طور پر ڈھل جانے کے لیے کوشاں ہو جاتا۔

دامنِ اسلام میں پناہ لینے کے بعد ایک مسلمان کی یہ کیفیت ہو جاتی تھی کہ اس کے جاہلی دَور اور نئی اسلامی زندگی کے درمیان کامل انقطاع واقع ہو جاتا تھا۔ یہ انقطاع پُورے شعور اور سوچے سمجھے فیصلے کے تحت ہوتا۔ اس کے نتیجے میں اِردگِرد کے جاہلی معاشرے کے ساتھ اُس کے تمام اجتماعی روابط ٹوٹ جاتے۔ وہ اپنی تمام کشتیاں جلا کر اس جذبہ و ولولہ کے ساتھ اسلام کے ساتھ مکمّل طور پر

وابستہ ہو جاتا کہ جاہلی ماحول کے ساتھ اُس کا ایک ایک رشتہ کٹ جاتا۔ اگرچہ تجارت اور روزانہ لین دین میں مُشرکوں کے ساتھ اُس کا واسطہ قائم رہتا تھا مگر اس سے اس امرِ واقع میں کوئی فرق نہ پڑتا تھا کیوں کہ احساس وشعور کا تعلق اور محض کاروباری تعلق دو مختلف اور الگ الگ چیزیں ہیں۔ جاہلی ماحول، جاہلی رسوم و رواج، جاہلی افکار ونظریات اور جاہلی عادات واطوار سے یہ کلّی دستبرداری درحقیقت اُس عظیم فیصلے کا مظہر تھی جس کی رُو سے ایک شخص شرک سے دستبردار ہو کر دامنِ توحید میں پناہ لیتا تھا، زندگی و کائنات کے بارے میں جاہلیّت کے تصوّر کو تج کر اِسلام کے تصوّر کو اپناتا تھا، اور ایک نئی قیادت کے زیرِ سایہ جدید اِسلامی تنظیم سے منسلک ہو جاتا تھا اور اپنی تمام وفاداریاں اور اطاعت گزاریاں اِس نئے معاشرے اور نئی قیادت کے لیے وقف کر دیتا تھا۔

یہی وہ فیصلہ تھا جو اُس کی شاہراہِ حیات کو دوسری تمام راہوں سے الگ کر دیتا تھا۔ اِس فیصلہ کے بعد وہ زندگی کے نئے سفر کا آغاز کر دیتا تھا ——— آزاد سفر، جاہلی معاشرہ کی گھٹی میں پڑی ہوئی روایات کے بوجھ، اور جاہلی اقدار ونظریات کے دباؤ سے آزاد سفر ——— اس سفر میں اگر کسی بوجھ سے مسلمان کو سامنا تھا تو وہ آزمائش واذیت تھی جو جاہلیّت کے ہاتھوں اُسے پہنچتی تھی۔ لیکن وہ اپنے دِل کی گہرائیوں میں ہر امتحان اور ہر صعوبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے اور راہِ حق پر گامزن رہنے کا عزم صمیم کر چکا ہوتا تھا، اس لیے جاہلیّت کے تصوّرات اور جاہلی معاشرے کی روایات کا دباؤ اُس کی سخت جانی پر کوئی اثر نہ ڈال سکتے تھے۔

ہمارے لیے صحیح طریقِ کار؟

آج بھی ہم جاہلیت میں گھِرے ہوئے ہیں۔ یہ جاہلیت بھی اُسی خُو بُو کی ہے جس سے اسلام کو صدرِ اوّل میں سابقہ پیش آیا تھا۔ بلکہ اُس سے بھی تاریک تر جاہلیت۔ یُوں نظر آتا ہے کہ ہمارا تمام ماحول جاہلیت کے جنگل میں گرفتار رہے۔ ہمارے افکار و عقائد، ہماری عادات و اطوار، ہماری ثقافت اور اس کے مآخذ، ادب اور آرٹ، مروّجہ نظام اور قوانین ان سب میں جاہلیت کی رُوح سرایت کیے ہوتے ہے۔ یہاں تک کہ جن چیزوں کو غلطی سے اسلامی ثقافت، اسلامی مآخذ، اسلامی فلسفہ اور اسلامی فکر سمجھا جاتا ہے وہ سب بھی جاہلیت کی مصنوعات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِسلامی اقدار ہمارے دلوں میں گھر نہیں کرتیں، ہمارے اذہان و قلوب اسلام کے پاکیزہ اور اُجلے تصوّر سے منوّر نہیں ہوتے، اور ہمارے اندر انسانوں کی ویسی پاکیزہ و مثالی تنظیم برپا نہیں ہوتی جیسے اسلام نے صدرِ اوّل میں برپا کیا تھا۔

پس ہم پر لازم ہے اور اِسلامی تحریک کا مخصوص طریقِ کار بھی یہی تقاضا کرتا ہے کہ تحریک کے دَورِ تربیت و تعمیر ہی میں ہم جاہلیت کے اُن تمام اثرات و عناصر سے پاک رہیں جن میں ہم رہ بس رہے ہیں بلکہ اخذ و استفادہ تک کر رہے ہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ ابتدا سے ہم اس خالص سرچشمۂ ہدایت کی طرف رجوع کریں جس سے اسلام کے پہلے لاثانی معاشرے کے افراد نے فہم دین حاصل کیا تھا اور جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ ضمانت دی ہے

کہ وہ ہر گونہ اختلاط و آمیزش سے محفوظ رہے گا۔ ہمیں کائنات اور حیاتِ انسانی کی حقیقت، اور ان دونوں کے باہمی تعلق، اور پھر ان تمام چیزوں کے اور وجودؑ (باری تعالیٰ کے وجود) کے باہمی تعلق کا صحیح تصوّر اس سر چشمہ سے حاصل کرنا ہوگا۔ اور اسی ضمن میں یہ بھی معلوم کرنا ہوگا کہ زندگی کا صحیح تصوّر کیا ہے؟ ہماری قدریں اور اخلاق کس نوعیت کے ہوں؟ ہمارا نظامِ حکمرانی کس ڈھب کا ہو؟ ہماری سیاست اور اقتصاد کن اصولوں پر قائم ہو؟ غرضیکہ زندگی کے ہر ہر پہلو کے بارے میں اِس کتاب ہدایت سے ہمیں رہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔ یہ امر بھی پیشِ نظر رہے کہ جب ہم ان مسائل کے بارے میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے اسلام کے چشمہ صافی (قرآن کریم) کی طرف رجوع کریں تو "علم برائے عمل" کے احساس وجذبہ کے ساتھ اُسے پڑھیں نہ کہ لُطف اندوزی، تسکین ذوق اور بحث وتحقیق کے شوق کی بنا پر۔ ہم یہ معلوم کرنے کے لیے اُس کی طرف رجوع کریں کہ وہ ہم سے کیسا انسان بننے کا مطالبہ کرتا ہے تاکہ ویسا انسان ہم بن کر دکھائیں، ———— یہ الگ بات ہے کہ مقصدِ حقیقی کے حصول کے دَوران ہم پر قرآن کا فنّی کمال اور ادبی حُسن بھی آشکار ہو جائے گا، اس کے حیرت انگیز قصّے ہمارا دامنِ دل پکڑیں گے، مناظر قیامت بھی آنکھوں کے سامنے جھلکیں گے، اور اُس کی وجدانی منطق کی بھی ہم گلگشت کریں گے۔ الغرض وہ سب لذّتیں ضمناً ہمیں حاصل ہوں گی جن کی تلاش جویانِ علم کو ہوتی ہے اور جن کی طلب میں اربابِ ذوق سرگرداں رہتے ہیں۔ بے شک ان سب فوائد ولذائذ سے ہم ہمکنار ہوں گے لیکن یہ چیزیں ہمارے مطالعہ کا اصل مقصد نہ ہوں گی۔ ہمارا اصل مقصد صرف یہ معلوم کرنا ہوگا کہ قرآن ہم سے کس طرح کی عملی زندگی

کا مطالبہ کرتا ہے ؟ زندگی اور کائنات کے بارے میں وہ اجمالی تصور کیا ہے جس پر ہمیں قرآن قائم کرنا چاہتا ہے ؟ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں کس نوعیت کا شعور اور احساس رکھنے کی تلقین کرتا ہے ؟ اُسے کس قسم کے اخلاق پسند ہیں ؟ اور وہ زندگی میں کس ڈھنگ کا قانونی اور دستوری نظام نافذ کرنے کا خواہاں ہے ؟

جاہلیت سے مکمل مقاطعہ

ہمارا یہ بھی فرض ہوگا کہ ہم اپنی ذاتی زندگیوں میں جاہلی معاشرے کے شکنجے سے، جاہلی تصورات کی گرفت سے، جاہلی روایات کے دباؤ اور جاہلی لیڈرشپ کے تسلط سے آزادی حاصل کریں۔ ہمارا مشن جاہلی معاشرے کے عملی نظام کے ساتھ مصالحت (Compromise) کرنا نہیں ہے، اور نہ ہم اس کے وفادار بن کر رہ سکتے ہیں۔ جاہلی معاشرہ ——— اپنے جاہلی اوصاف و خصائص کی وجہ سے ——— اس قابل نہیں ہے کہ ہمارے اور اُس کے درمیان مصالحت کا رویّہ قائم ہو سکے۔ لہٰذا ہمارا کام یہ ہونا چاہیئے کہ ہم پہلے اپنے آپ کو بدلیں تاکہ بالآخر معاشرے کو تبدیل کر سکیں۔ ہمارا اوّلین مقصد معاشرے کے عملی نظام میں اِنقلاب ہے۔ جاہلی نظام کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکنا ہے جو اسلامی نظامِ زندگی کے ساتھ بنیادی طور پر متصادم ہے، اسلامی تصورات کی ضد ہے، اور جو ہمیں جبر و تشدّد کے وسائل کا سہارا لے کر اُس نظامِ زندگی کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرنے سے محروم کر رہا ہے جس کا مطالبہ ہم سے اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔

زندگی کے اس نئے سفر میں ہمارا سب سے پہلا قدم یہ ہوگا کہ ہم جاہلی معاشرے اور اس کی تمام اقدار و نظریات پر غلبہ پانے کی کوشش کریں۔ اور جاہلی معاشرے کے ساتھ سودا بازی کرنے کے لیے ہم اپنی اقدارِ حیات اور اپنے نظریات میں سرِمو تبدیلی گوارا نہ کریں۔ ایسی باتیں ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آنی چاہئیں۔ ہمارا راستہ الگ ہے اور جاہلیّت کا راستہ الگ! اگر ہم ایک قدم بھی جاہلیّت کے ساتھ چلے تو نہ صرف ہم اپنے نظامِ حیات کا سررشتہ ہاتھ سے چھوڑ بیٹھیں گے بلکہ راہِ حق کو بھی گم کر بیٹھیں گے۔ بے شک اس کٹھن اور دشوار گزار راستے میں ہمیں جبر و تشدّد کا اور تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا ہوگا اور ہمیں بڑی بڑی قربانیاں بھی دینا ہوں گی۔ لیکن اگر ہم اُس راہ کے مسافر ہیں جس پر پہلی بے مثال و منفرد اسلامی جمعیت چل چکی ہے، اگر ہم اُن نفوسِ قدسیہ کے نقشِ پا پر چلنا چاہتے ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پاکیزہ و برتر نظام کو دُنیا کے اندر جاری فرمایا اور اُسے جاہلیّت پر نصرت و غلبہ بخشا تو پھر ہمیں یہ سب کچھ سہنا ہوگا، اور ہم اپنی مرضی کے مالک نہیں ہوں گے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ہم ہر وقت اِس امر سے باخبر رہیں کہ ہمارے طریقِ کار کی فطرت و مزاج کیا ہے، ہمارے مَوقف و مسلک کی رُوح کیا ہے اور اُس راستے کے نشیب و فراز کیا ہیں جس پر چل کر ہم جاہلیّت کے گھٹاٹوپ اندھیروں سے اُسی کامیابی کے ساتھ نکل جائیں جس کامیابی کے ساتھ صحابۂ کرام کی ممتاز و لاثانی جماعت نکلی تھی۔

بابِ دوم

قرآن کا طریقِ انقلاب

مکّی دَور کا بُنیادی مسئلہ

قرآن کریم کا وہ حصّہ جو مکّی صورتوں پر مشتمل ہے، پورے ۱۳ سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوتا رہا۔ اس پوری مدّت میں قرآن کا مدارِ بحث صرف ایک مسئلہ رہا۔ اس کی نوعیت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی، مگر اُسے پیش کرنے کا انداز برابر بدلتا رہا۔ قرآن نے اسے پیش کرنے میں ہر مرتبہ نیا اسلوب اور نیا پیرایہ اختیار کیا، اور ہر مرتبہ یُوں محسوس ہوا کہ گویا اِسے پہلی بار ہی چھیڑا گیا ہے۔

قرآن کریم پورے مکّی دور میں اسی مسئلہ کے حل میں لگا رہا۔ اس کی نگاہ میں یہ مسئلہ اس نئے دین کے تمام مسائل میں اوّلین اہمیت کا حامل تھا عظیم تر مسئلہ تھا اساسی

اور اصولی مسئلہ تھا، عقیدہ کا مسئلہ تھا۔ یہ مسئلہ دو عظیم نظریوں پر مشتمل تھا۔ ایک اللہ تعالیٰ کی الوہیت، اور انسان کی عبودیت اور دوسرے ان کے باہمی تعلق کی نوعیت۔ قرآن کریم اِسی بنیادی مسئلہ کو لے کر انسان سے بحیثیتِ "انسان" خطاب کرتا رہا۔ کیونکہ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اس سے تمام انسانوں کا یکساں تعلق ہے۔ وہ چاہے عرب کے رہنے والے انسان ہوں، یا غیر عرب نزولِ قرآن کے زمانہ کے لوگ ہوں یا کسی بعد کے زمانہ کے۔ یہ وہ انسانی مسئلہ ہے جس میں کسی ترمیم و تغیّر کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ اس کائنات میں انسان کے وجود و بقا کا مسئلہ ہے۔ انسان کی عاقبت کا مسئلہ ہے۔ اِسی مسئلہ کی بنیاد پر یہ طے ہو گا کہ انسان کا اِس کائنات کے اندر کیا مقام ہے؟ اور اس کائنات میں بسنے والی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے؟ اور خود کائنات اور موجودات کے خالق کے ساتھ اس کا کیا رشتہ ہے؟ یہ وہ پہلو ہے جس کی وجہ سے اِس مسئلے میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اِس لیے کہ یہ اس کائنات اور کائنات کے ایک حقیر جز انسان کیساتھ براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔

مکّی زندگی میں قرآن انسان کو یہ بتاتا رہا کہ اس کے اپنے وجود اور اس کے اِرد گرد پھیلی ہوئی کائنات کی اصل حقیقت کیا ہے؟ وہ انسان کو یہ بتاتا ہے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کس غرض کے لیے آیا ہے؟ اور آخر کار وہ کہاں جائے گا؟ وہ معدوم تھا اُسے کس نے خلعتِ وجود بخشا؟ کون سی ہستی اُس کا خاتمہ کرے گی؟ اور خاتمہ کے بعد اُسے کس انجام سے دو چار ہونا ہو گا؟
—— وہ انسان کو یہ بھی بتاتا ہے کہ اس وجود کی حقیقت کیا ہے جسے

وہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے؟ اور وہ کون ہستی ہے جسے وہ پردۂ غیب میں کارفرما محسوس کرتا ہے لیکن دیکھ نہیں پاتا؟ اِس طلسماتی کائنات کو کس نے وجود بخشا، اور کون اس کا مُنتظم و مُدبّر ہے؟ کون اسے گردش دے رہا ہے؟ کون اِسے بار بار نیا پیراہن بخشتا ہے؟ کس کے ہاتھ میں ان تغیّرات کا سر رشتہ ہے جن کا ہر چشمِ بینا مشاہدہ کر رہی ہے؟ وہ اُسے یہ بھی سکھاتا ہے کہ خالقِ کائنات کے ساتھ اُس کا رویّہ کیسا ہونا چاہیئے؟ اور خود کائنات کے بارے میں اُسے کیا روش اختیار کرنی چاہیئے؟ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ انسانوں کے باہمی تعلّقات کیسے ہونے چاہئیں۔

یہ ہے وہ اصل اور بنیادی مسئلہ جس پر انسان کی بقا اور وجود کا دارومدار ہے۔ اور رہتی دنیا تک اسی عظیم مسئلہ پر انسان کی بقا اور وجود کا انحصار رہے گا۔ اس اہم مسئلے کی تحقیق و توضیح میں مکّی زندگی کا پورا تیرہ سالہ دَور صرف ہوُا۔ اِس لیے کہ انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ یہی ہے، اور اس کے بعد جتنے مسائل ہیں وہ اِسی کے تقاضے میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت اس کی تفصیلات اور جزئیات سے زیادہ کچھ نہیں۔ قرآن نے مکّی دَور میں اسی بنیادی مسئلے کو اپنی دعوت کا مدار بنائے رکھا، اور اِس سے صرفِ نظر کرکے نظامِ حیات سے متعلق فروعی اور ضمنی بحثوں سے تعرّض نہیں کیا۔ اور اُس وقت تک انہیں نہیں چھیڑا جب تک علمِ الٰہی نے یہ فیصلہ نہیں فرما دیا کہ اب اِس مسئلہ کی توضیح و

تشریح کا حق ادا ہو چکا ہے، اور یہ اُس انتخاب روزگار جماعت کے دلوں میں پوری طرح جاگزیں ہو چکا ہے جسے قدرت الٰہی اقامتِ دین کا ذریعہ بنا کر اس کے ہاتھوں اس دین کو عملی شکل میں برپا کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

جو لوگ دینِ حق کی دعوت لے کر اُٹھتے ہیں اور وہ دنیا کے اندر ایک ایسا نظام برپا کرنا چاہتے ہیں جو بالفعل اِس دین کی نمائندگی کرے انہیں اس عظیم حقیقت پر پہروں غور کرنا چاہیئے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے راسخ کرنے کے لیے قرآن کریم نے مکّی زندگی کے پُورے ۱۳ سال صرف کیے، اور اس دوران میں کبھی اس سے توجّہ ہٹا کر نظامِ زندگی کی دوسری تفصیلات کو نہیں چھیڑا، نہ ان قوانین و احکام بیان کرنے کی حاجت محسوس کی جو آگے چل کر مسلم معاشرے میں نافذ ہونے والے تھے۔

کارِ رسالت کا آغاز اِسی مسئلہ سے ہوُا۔

یہ عین حکمتِ خداوندی تھی کہ آغاز رسالت ہی میں اس اہم مسئلہ کو جو عقیدہ و ایمان کا مسئلہ ہے دعوت کا محور و مرکز بنایا جاتے۔ یعنی اللہ کے رسول —— صلی اللہ علیہ وسلم —— راہِ حق میں پہلا قدم ہی اِس دعوت سے اٹھائیں کہ "لوگو! گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے"، اور پھر اسی دعوت پر اپنا تمام وقت صرف کر دیں: انسانوں کو ان کے حقیقی پروردگار سے آگاہ کریں، اور انہیں صرف اُسی کی بندگی کی راہ پر لگائیں۔

اگر ظاہر بین نگاہ، اور محدود انسانی عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ عرب اس طریقِ دعوت سے بآسانی رام ہونے والے نہیں تھے۔ عرب اپنی زبان دانی کی بدولت "الٰہ" کا مفہوم اور "لا إلٰہ إلا اللہ" کا مدّعا خوب سمجھتے تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ الوہیت سے مراد حاکمیتِ اعلیٰ ہے۔ وہ اس امر سے بھی کماحقہٗ آگاہ تھے کہ الوہیت کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص گردانے کے صاف معنی یہ ہیں کہ اقتدار پورے کا پورا کاہنوں، پروہتوں، قبائل کے سرداروں اور امراء وحکّام کے ہاتھ سے چھین کر اللہ کی طرف لوٹا دیا جائے۔ ضمیر وقلب پر، مذہبی شعائر ومناسک پر، معاملاتِ زندگی پر، مال ودولت اور عدل وقضاء پر، الغرض ارواح و اجسام پر بہمہ وجوہ اللہ اور صرف اللہ کا اقتدار ہو۔ وہ خوب جانتے تھے کہ "لا الٰہ الا اللہ" کا اعلان درحقیقت اس دنیاوی اقتدار کے خلاف ایک چیلنج ہے جس نے الوہیت کی سب سے بڑی خصوصیت (حاکمیت) کو غصب کر رکھا ہے، یہ ان تمام قوانین اور نظاموں کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے جو اس قبضۂ غاصبانہ کی بنیاد پر وضع کیے جاتے ہیں، اور تمام اُن قوتوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے جو خانہ ساز شریعتوں کی بدولت دنیا میں کوسِ لمن الملک بجاتی ہیں۔ عرب اپنی زبان کے نشیب وفراز سے بخوبی آگاہ تھے، اور وہ "لا الٰہ الا اللہ" کے حقیقی مفہوم کو پوری طرح سمجھ رہے تھے اُن سے یہ امر بھی پوشیدہ نہ تھا کہ

ان کے خود ساختہ نظاموں اور ان کی پیشوائی اور قیادت کے ساتھ یہ دعوت کیا سلوک کرنا چاہتی ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اِس دعوت کا ـــــ یا بالفاظ دیگر اس پیامِ انقلاب کا ـــــ اُس تشدّد اور غیظ و غضب کے ساتھ استقبال کیا، اور اس کے خلاف وہ معرکہ آرائی کی جس سے ہر خاص و عام واقف ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دعوت کا آغاز اِس انداز سے کیوں ہُوا؟ اور حکمتِ الٰہی نے کس بنا پر یہ فیصلہ کیا کہ اِس دعوت کا افتتاح ہی مصیبتوں اور آزمائشوں سے ہو؟

رسول اللہ صلعم نے قومیّت کے نعرہ سے کیوں نہ کام کا آغاز کیا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے دینِ حق کو لے کر مبعوث ہوئے تو اس وقت حالت یہ تھی کہ عربوں کے سب سے زیادہ شاداب و زرخیز اور مال دار علاقے عربوں کے ہاتھ میں نہیں تھے بلکہ دوسری اقوام ان پر قابض تھیں۔ شمال میں شام کے علاقے رومیوں کے زیرِ نگیں تھے، جن پر عرب حکام رومیوں کے زیرِ سایہ حکومت چلا رہے تھے۔ جنوب میں یمن کا پورا علاقہ اہلِ فارس کے قبضہ میں تھا، جنہوں نے اپنے ماتحت عرب شیوخ کو فرائضِ حکمرانی سونپ رکھے تھے۔ عربوں کے پاس صرف حجاز اور تہامہ اور نجد کے علاقے تھے۔ یا وہ بے آب و گیاہ صحرا تھے جن میں اِکا دُکا نخلستان پائے جاتے تھے۔ یہ بات بھی محتاجِ دلیل نہیں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم میں صادق

اور امین کی حیثیت سے معروف تھے۔ آغازِ رسالت سے ۱۵ سال قبل اشرافِ قریش حجرِ اسود کے تنازعہ میں آپ کو اپنا حکم بنا چکے تھے، اور آپ کے فیصلہ کو بخوشی مان چکے تھے۔ نسب کے لحاظ سے بھی آپ بنو ہاشم کے چشم و چراغ تھے جو قریش کا معزز ترین خاندان تھا۔ ان حالات و اسباب کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر پوری طرح قادر تھے کہ اپنے ہم وطنوں کے اندر عرب قومیت کے جذبہ کو بھڑکاتے، اور اس طرح اُن قبائلِ عرب کو اپنے گرد جمع کر لیتے جنہیں باہمی جھگڑوں نے پارہ پارہ کر رکھا تھا اور گشت و خون اور انتقام در انتقام کی چکّی میں بُری طرح پسے ہوئے تھے۔ حضورؐ اگر چاہتے تو ان سب عربوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کر کے انہیں قومیت کا درس دیتے، اور شمال کے رومی اور جنوب کے ایرانی استعمار کے تسلّط سے عرب سرزمین کو آزاد کرانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے، عرب قومیّت اور عربیّت کا پرچم بلند کرتے اور جزیرۂ عرب کے تمام اطراف و اکناف کو ملا کر متحدہ عرب ریاست کی داغ بیل ڈال دیتے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قوم پرستی کے نعرہ کو لے کر اُٹھتے تو عرب کا بچّہ بچّہ اس پر لبیک کہتا ہُوا لپکتا، اور آپ کو وہ مصائب و آلام نہ سہنے پڑتے جو آپؐ کو ۱۳ سال تک صرف اس بنا پر سہنے پڑے کہ آپ کی دعوت اور نظریہ جزیرۃ العرب کے فرماں۔ رواؤں کی خواہشات

سے متصادم تھا۔ ——— مزید برآں یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ جب عرب آپؐ کی قومی دعوت کو جوش و خروش کے ساتھ قبول کر چکتے، اور قیادت کا منصب آپؐ کو سونپ دیتے، اور اقتدار کی ساری کنجیاں پوری طرح آپؐ کے قبضے میں آجاتیں، اور رفعت و عظمت کا تاج آپؐ کے مبارک سر پر رکھ دیا جاتا تو آپؐ اپنے اس بے پناہ طاقت اور اثر کو عقیدۂ توحید کا سکّہ رواں کرنے کے لیے استعمال کرتے اور لوگوں کو اپنے انسانی اقتدار کے سامنے سرنگوں کرنے کے بعد بالآخر لے جاکر خدا کے آگے سرنگوں کر دیتے۔ لیکن خدائے علیم و حکیم نے اپنے رسول ——— صلی اللہ علیہ وسلّم ——— کو اس راستے پر نہیں چلایا۔ بلکہ اُنہیں حکم دیا کہ صاف صاف اعلان کر دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اور ساتھ ہی متنبہ بھی کر دیا کہ اس اعلان کے بعد آپؐ خود اور وہ مٹھّی بھر افراد جو اس اعلان پر لبّیک کہیں ہر قسم کی تکلیف و اذیت برداشت کرنے کے لیے بھی تیار رہیں۔

قومی نعرے کو اختیار نہ کرنے کی وجہ

آخر یہ کٹھن راستہ اللہ تعالےٰ نے کیوں منتخب فرمایا؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ——— صلی اللہ علیہ وسلم ——— اور ان کے اہلِ ایمان ساتھیوں کے حق میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ تشدّد اور ظلم

کا نشانہ بنیں۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ اِس دعوت کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اور نہ یہ کوئی صحیح بات ہوتی کہ مخلوق خدا رومی یا ایرانی طاغوت کے پنجے سے نجات پا کر عربی طاغوت کے پنجہ میں گرفتار ہو جاتے۔ طاغوت خواہ کوئی ہو وہ طاغوت ہی ہے۔ یہ ملک اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اور اس پر صرف اللہ کا ہی اقتدار قائم ہونا چاہیئے۔ اور اللہ کا اقتدار صرف اس صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ اس کی فضاؤں میں صرف "لا اِلٰہ الا اللہ" کا پرچم لہرائے۔ یہ بات کیوں کر مقبول اور درست ہو سکتی تھی کہ خدا کی زمین پر بسنے والی مخلوق رومی اور ایرانی طاغوتوں سے نجات پاتے ہی عربی طاغوت کا طوقِ غلامی اپنے گلے میں ڈال لے۔ طاغوت جس قبا میں بھی ہو وہ طاغوت ہے۔ انسان صرف خدائے واحد کے بندے اور غلام ہیں۔ اور وہ صرف اِس صورت میں بندے اور غلام رہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگیوں میں صرف اللہ کی الوہیت کا بول بالا ہو۔ ایک عرب "لا الٰہ الا اللہ" کا لغوی لحاظ سے جو مفہوم سمجھتا تھا وہ یہ تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی حاکمیّت نہ ہو، اللہ کے سوا کوئی اور ہستی قانون اور شریعت کا منبع و ماخذ نہ ہو، اور انسان کا انسان پر غلبہ و اقتدار باقی نہ رہے کیونکہ اقتدار بہمہ وجوہ اللہ ہی کے لیے ہے، اور اسلام انسانوں کے لیے جس "قومیت" کا علمبردار ہے وہ اسی عقیدہ کی بنیاد پر طے ہوتی ہے۔ تمام اقوام خواہ وہ کسی رنگ و نسل کی ہوں، عربی

ہوں یا رومی اور ایرانی، سب کی سب اس عقیدہ کی نگاہ میں پرچم الٰہی کے تحت مساویانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ قرآن کے نزدیک اسلامی دعوت کا یہی صحیح اور فطری طریقِ کار ہے۔

آپؐ نے اقتصادی انقلاب کا طریقِ کار کیوں نہ اختیار کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب معاشرہ دولت کی منصفانہ تقسیم اور عدل و انصاف کے صحت مندانہ نظام سے یکسر بیگانہ ہو چکا تھا۔ ایک قلیل گروہ تمام مال و دولت اور تجارت پر قابض تھا۔ اور سُودی کاروبار کے ذریعہ اپنی تجارت اور سرمائے کو برابر بڑھاتا اور پھیلاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں ملک کی غالب اکثریت مفلوک الحال اور بھوک کا شکار تھی۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں دولت تھی وہی عزّت و شرافت کے اجارہ دار تھے۔ رہے بیچارے عوام تو وہ جس طرح مال و دولت سے تہید امن تھے اسی طرح عزّت و شرافت سے بھی بے بہرہ تھے!

اس صورت حال کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی اجتماعی تحریک کیوں نہ اٹھائی اور دعوت کا مقصد دولت کی منصفانہ تقسیم ٹھیرا کر امراء و شرفا کے خلاف طبقاتی جنگ کیوں نہ چھیڑ دی تاکہ سرمایہ داروں سے محنت کش عوام کو ان کا حق دلواتے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس دَور میں ایسی کوئی اجتماعی تحریک اور دعوت لیکر اٹھتے تو

عرب معاشرہ لازماً دو طبقوں میں بٹ جاتا، مگر غالب اکثریت آپؐ کی تحریک کا ساتھ دیتی، اور سرمائے اور جاہ و شرف کی ستم کیشیوں کے سامنے ڈٹ جاتی اور آپؐ کے مقابلے میں وہ معمولی سی اقلیت ہی رہ جاتی جو اپنے پشتینی مال وجاہ سے چمٹی رہتی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہج اختیار فرماتے تو زیادہ مؤثر اور کارگر ہوتا۔ اور یہ صورت پیش نہ آتی کہ پورا معاشرہ "لا الٰہ الا اللہ" کے اعلان کے خلاف صف آرا ہو جائے، اور صرف چند نادرِ روزگار ہستیاں ہی دعوتِ حق کے افق تک پہنچ سکیں۔

کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ صلاحیت بدرجہ کمال موجود تھی کہ جب اکثریت آپؐ کی تحریک سے وابستہ ہو کر اپنی زمام قیادت آپؐ کے ہاتھ میں دے دیتی، اور آپؐ دولت مند اقلیت پر قابو پا کر اس کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنا چکتے تو آپؐ اپنے اس منصب و اقتدار کو اور اپنی پوری قوت و طاقت کو اُس عقیدۂ توحید کے منوانے اور اُسے قائم و راسخ کرنے میں استعمال کر لیتے جس کے لیے دراصل اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مبعوث فرمایا تھا۔ آپؐ انسانوں کو پہلے انسانی اقتدار کے آگے جھکا کر پھر انہیں پروردگارِ حق کے آگے جھکا دیتے۔

ایسا طریقِ کار اختیار نہ کرنے کی وجہ

لیکن خدائے علیم و حکیم نے آپؐ کو اِس طریقِ کار پر بھی چلنے کی اجازت

نہ دی۔ خدا کو معلوم تھا کہ یہ طریقِ کارِ دعوتِ اسلامی کے لیے موزوں و مناسب نہیں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ معاشرے کے اندر حقیقی اجتماعی انصاف کے سوتے صرف ایک ایسے ہمہ گیر نظریہ کے چشمۂ صافی سے ہی پھُوٹ سکتے ہیں جو معاملات کی زمامِ کار کلیتہً اللہ کے ہاتھ میں دیتا ہو اور معاشرہ ہر اُس فیصلے کو برضا و رغبت قبول کرتا ہو جو دولت کی منصفانہ تقسیم اور اجتماعی کفالت کے بارے میں بارگاہِ الٰہی سے صادر ہو، اور معاشرے کے ہر فرد کے دل میں' پانے والے کے دل میں بھی اور دینے والے کے دل میں بھی یہ بات پُوری طرح منقش ہو کہ وہ جس نظام کو نافذ کر رہا ہے اُس کا شارع اللہ تعالیٰ ہے، اور اس نظام کی اطاعت سے اُسے نہ صرف دنیا کے اندر فلاح کی امید ہے، بلکہ آخرت میں بھی وہ جزائے خیر پائے گا۔ معاشرے کی یہ کیفیت نہ ہو کہ کچھ انسانوں کے دل حرص و آز کے جذبات سے امنڈ رہے ہوں، اور کچھ دوسرے انسانوں کے دل حسد و کینہ کی آگ میں جل رہے ہوں۔ معاشرے کے تمام معاملات تلوار اور ڈنڈے کے زور پر طے کیے جا رہے ہیں، تخویف اور دھونس اور تشدّد کے بل پر فیصلے نافذ کیے جا رہے ہوں، انسانوں کے دل ویران اور ان کی روحیں دم توڑ رہی ہوں ——— جیسا کہ آج اُن نظاموں کے تحت ہو رہا ہے جو غیر اللہ کی الوہیت پر قائم ہیں۔

آپؐ نے اصلاحِ اخلاق کی مہم سے دعوت کا آغاز کیوں نہ کیا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت جزیرۃ العرب کی اخلاقی سطح ہر پہلو سے انحطاط کے آخری کنارے تک پہنچی ہوئی تھی۔ صرف چند بدویانہ فضائل اخلاق خام حالت میں موجود تھے۔

ظلم اور جارحیت نے معاشرے کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ جاہلی دَور کا نامور شاعر زہیر ابن ابی سلمیٰ اسی معاشرتی فساد کی طرف اپنے اس شعر میں حکیمانہ انداز سے اشارہ کرتا ہے:

ومن لم یذد عن حوضہ بسلاحہ
یھدّم، ومن لا یظلم الناس یظلم۔

جو ہتھیار کی طاقت سے اپنا دفاع نہیں کرے گا تباہ و برباد ہو گا۔ اور جو خود بڑھ کر لوگوں پر ظلم نہیں کرے گا تو وہ خود (بالآخر) ظلم کا شکار ہو جائے گا۔

اسی خرابی کی طرف جاہلی دَور کا یہ مشہور و معروف مقولہ بھی اشارہ کرتا ہے کہ: انصر اخاك ظالما أو مظلوما (اپنے بھائی کی مدد کر، خواہ وہ ظلم کر رہا ہو یا اُس پر ظلم ہو رہا ہو)۔

شراب خوری اور جُوا بازی معاشرتی زندگی کی روایت بن چکے تھے، اور ان پر فخر کیا جاتا تھا۔ جاہلی دَور کی تمام شاعری خمر اور قمار کے محور پر گھومتی

ہے۔ طرفہ ابن العبد کہتا ہے:

فلولا ثلاث هن من عيشة الفتى
وجدك لم احفل متى قام عودى

فمنهن سبقى العاذلات بشربة
كميت متى ماتعل بالماء تزبد

ومازال تشرابى الخمور ولذّتى
وبذلى وانفاقى طريفى وتالدى

الى ان تحامتنى العشيرة كلها
وافردت افراد البعير المعبّد

(۱) اگر تین چیزیں جو ایک نوجوان کی زندگی کا لازمہ ہیں نہ ہوتیں، تو مجھے کسی چیز کی پروا نہ رہتی بشرطیکہ مجھے تا بسدِّ رمق غذا ملتی رہتی۔

(۲) ان میں سے ایک میرا اپنے رقیبوں سے مے نوشی میں سبقت لے جانا ہے، اور مے بھی وہ دو آتشہ جس میں اگر پانی ملایا جائے تو اُس پر کف آجائے۔

(۳) شراب نوشی، لذت پرستی، اور بذل و اسراف پہلے بھی میری گھٹی میں پڑے ہوئے تھے اور آج بھی ہیں۔

(۴) آخر وہ دن آگیا کہ میرا پورا قبیلہ مجھ سے دور ہٹ گیا

اور مجھے الگ تھلگ کر دیا گیا، جیسے خارش زدہ اونٹ کو گلّے سے الگ کر دیتے ہیں۔

زنا کاری مختلف شکلوں میں رائج تھی۔ اور اس جاہلی معاشرے کی قابلِ فخر روایت بن چکی تھی۔ یہ ایک ایسا حمّام ہے جس میں ہر دور کا جاہلی معاشرہ ننگا نظر آتا ہے خواہ وہ دورِ قدیم کا جاہلی معاشرہ ہو یا عہدِ حاضر کا (نام نہاد مہذب معاشرہ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جاہلی معاشرے کی حالت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"جاہلیت میں نکاح کی چار صورتیں تھیں: ایک تو وہ صورت تھی جو آج لوگوں میں جاری ہے۔ یعنی ایک آدمی دوسرے شخص کو اس کی بیٹی یا اس کی تولیت میں رہنے والی دوشیزہ کے لیے پیغام نکاح دیتا۔ اور اُس کا مہر ادا کر کے اُس سے نکاح کر لیتا۔ نکاح کی دوسری صورت یہ تھی کہ مرد اپنی بیوی سے، جب کہ وہ حیض سے پاک ہو چکی ہوتی، کہتا کہ فلاں شخص کو بلا، اور اُس سے پیٹ رکھوا۔ چنانچہ وہ خود اس سے الگ رہتا، اور اُس وقت تک اُسے نہ چھوتا جب تک اُس آدمی کے حمل کے آثار ظاہر نہ ہو جاتے۔ آثار ظاہر ہو جانے کے بعد خاوند اگر چاہتا تو اس سے ہمبستری کر لیتا۔ وہ یہ طریقہ اس لیے اختیار کرتا تا کہ اُسے اچھے نسب کا لڑکا ملے۔ نکاح

کی اس شکل کو استبضاع کہا جاتا تھا۔ نکاح کی ایک تیسری صورت بھی تھی۔ مردوں کی ایک ٹولی جو دس سے کم ہوتی جمع ہو جاتی اور مل کر ایک عورت کے پاس جاتی، اور اُس سے مقاربت کرتی۔ جب اُسے حمل ٹھہر جاتا تو بچّے کی ولادت پر چند راتیں گزر جانے کے بعد وہ اُن سب کو بلا بھیجتی۔ اس طرح بُلاوا ملنے پر کوئی شخص جانے سے انکار نہ کر سکتا تھا۔ جب وہ اُس کے پاس جمع ہو جاتے، تو وہ عورت اُن سے کہتی: تمہیں اپنی کاروائی کا نتیجہ تو معلوم ہو ہی چکا ہے۔ میں نے ایک بچّہ جنا ہے۔ پھر وہ ان میں سے ایک کی طرف اشارہ کر کے کہتی کہ یہ تیرا بیٹا ہے۔ اس پر بچے کا نام اُس شخص کے نام پر رکھ دیا جاتا، اور لڑکا اُس کی طرف منسوب ہو جاتا۔ اور وہ اس نسبت سے انکار نہ کر سکتا تھا۔ نکاح کی چوتھی قسم یہ تھی کہ بہت سے لوگ جمع ہو جاتے، اور مل کر ایک عورت کے پاس جاتے۔ جس کے پاس جانے میں کسی کو کوئی رکاوٹ نہ ہوتی تھی۔ دراصل یہ پیشہ ور فاحشہ عورتیں ہوتی تھیں، اور علامت کے طور پر اپنے دروازوں پہ جھنڈے نصب کر لیتیں۔ جو شخص بھی اپنی حاجت پوری کرنا چاہتا ان کے پاس چلا جاتا۔ ایسی عورتوں میں سے اگر کسی کو حمل ٹھہر جاتا تو وضع حمل کے بعد سارے لوگ

اُس کے پاس اکٹھے ہو جاتے، اور ایک قیافہ شناس کو بُلا لیتے۔
وہ ان میں سے جس کی طرف اُس لڑکے کو منسوب کرتا وہ لڑکا اس
شخص کا قرار پاتا، اور وہ اس سے انکار نہ کرسکتا۔"

(بخاری کتاب النکاح)

سوال کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو ایک اصلاحی تنظیم کے قیام کا اعلان کر کے اس کے ذریعہ اصلاح اخلاق، تزکیۂ نفوس اور تطہیر معاشرہ کا کام شروع کر دیتے۔ کیونکہ جس طرح ہر مصلحِ اخلاق کو اپنے ماحول کے اندر چند پاکیزہ اور سلیم الفطرت نفوس ملتے رہے ہیں، اسی طرح آپ کو بھی ایک ایسا پاک سرشت گروہ بالیقین دستیاب ہو جاتا جو اپنے ہم جنسوں کے اخلاقی انحطاط اور زوال پر دِلی دُکھ محسوس کرتا۔ یہ گروہ اپنی سلامتیٔ فطرت اور نفاستِ طبع کے پیشِ نظر آپؐ کی دعوتِ تطہیر و اصلاح پر لازمًا لبیک کہتا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کام کا بیڑا اُٹھاتے تو بڑی آسانی سے اچھے انسانوں کی ایک جماعت کی تنظیم میں کامیاب ہو جاتے۔ یہ جماعت اپنی اخلاقی طہارت اور روحانی پاکیزگی کی وجہ سے دوسرے انسانوں سے بڑھ کر عقیدۂ توحید کو قبول کرنے اور اس کی گرانبار ذمہ داریوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہوتی۔ اور اس حکیمانہ آغاز سے آپؐ کی یہ دعوت کہ الوہیت صرف خدا کے لیے مخصوص ہے، پہلے ہی مرحلہ میں تند و تیز مخالفت سے دوچار

نہ ہوتی۔

اس طریقہ میں کیا کمزوری تھی؟

لیکن اللہ تعالےٰ جانتا تھا کہ یہ راستہ بھی منزل مقصود کو نہیں جاتا۔ اُسے معلوم تھا کہ اخلاق کی تعمیر صرف عقیدہ کی بنیاد پر ہی ہوسکتی ہے۔ ایک ایسا عقیدہ جو ایک طرف اخلاقی اقدار اور معیار ردّ و قبول فراہم کرے، اور دوسری طرف اُس "طاقت" (Energry) کا تعین بھی کرے جس سے یہ اقدار و معیار ماخوذ ہوں، اور انہیں سند کا درجہ حاصل ہو۔ اور اُس جزا و سزا کی نشاندہی بھی کرے جو ان اقدار و معیارات کی پابندی یا ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اُس "طاقت" کی طرف سے دی جائے گی۔ دلوں پر اس نوعیّت کے عقیدہ کی ترسیم اور بالاتر قوّت کے تصوّر کے بغیر اقدار و معیارات خواہ کتنے ہی بلند پایہ ہوں مُسلسل تغیّر کا نشانہ بنے رہیں گے، اور ان کی بنیاد پر جو بھی اخلاقی نظام قائم ہوگا وہ ڈانواں ڈول رہے گا۔ اس کے پاس کوئی ضابطہ نہ ہوگا، کوئی نگران اور مُحتسب طاقت نہ ہوگی، کیونکہ دل جزا و سزا کے کسی لالچ یا خوف سے بالکل خالی ہوں گے۔

ہمہ گیر انقلاب

صبر آزما کوششوں سے جب عقیدۂ الوہیّت دلوں میں راسخ ہوگیا، اور اُس "طاقت" کا تصوّر بھی دلوں میں اُتر گیا جس سے اس عقیدہ کو سند حاصل ہوتی

تھی ——— دوسرے لفظوں میں جب انسانوں نے اپنے رب کو پہچان لیا اور صرف اُسی کی بندگی کرنے لگے ، جب انسان خواہشاتِ نفس کی غلامی سے ، اور اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی آقائی سے آزاد ہوگئے ، اور "لا الٰہ الا اللہ" کا نقش دلوں میں پوری طرح مُرتسم ہوگیا تو اللہ تعالےٰ نے اس عقیدہ اور اس عقیدہ کے ماننے والوں کے ذریعہ وہ سب کچھ فراہم کردیا جو وہ تجویز کرسکتے تھے ۔ خدا کی زمین رومی اور ایرانی سامراج سے پاک ہوگئی ، لیکن اس تطہیر کا مدّعا یہ نہیں تھا کہ اب زمین پر عربوں کا سکّہ رواں ہو بلکہ اس لیے کہ اللہ کا بول بالا ہو ، چنانچہ زمین خدا کے سب باغیوں سے ، خواہ وہ رومی تھے یا ایرانی اور عربی ، پاک کردی گئی ۔

نیا اسلامی معاشرہ اجتماعی ظلم اور لوٹ کھسوٹ سے بالکل پاک تھا ، یہ اسلامی نظام تھا اور اس میں عدل الٰہی پوری طرح جلوہ گر تھا ۔ یہاں صرف میزان الٰہی میں ہر خوب و زشت اور صحیح و غلط کو تولا جاتا تھا ۔ اس عدل اجتماعی کی بنیاد توحید تھی ، اور اس کا اصطلاحی نام "اسلام" تھا ۔ اس کے ساتھ کسی اور نام یا اصطلاح کا اضافہ کبھی گوارا نہیں کیا گیا ۔ اُس پر صرف یہ عبارت کندہ تھی : " لا الٰہ الا اللہ "

؎ سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے !

نفوس اور اخلاق میں نکھار آگیا ۔ قلوب و ارواح کا تزکیہ ہوگیا ۔ اور یہ اصلاح اس انداز سے ہوئی کہ چند مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر اُن حدود و تعزیرات کے استعمال کی نوبت ہی نہ آئی جن کو اللہ تعالےٰ نے قائم فرمایا تھا ۔ اس لیے کہ اب ضمیروں کے اندر پولیس کی چوکیاں قائم ہوگئیں ۔ اب خدا کی خوشنودی

کی طلب، اجر کی خواہش، خدا کے غضب اور عذاب کا خوف محتسب کا فرض انجام دے رہا تھا۔ الغرض انسانی نظام، انسانی اخلاق اور انسانی زندگی کمال کی اس بلندی تک پہنچ گئی جس تک نہ پہلے پہنچی تھی، اور نہ صدرِ اوّل کے بعد آج تک پہنچ سکی ہے۔

یہ انقلاب عظیم کیسے برپا ہؤا؟

یہ انقلاب عظیم اور کمالِ انسانیت صرف اس بنا پر حاصل ہؤا کہ جن لوگوں نے دینِ حق کو ایک ریاست، ایک نظام، اور جامع قانون و شریعت کی شکل میں قائم کیا تھا وہ خود پہلے اِسے اپنے قلب و ضمیر اور اپنی زندگی میں قائم کر چکے تھے۔ اِسے عقیدہ و فکر کے طور پر تسلیم کر چکے تھے، اپنے اخلاق کو اس سے آراستہ و پیراستہ کر چکے تھے، اپنی عبادات میں اسے سند دے چکے تھے اور اپنے معاملات میں اس کا سکّہ رواں کر چکے تھے۔ اِس دین کے قیام پر اُن سے صرف ایک ہی وعدہ کیا گیا تھا۔ اِس وعدہ میں غلبہ و اقتدار عطا کر دینے کا کوئی جز شامل نہیں تھا حتیٰ کہ یہ جُز بھی شامل نہ تھا کہ یہ دین لازماً انہی کے ہاتھوں غالب ہو گا۔ ان سے جو کچھ کہا گیا وہ صرف اتنا تھا کہ اقامتِ دین کے عوض انہیں جنّت ملے گی۔ جو صبر آزما جہاد ان لوگوں نے کیا، جو زہرہ گداز آزمائشیں انہوں نے سہیں، جس پامردی و استقامت کے ساتھ وہ راہِ دعوت پر رواں دواں رہے، اور پھر بالآخر جس طرح انہوں نے جاہلیت کے مقابلے میں اس حقیقتِ کُبریٰ کا ساتھ دیا جو "لا الٰہ الا اللہ" کے اندر پنہاں ہے اور جو ہر زمان و مکان کے فرماں رواؤں کے لیے ناگوار رہی ہے ———— اِن سب خدمات

کے عوض اُن سے صرف ایک وعدہ کیا گیا جس کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔ یعنی فقط وعدۂ فردا!

جب اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمائش کی بھٹی میں ڈالا اور وہ ثابت قدم رہے اور ہر نفسانی خواہش اور حظ سے دست بردار ہو گئے، اور جب اللہ تعالیٰ نے جان لیا کہ وہ اس دنیا کے اندر اب کسی طور جزا اور صلہ کے منتظر نہیں ہیں۔ نہ انہیں اس کا انتظار ہے کہ یہ دعوت لازماً اُنہی کے ہاتھوں غلبہ حاصل کرے، اور یہ دین اُنہی کی قربانیوں اور کوششوں سے بالا و برتر ہو۔ ان کے دلوں میں نہ آباؤ اجداد کا تفاخر باقی رہا، نہ قومی گھمنڈ کے جراثیم، نہ وطن و ملک کی بڑائی کا جذبہ رہا اور نہ قبائلی اور نسبی عصبیتوں کی بُو رہی۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے انہیں ان خوبیوں سے آراستہ دیکھا تب جا کر اُن کے حق میں یہ فیصلہ دیا کہ یہ لوگ اب "امانتِ عظمیٰ" (یعنی خلافتِ ارضی) کے بار کو اُٹھا سکتے ہیں۔ یہ اس عقیدے میں کھرے ہیں جس کا تقاضا ہے کہ ہر طرح کی حاکمیت صرف خدائے واحد کے لیے مخصوص ہو، دل و ضمیر پر، اخلاق و عبادات پر، جان و مال پر، اور حالات و ظروف پر صرف اسی کی حاکمیت ہو۔ خدا کو معلوم تھا کہ یہ اُس سیاسی اقتدار کے سچے محافظ ثابت ہوں گے جو ان کے ہاتھوں میں اس غرض کے لیے دیا جائے گا تاکہ شریعتِ الٰہی کو نافذ کریں اور عدلِ الٰہی کو قائم کریں۔ مگر اس اقتدار میں سے ان کی اپنی ذات کے لیے یا اپنے قبیلے اور برادری کے لیے یا اپنی قوم کے لیے کوئی حصّہ نہ ہو۔ بلکہ وہ سراسر اللہ تعالےٰ کے لیے خالص ہو، اور اللہ کے دین اور اس کی شریعت کی خدمت کے لیے ہو۔

کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس اقتدار کا منبع صرف اللہ ہے اور اُسی نے اُن کی تحویل میں دیا ہے۔

نظامِ حق کی کامیابی کا واحد راستہ

اگر دعوتِ اسلامی کا قافلہ اِس انداز سے روانۂ سفر نہ ہوتا، اور دوسرے تمام جھنڈوں کو پھینک کر صرف اِسی جھنڈے ——— یعنی لا الٰہ الا اللہ کے پرچمِ توحید ——— کو بلند نہ کرتا، اور اِس راہ کو اختیار نہ کرتا جو ظاہر میں دشوار گزار اور جان گُسل راہ تھی مگر حقیقت میں آسان اور برکت بداماں تھی تو اس مبارک اور پاکیزہ نظام کا کوئی جزبھی اتنے بلند معیار کے ساتھ ہرگز بروئے عمل نہ آسکتا تھا۔ اِسی طرح اگر یہ دعوت اپنے ابتدائی مراحل میں قومی نعرہ بن کر سامنے آتی، یا اقتصادی تحریک کے لبادہ میں ظاہر ہوتی، یا اصلاحی مہم کا قالب اختیار کرتی یا "لا الٰہ الا اللہ" کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے شعار اور نعرے بھی شامل کر لیتی تو یہ پاکیزہ و مبارک نظام جو اس دعوت کے نتیجے میں قائم ہوا کبھی خالص ربّانی نظام بن کر جلوہ گر نہ ہو سکتا۔

قرآن حکیم کا مکّی دور اِسی شان وشوکت کا حامل ہے۔ یہ دَور قلوب و اذہان پر اللہ کی الوہیّت کا نقش ثبت کرتا ہے، انقلاب کے فطری راستے کی تعلیم دیتا ہے خواہ اس میں بظاہر کتنی ہی دشواریوں اور صعوبتوں کا سامنا ہو، اور دوسری "پگڈنڈیوں" پر جانے سے منع کرتا ہے خواہ عارضی طور پر انہیں اختیار کرنے کا ارادہ ہو، وہ ہر حال میں صرف فطری راستے پر گامزن رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

ابتدائے دعوت میں جزوی مسائل کو کیوں نہ چھیڑا گیا

اسی طرح قرآن حکیم کا یہ پہلو بھی داعیانِ حق کے لیے قابلِ غور ہے کہ اس نے مکّی زندگی میں صرف عقیدہ ہی پر اپنی ساری بحث کو مرکوز رکھا، اور نظامِ زندگی کی ان تفصیلات کو نہیں چھیڑا جو اس عقیدہ کے تقاضے میں مترتب ہوتی ہیں، اور نہ ان قوانین و احکام سے بحث کی جو اس عقیدہ کی روشنی میں معاملاتِ زندگی کی تنظیم کرتے ہیں۔

دراصل اس دین کا جو مزاج ہے اُس کا یہ تقاضا تھا کہ قرآن مکّی زندگی میں صرف عقیدہ کے مسئلہ تک اپنی دعوت کو محدود رکھتا۔ ظاہر ہے کہ پورا دین وحدتِ الٰہ کے نظریہ پر قائم ہے۔ اس کا پورا نظامِ قانون اور نظامِ معاشرت اسی بنیادی نظریے سے ماخوذ ہے۔ اس دین کی مثال اُس بلند و بالا اور تناور درخت کی سی ہے جس کا سایہ گھنا اور دُور دُور تک پھیلا ہوا ہو، جس کی شاخیں باہم دگر پیوست اور آسمان سے باتیں کرتی ہوں۔ ایسا درخت قدرتی طور پر اپنی ضخامت اور پھیلاؤ کے مطابق اپنی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں اُتارتا ہے، اور انہیں دُور دُور حصّوں تک پھیلاتا ہے۔ بعینہٖ یہی اس دین کا حال ہے۔ اس کا نظام زندگی کے ہر گوشے پر حاوی ہے، انسانیت کے ہر چھوٹے اور بڑے معاملے سے بحث کرتا ہے، انسانی زندگی کی تنظیم صرف دنیا کے اندر ہی نہیں بلکہ آخرت میں بھی کرتا ہے، عالمِ شہود ہی کے نہیں عالمِ غیب کے مسائل بھی حل کرتا ہے اور صرف ظاہری اور مادّی معاملات میں ہی دخل نہیں دیتا بلکہ ضمیر کی بے پایاں گہرائیوں، اور دلوں کے مخفی ارادوں، اور نیتّوں کے غیر مرئی تموّج سے بھی تعرّض کرتا ہے

اور انہیں درست کرتا ہے ——————— یہ دین ایک قوی ہیکل، وسیع الاطراف اور فلک پیما عمارت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی بنیادوں کا پھیلاؤ اور گہرائی بھی اِسی وسعت اور ضخامت کے مطابق ہونی چاہیئے۔

دین کی حقیقت اور اُس کے مزاج کا یہی پہلو خود دین کی تعمیر و توسیع کے بارے میں اس کے مخصوص طریقِ کار کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ دلوں کے اندر پہلے عقیدہ کی داغ بیل ڈالنا، اور پھر اُسے اچھی طرح مستحکم و راسخ کرنا یہاں تک کہ یہ عقیدہ روحِ انسان کے کونے کونے میں سرایت کر جائے اور اُسے پوری طرح اپنے احاطے میں لے لے صحیح نشو و نما کے لیے ناگزیر ضرورت ہے۔ اسی طریقہ سے دین کے تناور درخت کے اُس حصّے کے درمیان جو فضاؤں میں موجود ہے اور اُس حصّے کے درمیان جو جڑوں کی شکل و صورت میں زمین کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے، ناگزیر ہم آہنگی پیدا کرتا ہے، بلکہ ان جڑوں کو وہ قوّت بھی بخشتا ہے جو ظاہری حصّہ کا بوجھ برداشت کرنے کے لیے ضروری ہے۔

جب "لا الٰہ الا اللہ" کا عقیدہ دل کی گہرائیوں میں گھر کر لیتا ہے، تو اس کے ساتھ ہی وہ پورا نظامِ زندگی بھی سرایت کرتا جاتا ہے جو اس عقیدہ کی عملی تفسیر ہے۔ جس سے یہ بات خود بخود متعیّن ہو جاتی ہے، کہ یہی وہ واحد نظام ہے جس پر اس عقیدہ کے حامل نفوس راضی ہو سکتے ہیں۔ اور پیشتر اس کے کہ اس نظام کی تفصیلات ان کے سامنے پیش کی جائیں، اور اس کے قوانین و احکام سے انہیں آگاہ کیا جائے، وہ پہلے ہی اصولی طور پر اس نظام کے آگے سرافگندہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ ایمان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ پہلا قدم ہی بے چون و چرا اطاعت،

اور غیر مشروط تسلیم کے جذبہ سے اُٹھے۔ چنانچہ مکّی دَور کے بعد جب مدینہ کا دَور آیا تو ان نفوسِ قدسیہ نے ایسے ہی جذبۂ تسلیم اور شوقِ سرافگندگی کے ساتھ اُن تمام قوانین اور اصلاحات کا استقبال کیا جو قرآن نے وقتاً فوقتاً اُن کے سامنے پیش کیں۔ جوں ہی کوئی حکم جاری ہوًا سر جُھک گئے اور کسی زبان پر کوئی کلمۂ اعتراض نہ آیا، اُدھر فرمان کانوں میں پڑا اور اِدھر اُسے عمل کا جامہ پہنا دیا گیا۔ کہیں لیت و لعل کو راہ نہ ملی۔ شراب حرام قرار دی گئی، سُود کی حرمت نازل ہوئی، جُوئے بازی ممنوع قرار پائی، الغرض جاہلی دَور کے تمام رسوم و رواج پامال ہو گئے ——— مگر کس طرح ؟ صرف قرآن کی چند آیات کے ذریعہ، یا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے مجرد چند کلمات کے صدور سے۔ اس کے مقابلے میں دنیاوی حکومتوں کو دیکھیے، وہ ان میں سے ہر ہر چیز کو ختم کرنے کے لیے قانون کا سہارا لیتی ہیں، قانون سازی کرتی ہیں، اور انتظامی ادارے حرکت میں آتے ہیں، فوج اور پولیس کو استعمال کیا جاتا ہے، اختیارات کے ترکش خالی کیے جاتے ہیں، پروپگنڈا اور پریس کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں مگر اس سب کچھ کے باوجود وہ علانیہ خلاف ورزیوں پر گرفت سے زیادہ کچھ نہیں کر پاتیں۔ اور معاشرہ منکرات اور محرمات سے جُوں کا تُوں لبریز رہتا ہے [۱]

---

[۱] اسلام میں شراب کیسے حرام کی گئی، اس پر مفصّل بحث "فی ظلال القرآن" کی پانچویں جلد ص ۸۰۷ تا ۸۰۵ ملاحظہ ہو۔ اور شراب کی بندش میں امریکہ کس طرح بے بس ہو گیا، اس کی تفصیل مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب: ماذا خسر العالم (باقی صفحہ پر)

عملی اور حقیقت پسند دین

دین کے مزاج کا ایک اور پہلو بھی، جس کی جھلک اُس کے پاکیزہ نظام میں ملتی ہے قابلِ غور ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ دین ایک ٹھوس اور عملی تحریک کا لائحہ عمل ہے۔ انسانی زندگی پر عملاً حکمرانی کرنے کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ وہ عملی حالات کا سامنا کرتا ہے، تاکہ اُن کے بارے میں اپنا رویّہ متعین کرے: انہیں برقرار رکھے، یا ان میں ترمیم کرے، یا انہیں کلیتہً بدل دے۔ لہٰذا اُس کی تمام تر قانون سازی صرف اُن حالات کے لیے ہوتی ہے جو بالفعل موجود ہوتے ہیں، اور اُس معاشرے میں پائے جاتے ہیں جو اصولی طور پر خدائے واحد کی حاکمیّت کو تسلیم کر چکا ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ دین کسی "نظری فلسفے" کا نام نہیں ہے، جو محض "مفروضات" پر اپنا ڈھانچہ استوار کرتا ہو۔ بلکہ یہ ایک "عملی نظام" ہے جو عمل اور حرکت کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے یہ ناگزیر ہے کہ پہلے وہ مسلم معاشرہ وجود میں آئے جو عقیدۂ الوہیت کا اقرار کرتا ہو، اور یہ عہد کرتا ہو کہ حاکمیّتِ اعلیٰ خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے۔ غیر اللہ کی حاکمیّت کی وہ صاف صاف نفی کرتا ہو، اور ہر اُس قانون کے جواز کو چیلنج کرتا ہو جو عقیدۂ الوہیّت پر مبنی نہ ہو۔ اس نوع کا معاشرہ جب وجود میں آ جاتا ہے، اور اسے بالفعل مختلف

(بقیہ ص سے) الاسلامی بالخطاط المسلمین" میں دیکھیے جو انہوں نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "تنقیحات" مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ کے حوالے سے نقل کی ہے۔ (مصنّف)

عملی مسائل سے سابقہ پیش آتا ہے، اور اُسے ایک نظام اور قانون کی ضرورت لاحق ہوتی ہے تو اُس وقت یہ دین احکام و قوانین کی تدوین اور نظام و ضوابط کی تشکیل کا آغاز کرتا ہے۔ اور اپنے پیش نظر وہ لوگ رکھتا ہے، جو اصولی طور پر شروع ہی سے اس کے ہر قانون اور ہر ضابطے کو مان چکے ہوتے ہیں، اور دوسرے تمام ضوابط و قوانین کو اصولاً ٹھکرا چکے ہوتے ہیں۔

اسے نافذ کرنے کے لیے طاقت کی ضرورت ہے

اس عقیدہ کے ماننے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود مختار ہوں اور انہیں معاشرے میں اقتدار اور غلبہ حاصل ہو، جس کے بل بوتے پر وہ معاشرے کے اندر اس نظام کو، اور اس کے جملہ احکام کو جاری و ساری کر سکیں۔ تاکہ یہ نظام اپنی پوری ہیبت و شکوہ کے ساتھ جلوہ گر، اور اس کے احکام صحیح طور پر بارآور ہو سکیں۔ علاوہ ازیں معاشرے کو جب روزمرہ کے عملی مسائل سے واسطہ پڑے گا تو ان سے نپٹنے کے لیے بھی احکام و قوانین کی ضرورت محسوس ہو گی، اس ضرورت اور تقاضے کو پورا کرنے کیلیے سیاسی قوّت ناگزیر ہے۔

مکّی زندگی میں مسلمان خود مختار نہ تھے، اور اپنے معاشرے میں بھی انہیں کوئی اقتدار حاصل نہ تھا۔ ان کی عملی زندگی نے ابھی مستقل اور جُداگانہ شکل بھی اختیار نہیں کی تھی کہ اسے وہ شریعتِ الٰہی کے تحت منظّم کرتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس دور میں اُن کے لیے کوئی انتظامی ضابطے اور عمومی قوانین نازل نہیں ہوئے۔ اس دَور میں اُنہیں درگاہِ خداوندی سے جو کچھ عطا ہوا وہ عقیدہ اور صرف عقیدہ تھا، یا اس عقیدہ کے رگ و پے میں اُترنے کے بعد اس

کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اخلاق عالیہ تھے۔ لیکن جب مدنی زندگی میں اُن کی ایک خود مختار ریاست وجود میں آگئی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر زندگی کے عام ضوابط و احکام کا نزول بھی شروع ہوگیا، اور ان کے لیے وہ نظام منصۂ شہود پر آگیا جو مسلم معاشرے کی عملی ضروریات کو بخوبی پُورا کرتا تھا، ریاست کی طاقت اس کی پُشت پناہ اور قوتِ نافذہ (Sanction) تھی۔

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں پسند فرمایا کہ تمام ضوابط و قوانین مکّہ کے اندر ہی نازل کر دیے جاتے، تاکہ مسلمان "تیار حالت" میں ان کا ذخیرہ کر کے رکھ لیتے، اور مدینہ میں منتقل ہونے کے بعد جوں ہی اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آتا، انہیں فی الفور نافذ اور جاری کر دیا جاتا۔ یہ طریقِ کار مزاجِ دین کے منافی ہے۔ یہ دین اِس طرح کی احتیاطی تدابیر سے کہیں زیادہ عملی اور کہیں زیادہ دُور اندیش ہے۔ اس کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ فرضی مسائل کے لیے فرضی حل تلاش کرنے میں وقت ضائع کرے۔ بلکہ وہ قائم شدہ صورتِ احوال کا جائزہ لیتا ہے۔ اور اگر یہ دیکھتا ہے کہ فی الواقع ایک ایسا زندہ اور توانا معاشرہ موجود ہے، جو اپنے قالب و شکل کے اعتبار سے، اور اپنے حالات و مسائل کے لحاظ سے مُسلم معاشرہ ہے، شریعتِ الٰہی کے سامنے سرنگوں ہو چکا ہے اور غیر الٰہی شرائع سے بے زار ہے۔ تو ایسی صورت میں بے شک یہ دین اس معاشرے کے حالات و ضروریات کے مطابق قوانین وضع کر کے ان کے نفاذ کا مطالبہ کرتا ہے۔

اسلامی قانون کی پیشگی تشکیل لاحاصل ہے

جو لوگ آج اسلام سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ پہلے وہ اپنے نظریات مدوّن کرے، اپنے نظام کا ڈھانچہ تیار کرے، اپنے قوانین حیات کا دفتر تیار کرے حالانکہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ روئے زمین پر کہیں ایسا معاشرہ نظر نہیں آتا جس نے دوسرے تمام انسانی قوانین کو مسترد کر کے بالفعل شریعتِ الٰہی کے ہاتھ میں اپنی زمامِ حکومت دے رکھی ہو، اور اُسے وہ اختیارات بھی حاصل ہوں، جن کے بل پر اس کے قوانین کو نافذ کیا جا سکے، تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام سے اس قسم کا مطالبہ کرنے والے درحقیقت اس دین کے مزاج سے ناآشنا ہیں، اور زندگی کی بے کراں پہنائیوں میں دین کے عملی کردار سے ناواقف ہیں۔ انہیں اس بات کا بھی علم نہیں ہے کہ دین کی عملی تنفیذ سے اللہ تعالےٰ کی منشا کیا ہے؟ درحقیقت ایسا مطالبہ کرنے والے حضرات کی اصل خواہش یہ ہے کہ یہ دین اپنی فطرت سے منحرف ہو جائے، اپنا اصل طریقِ کار ترک کر دے، اپنی تاریخ بدل ڈالے، اور عام انسانی نظریات اور انسانی شریعتوں کی سطح پر اُتر آئے۔ اُن کی کوشش یہ ہے کہ یہ اپنی فطری شاہراہ اور فطری مراحل کو نظرانداز کر کے کوئی مختصر راستہ اختیار کر لے، تاکہ ان کی فوری اور عارضی خواہشات کی تسکین ہو سکے۔ اور خواہشات بھی وہ جن کی پیدائش کا سبب وہ نفسیاتی شکست ہے جو گھٹیا اور بے بضاعت انسانی قوانین کے مقابلے میں ان پر طاری ہو چکی ہے۔ بایں ہمہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ یہ دین بھی مجرّد نظریات اور مفروضات کا مجموعہ بن کر رہ جائے جن کا موضوع بحث ایسے حالات و وقائع ہوں جن کا عملی وجود عنقا ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ کا منشا یہ

ہے کہ یہ دین اُسی طرح نافذ ہو جس طرح پہلے نافذ ہوا تھا۔ پہلے اِسے بطور عقیدہ تسلیم کیا جائے جو دل و دماغ کی گہرائیوں میں اُترے اور قلب وضمیر پر اپنی سلطانی قائم کرے۔ پھر اس عقیدہ کے تقاضے پورے کیے جائیں۔ اس کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ انسان خدا کے سوا کسی کے آگے نہ جھکیں، خدا کے ماسوا کسی ہستی سے قوانین حیات اخذ نہ کریں۔ جب اس عقیدہ کی حامل ایک جماعت تیار ہو جائے، اور معاشرے پر اُسے عملی غلبہ نصیب ہو جائے تو اس عقیدے کی روشنی میں ایسے تمام قوانین بنتے رہیں گے جو اس جماعت یا معاشرے کی عملی ضروریات کو پورا کریں، اور اس کی عملی زندگی کی تنظیم کریں۔ یہ ہے اس دین کے قیام کا صحیح طریقہ جو اللہ کو پسند ہے۔ اللہ کے پسندیدہ طریقہ کے علاوہ کوئی اور طریقہ ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتا، خواہ لوگ کتنی خواہشیں کریں اور کتنے مطالبات پیش کریں۔

اقامتِ دین کا صحیح طریقہ

اِس بنا پر دعوتِ اسلامی کے علمبرداروں کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ جب لوگوں کو دین کے احیاء اور تجدید کی دعوت دیں تو اُن سے پہلا مطالبہ یہ کریں کہ وہ اسلام کے بنیادی عقیدہ کا اقرار کریں۔ وہ لوگ چاہے اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوں، انہوں نے مسلمانوں کے سے نام رکھ رکھے ہوں، اُن کے پیدائش کے سرٹیفکیٹ بھی اُن کے مسلمان ہونے کی شہادت دیتے ہوں۔ بہرحال دعوتِ اسلامی کے علمبردار پہلے ان مسلمانوں کو یہ سمجھائیں کہ "اسلام" جس حقیقت کا نام ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے عقیدۂ لا الٰہ الا اللّٰہ کو اس کے حقیقی مفہوم کے ساتھ تسلیم کیا جائے۔ اس کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ہر معاملہ

صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت میں دیں، اور جو لوگ اللہ کی حاکمیت سے بغاوت کرکے اپنی ذات کے لیے اس حاکمیت کا دعویٰ کریں ان کے اس دعوے کی تردید کریں۔ عقیدۂ اسلام کو اس کے اس مفہوم کے ساتھ ماننے کے بعد یہ لازم آتا ہے کہ یہ عقیدہ ماننے والے کے دلوں اور دماغوں میں اچھی طرح رچ بس جائے، ان کی عبادات پر اسی کی چھاپ ہو اور ان کی زندگی کا ہر ہر گوشہ اسی کے نور سے فروزاں ہو۔

لوگوں کے اندر جب بھی دعوتِ دین کی تحریک برپا ہو اُس کی نگاہ میں اس پہلو کو اساسی اہمیت حاصل ہونی چاہیئے۔ خود دنیا کی پہلی اسلامی تحریک نے اسی کو دعوت کی اساس قرار دیا تھا۔ قرآن کریم کا مکّی حصّہ پورے ۱۳ سال تک اِس پہلو کو قائم اور مستحکم کرنے میں لگا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسانوں کا کوئی گروہ دین کے حقیقی مفہوم کو اس طرح سمجھ کر تحریکِ اسلامی میں داخل ہو جائے تو صرف اسی گروہ کو صحیح معنوں میں "اسلامی جمعیت" یا "اسلامی معاشرہ" کہا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ جمعیت یا معاشرہ جو یہ صلاحیّت رکھتا ہے کہ اس کی اجتماعی زندگی میں اسلام کا نظامِ حیات جاری و ساری ہو۔ کیونکہ اس جمعیّت نے اپنی آزاد مرضی سے یہ طے کر لیا ہے کہ اس کی پُوری زندگی اِسلامی نظام پر استوار ہوگی، اور وہ کسی معاملہ میں بھی خداوندِ عالم کی حاکمیّت کے سوا کسی اور کی حاکمیّت کو قبول نہیں کرے گی۔

یُوں جب ایک معاشرہ بالفعل وجود میں آ جائے گا تو نظامِ اسلامی کی اساسی تعلیمات اُس کے سامنے رکھ دی جائیں گی، اور معاشرہ خود ہی نظامِ اسلامی

کے عمومی ضوابط کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے ایسے تمام قوانین اور احکام وضع کرتا رہے گا جن کا عملی ضروریات تقاضا کریں گی۔ ہمارے نزدیک ایک عملی اور حقیقت پسندانہ اور حکیمانہ اسلامی نظامِ حیات کو قائم کرنے کے لیے مختلف مراحل کی یہی صحیح اور بارآور ترتیب ہے۔ بعض عجلت پسند مُخلصین جنہیں دین کی اصل حقیقت اور مزاج کا ادراک حاصل نہیں، اور نہ انہوں نے دین کے اُس سیدھے اور راست ربّانی طریقِ کار پر ہی غور کیا ہے جو خدائے علیم و حکیم کی بے پایاں حکمت پر مبنی ہے، اور انسانی طبائع اور زندگی کی ضروریات کے بارے میں اُس کے علمِ مُحیط کا کرشمہ ہے وہ بسا اوقات یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ لوگوں کو اسلامی نظام کی بنیادوں، بلکہ محض اسلامی قوانین و احکام سے آگاہ کرنے سے ہی دعوتِ اسلامی کی راہ آسان ہو جائے گی، اور لوگوں کے دلوں میں اسلام کے لیے خود بخود ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جائیں گے۔ ان حضرات کا یہ نظریہ محض ایک خام خیالی ہے، جو ان کے عجلت پسند ذہنوں کی پیداوار ہے۔ یہ اُسی قبیل کا ایک تخیّل ہے جس کی مثالیں ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں کہ کس طرح خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی ایسی کئی ایک تجاویز پیش کی جا سکتی تھیں اور کہا جا سکتا تھا کہ آنجنابؐ اگر اپنی دعوت کا آغاز قوم پرستی کے کسی نعرے، معاشی انقلاب کے کسی دعوے، یا اخلاقی اصلاح کی کسی تحریک سے کرتے تو آپ کی راہ ہموار اور آسان ہو جاتی، اور انہیں مشکلات کی وادیٔ پُر خار میں آبلہ پائی نہ کرنی پڑتی۔

اصولی طور پر سب سے پہلے ضروری ہے کہ دل خدائے واحد کیلئے یکسو ہونے چاہئیں اُسی کی عبودیت کا اعلان کریں، اُسی کی شریعت کو تسلیم کریں، اور دُوسری ہر

شریعت کو ٹھکرا دیں قبل اس کے کہ شریعت کی تفصیلات بتا کر اُن کے اندر اس کے لیے مزید رغبت اور کشش پیدا کی جائے۔ شریعت کے ساتھ یہ رغبت تو دراصل اللہ کی خالص بندگی کے چشمے سے ہی اُبلنی چاہیئے۔ اور اس کا مآخذ دلوں میں غیر اللہ کی غلامی سے نجات پانے کا شوقِ فراواں ہو۔ یہ کوئی صحیح صورتِ حال نہیں ہو گی کہ دلوں میں قانون الہٰی کے ساتھ رغبت اور دلچسپی کی بنیاد یہ امر ہو کہ تقابلی مطالعہ کے بعد بعض لوگوں نے اس کو بعض پہلوؤں سے اُن انسانی قوانین سے زیادہ مفید اور بہتر پایا ہے جو ان کے گردوپیش کی دنیا میں عملاً جاری و ساری ہیں۔ بلاشبہ نظام خداوندی سراسر سرچشمۂ خیر و سعادت ہے۔ اس کے باعث خیر اور موجبِ سعادت ہونے کے لیے صرف یہی دلیل کافی ہے کہ اُسے اللہ تعالیٰ نے تجویز فرمایا ہے۔ غلاموں کی شریعت کسی حال میں بھی اللہ کی شریعت سے لگا نہیں کھا سکتی۔ مگر ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ حقیقتِ نفس الامری دعوت اسلامی کی بنیاد نہیں ہے۔ دعوت کی بنیاد صرف "اسلام" ہے۔ اور اسلام جس حقیقت کا نام ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ کی شریعت کو ہر حال میں بلاچون وچرا قبول کیا جائے، اور دوسری تمام شریعتوں کو اور ان کی ہر شکل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے۔ اس کے سوا اسلام کا اور کوئی مفہوم نہیں ہو سکتا۔ جس کو اس ابتدائی اسلام سے رغبت اور وابستگی ہو گی اس کا آخری فیصلہ بھی ظاہر ہے کہ شریعت کے حق میں ہی ہو گا، مگر اس کے بعد وہ اس بات کا محتاج نہیں رہے گا کہ اسلامی نظام کی آن بان، اس کے حُسن و جمال اور اس کی افضلیت و برتری کی تفصیلات سُنا سُنا کر اُس کو ترغیب دی جائے اور جذبۂ شوق اُبھارا

جائے ــــــــــ یہ ہے ایمان کے بدیہی حقائق میں سے ایک اہم اور بنیادی حقیقت !

اسلام نے جاہلیت کا مقابلہ کیسے کیا

ان تفصیلات کے بعد اب ہم یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن حکیم نے مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں عقیدہ اور ایمان کے مسئلہ کو کس طرح حل کیا ؟ ۔ قرآن نے عقیدہ کو مجرد نظریہ (Theory) کی صورت میں ، یا الالہیات کے روپ میں نہیں پیش کیا ۔ اور نہ اس کے بیان میں وہ انداز اختیار کیا ہے جو ہمارے علم الکلام نے کلامی بحثوں کے باب میں اختیار کیا ہے ۔ اس کے برعکس قرآن ہمیشہ انسان کی فطرت کو اپیل کرتا ہے ، اور ان چیزوں سے اپنے دلائل اور اشارات اخذ کرتا ہے جو خود انسان کے اپنے نفس میں اور اردگرد کے ماحول میں پائے جاتے ہیں ۔ وہ انسان کی فطرت کو اوہام و خرافات کے انباروں کے نیچے سے نکالتا ہے اور ادراک کی اس فطری صلاحیت کو جِلا بخشتا ہے جو زنگ آلود ہو چکی تھی اور بیکار ہو چکی تھی ۔ اسی طرح قرآن انسانی فطرت کے دریچوں کو وا کرتا ہے ، اور اس کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ اس کے مؤثر اور لطیف اشارات کو سمجھ سکے اور انہیں قبول کر سکے ۔

یہ تو قرآن کی تعلیمات کا ایک عام پہلو تھا ۔ اس کی انقلابی تعلیمات کا خاص پہلو یہ تھا کہ اُس نے توحید کی بنیاد پر سوسائٹی کے اندر ایک عملی جنگ چھیڑ رکھی تھی ، اور اُن جاہلی نظریات و روایات کے خلاف معرکہ آرائی کر رکھی تھی جن کے ملبے کے نیچے انسانیت مدفون تھی ، اور فطرتِ انسان معطل اور اپاہج ۔ لہٰذا ان

مخصوص حالات کے مقابلہ کے لیے اسلام کے لیے یہ شکل مناسب نہ تھی کہ اُسے ایک "نظریہ" کے طور پر پیش کیا جاتا۔ بلکہ یہی مناسب صورت تھی کہ وہ عملی مقابلہ کا عزم لے کر میدانِ کارزار میں اُترے، اور انسان کے دل و دماغ پر جو فکری اور عملی پردے پڑے ہوتے تھے اُن کو چاک کرے، اور اُن تمام چٹانوں کو پاش پاش کرے اور ان تمام دیواروں کو رستے سے ہٹائے جو انسان کے حق تک رسائی حاصل کرنے میں حائل کر دی گئی تھیں۔ اسی طرح عقلی مجادلہ کا اسلوب بھی، جو قرونِ مابعد میں علم الکلام کا طریقہ رہا ہے اور جس کا سارا دارومدار لفظی منطق پر تھا، اسلام کو پیش کرنے کی مناسب صورت نہ تھی۔ اس لیے کہ قرآن تو پورے انسانی ماحول اور اُس کے متحرک اسباب و عوامل سے زور آزما تھا اور پوری انسانیت سے ہمکلام تھا جو بگاڑ کے بے کراں سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس مقصد کے لیے "الٰہیات" کا اندازِ بیان بھی اُس کے لیے مفید نہ تھا۔ اس لیے کہ اسلامی عقیدہ اگرچہ وجدان سے تعلق رکھتا ہے مگر وہ درحقیقت عملی زندگی کا ایک لائحہ پیش کرتا ہے، اور عمل کی دنیا میں اُس کا نفاذ کرتا ہے۔ الٰہیات کی نظری بحثوں اور ذہنی خیال آرائیوں کی طرح وہ زندگی کے محدود اور تنگ دائرے میں محصور نہیں رہتا۔

قرآن ایک طرف اسلامی جماعت کے دلوں میں عقیدہ کی عمارت چنتا ہے، اور دوسری طرف ساتھ ہی اس جماعت کو لے کر اردگرد کے جاہلی قلعوں پر قوت کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے، اور خود اسلامی جماعت کے افکار و اعمال اور اخلاق و

معاملات کے اندر بھی جو جاہلی اثرات اُسے نظر آتے اُن کے خلاف بھی بھرپور جنگ لڑتا ہے۔ چنانچہ اِنہی بلاخیز حالات و عوامل کے منجدھار میں اسلامی عقیدہ کی تعمیر ہوئی، لیکن "نظریہ" یا "الٰہیات" کی شکل میں نہیں اور نہ "کلامی جدلیات" کے لباس میں، بلکہ زندگی سے بھرپور، فعّال اور نامی (Organic) تحریک کی شکل میں جس کا مظہر قرآن کی تیار کردہ مذکورہ جماعت اسلامی تھی۔ اس جماعت کا پورا ارتقاء افکار کے لحاظ سے، اخلاق و کردار کے لحاظ سے اور تربیّت و تعلیم کے لحاظ سے اسلام کے تحریکی تصوّر کے تحت ہوا۔ اُسے جو تربیّت ملی اُس میں یہ روح کارفرما تھی کہ یہ جماعت دراصل ایک ایسا منظم اور معرکہ آرا لشکر ہے جسے جاہلیت سے نبرد آزما ہونا ہے۔ چنانچہ اس تحریک کا ارتقاء خود عقیدہ و فکر کے ارتقاء کی عملی تفسیر تھا ——— یہ ہے اسلام کا صحیح طریقِ کار جو اسلام کی فطرت اور روح کا صحیح عکّاس ہے۔

اِسلام نظری نہیں بلکہ عملی دین ہے

دعوت اسلامی کے علمبرداروں کو دین کے مزاج اور اس کے تحریکی طریقِ کار کا یہ پہلو جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے، اچھی طرح ذہن نشین رکھنا چاہیئے۔ اس پہلو پر غور کرنے سے انہیں معلوم ہوگا کہ عقیدہ کی تعمیر و تشکیل کا وہ طویل مرحلہ جو مکّہ کی زندگی میں گزرا ایسا نہیں ہے کہ اس میں اسلام کو صرف نظریاتی طور پر سیکھنے سکھانے پر ہی اکتفاء کیا گیا ہو۔ درحقیقت تعمیر عقیدہ کا مرحلہ اور وہ مرحلہ جس میں

اسلامی تحریک کی عملاً تنظیم کی گئی، اور اسلامی جماعت کی بالفعل داغ بیل ڈالی گئی وہ جُدا گانہ اور ایک دوسرے سے منفک مرحلے نہیں تھے۔ بلکہ یہ دونوں ایک ہی مرحلہ تھے، جس میں بیک وقت عقیدہ کی تخم ریزی بھی کی گئی، اسلامی تحریک اور اسلامی جماعت کا قیام بھی عمل میں لایا گیا، اور اسلام کے عملی وجود کا ڈھانچہ بھی تیار کیا گیا۔ اس لیے آئندہ جب کبھی احیائے اسلام کی کوشش کی جائے تو اِسی جامع طریقہ کو اختیار کیا جانا چاہیئے۔

مناسب یہی ہے کہ تعمیر عقیدہ کا مرحلہ دراز تر ہو۔ تعمیر کا کام کشاں کشاں شرمندۂ تکمیل ہو۔ ہر قدم گہرائی اور استحکام کا آئینہ دار ہو۔ اِس مرحلے کو عقیدہ کی کھوکھلی نظری بحثوں کی نذر نہ کیا جائے۔ بلکہ اس مرحلہ میں عقیدہ ایک ایسی زندہ حقیقت بن کر دیدہ نواز ہو جو (اپنی فطری ترتیب کے ساتھ) عقیدہ میں ڈھلے ہوئے دلوں کی شکل میں ہو، ایسے متحرک جماعتی نظام کی شکل میں ہو جس کا داخلی اور خارجی ارتقاء خود عقیدہ کے ارتقاء کا مظہر ہو، ایسی عملی تحریک کی شکل میں ہو جو جاہلیت کو میدانِ عمل میں اُتر کر للکار رہی ہو اور نہ صرف فکر و نظر کے محاذ پر بلکہ عمل و کردار کے محاذ پر بھی اُس سے گرم پیکار ہو۔ تاکہ یہ عقیدہ پیکر محسوس میں تبدیل ہو جائے اور اس کشمکش کے اندر رہ کر نشو و نما حاصل کرے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ بات اس کے نزدیک انتہائی غلط ہی نہیں، انتہائی خطرناک بھی ہے کہ عقیدہ اسلامی کھوکھلے نظریہ کی شکل میں ارتقاء پذیر ہو،

اور محض نظری بحث وتمحیص اور مجرّد فکری تحقیق وجستجو کے میدان میں محدود ہے۔
قرآن کریم نے مکّی دور میں عقیدہ کی تعمیر واستحکام پر پورے ۱۳ سال اس وجہ سے نہیں صرف کیے تھے، کہ وہ یکبارگی نازل ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہتا تو پورا قرآن یکبارگی نازل کر دیتا، اور پھر اس کے ماننے والوں کو کم وبیش ۱۳ برس تک کچھ نہ کہتا، یہاں تک کہ وہ اس عرصہ میں " اسلامی نظریہ" پر علمی اور نظری دونوں لحاظ سے عبور حاصل کر لیتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ اختیار نہیں فرمایا۔ اُسے کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ دنیا کے اندر ایک لاثانی نظام زندگی کو جاری وساری کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں عقیدہ کی تعمیر، اس کی علمبردار تحریک کی تاسیس، اور اُس کے نمائندہ معاشرے کی تنظیم بروئے کار لانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عقیدہ کی قوّت سے تحریک اور جماعت برپا ہو، اور تحریک اور جماعت کے سیلِ رواں سے عقیدہ فروغ پذیر ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ عقیدہ، جماعت کی متحرک اور عملی زندگی سے عبارت ہو، اور جماعت کی حرکت وگرمی عقیدہ کی آئینہ داری کرے، اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ انسانوں کی اصلاح، اور معاشرے کی صحت مندانہ تشکیل ایسا کام نہیں ہے کہ راتوں رات ہو جائے۔ اس لیے کہ عقیدہ کی تعمیر وفروغ میں اتنی ہی مدّت لازماً صرف ہوتی ہے جتنی مدّت کسی فرد کی اصلاح اور جماعت کی تشکیل وتنظیم کے لیے درکار ہوتی ہے۔ کہ اِدھر عقیدہ کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہنچے، اور اُدھر ایک ایسی مضبوط جماعت منصۂ شہود

پر آجائے جو اس کا مظہرِ حقیقی اور عملی تفسیر ہو۔

اس دین کا یہی مزاج ہے۔ قرآن کریم کے مکّی دَور سے بھی اس کے اس مزاج کا ثبوت ملتا ہے۔ ہمیں دین کا مزاج شناس ہونا چاہیئے، اور اپنی بے تاب خواہشات اور بے بضاعت انسانی نظریات سے ہزیمت خوردہ احساسات کی رَو میں بہ کر دین کے مزاج میں تغیّر و تبدّل کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ دین اپنے اسی مخصوص مزاج کے کرشموں سے پہلے بھی "امّتِ مسلمہ" کے نام سے ایک عظیم امّت کی تخلیق کا کارنامہ سرانجام دے چکا ہے، اور آئندہ بھی جب کبھی "امّتِ مسلمہ" کو دنیا میں دوبارہ کھڑا کرنے کا ارادہ کیا جائے گا تو دین کے اسی مزاج اور طریقِ کار کی روشنی میں اُسے تیار کیا جا سکے گا۔ ہمیں یہ بخوبی سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسی ہر کوشش غلط ہے اور خطرناک بھی، جس کا مقصد یہ ہو کہ اِسلام کے زندہ و تابندہ عقیدہ کو جسے ایک حرکت پذیر توانا اور جیتے جاگتے معاشرے کے رگ و پے میں سرایت کرنا چاہیئے، اور ایک منظّم تحریک کے قالب میں جلوہ ریز ہونا چاہیئے، اُسے اپنے اس فطری عمل سے محروم کر کے مجرّد نظریاتی درس و تدریس اور علمی بحث و مطالعہ کی آماجگاہ بنا دیا جائے۔ تاکہ ہم بے بضاعت اور ہیچ و ناکارہ انسانی نظریات کے مقابلے میں "اِسلامی نظریہ" کی طاقت اور برتری ثابت کر سکیں۔ اِسلامی عقیدہ کا تقاضا تو یہ ہے کہ چلتے پھرتے انسان اُس کا مظہر و نمونہ ہوں، وہ ایک ٹھوس

انسانی تنظیم اور فعال تحریک کا لائحۂ عمل ہو، اور ایک ایسی تحریک کا رُوپ دھار لے جو اِرد گرد کی جاہلیّت سے بھی دست و گریباں ہو، اور اپنے نام لیواؤں کے اندر بھی جاہلیّت کے باقی ماندہ اثرات سے برسرِ پیکار ہو۔ اس لیے کہ اس عقیدہ کو حرزِ جاں بنانے سے پہلے وہ بھی تو اسی جاہلیّت کا ایک جز تھے اور بچے کھچے جاہلی اثرات کا اُن میں پایا جانا عین ممکن ہے۔ اسلامی عقیدہ اپنی اس ماہیّت کے لحاظ سے قلوب و اذہان کا اس قدر وسیع و عریض رقبہ گھیر لیتا ہے جو اُس رقبہ سے کہیں زیادہ وسیع و طویل ہوتا ہے جو نظریاتی بحثوں کے دائرے میں آتا ہے۔ لیکن وہ صرف قلوب و اذہان کو اپنی جولانگاہ بنانے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اعمال و کردار کی لامحدود پہنائیوں پر بھی چھا جاتا ہے۔ الوہیّت، کائنات، زندگی اور انسان یہ وہ مباحث ہیں جن کے بارے میں اسلام کا تصوّر نہایت جامع، ہمہ گیر اور کامل ہی نہیں حقیقت پسندانہ اور ایجابی بھی ہے۔ اسلام اپنے مزاج اور فطرت کی بنا پر یہ گوارا نہیں کرتا کہ وہ نرے عقلی اور علمی تصوّر کا تجریدی ڈھانچہ بن کر رہ جائے۔ یہ اُس کی فطرت کے بھی منافی ہے اور اس کی غایت اور نصب العین کے بھی خلاف ہے۔ اُسے جو بات پسند ہے وہ یہ ہے کہ وہ زندہ انسانوں کے پیرائے میں نمودار ہو، ایک زندہ تنظیم اُس کی نمائندہ اور ایک عملی تحریک اُس کی عملی تفسیر ہو۔ اس کا طریقۂ ارتقاء بھی نرالا ہے۔ یہ چلتے پھرتے افراد، سیماب آسا تنظیم اور فعال تحریک کے اندر

سے کھیتی کی طرح اُگتا اور نشو و نما پاتا ہوا اُس مرحلۂ پختگی تک پہنچ جاتا ہے جہاں نظری لحاظ سے بھی، اور عمل و واقع کے لحاظ سے بھی اس کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اپنے دورِ نمو میں وہ کبھی مجرّد نظریہ کی حیثیت سے زندگی کے عملی مسائل سے الگ تھلگ نہیں رہتا بلکہ واقع اور عمل اور حرکت کے جلو میں تمام مراحل طے کرتا ہے۔ رہا یہ طریقہ کہ پہلے اسلامی تصوّر کی نظری اور تجریدی حیثیت سے پخت و پز کر لی جائے اور بعد میں اِسے تحریک و عمل کی دنیا میں پروان چڑھایا جائے تو نشو و نما کا ایسا طریقہ اس دین کی فطرت، اس کے نصب العین، اس کی مخصوص ترکیب عنصری ہر لحاظ سے نامناسب بھی ہے، خطرناک اور نقصان دہ بھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَى مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا۔ (بنی اسرائیل: ۶)

اور اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم ٹھیر ٹھیر کر اسے لوگوں کو سناؤ، اور اسے ہم نے (موقع موقع سے) بتدریج اُتارا ہے۔

اس ارشاد کی رُو سے اسلام میں دونوں پہلو قصداً بیک وقت اختیار فرمائے گئے ہیں: قرآن کی رفتہ رفتہ تنزیل! اور پھر اسے لوگوں کو ٹھیر ٹھیر کر سنانا، یہ طریقہ اس لیے اختیار فرمایا گیا تاکہ عقیدہ کی بنیادوں پر تعمیر ہونے والا انتظام ایک

زندہ اور فعّال تنظیم کے پیکر میں نمودار ہو کر پایۂ تکمیل کو پہنچے، نہ کہ نظریہ محض کی شکل میں۔

دین کا طریقِ فکر و عمل بھی ربّانی ہے

اِس دین کے علمبرداروں کو یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ جس طرح یہ دین ربّانی نظام ہے، اِسی طرح اُس کا طریقِ کار بھی وحیٔ الٰہی پر مبنی ہے۔ دین کی اصل فطرت اور اس کے طریقِ کار دونوں میں مکمّل مناسبت اور ہم رنگی ہے۔ چنانچہ دین کو اس کے مخصوص طریقِ کار کے تحت رُوبعمل نہ لانا سعیٔ لاحاصل ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ نیز یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ کہ جس طرح یہ دین فکر و نظر کے انقلاب سے کردار و عمل کی دنیا میں انقلاب برپا کرنے کے لیے آیا ہے، اِسی طرح اِس کا مشن یہ بھی ہے کہ وہ اِس منہاجِ فکر کو بھی بدل ڈالے جو عقیدہ کی تعمیر اور عملی زندگی میں انقلاب برپا کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ دین عقیدہ کی تعمیر بھی کرتا ہے اور اُمّت کی تشکیل بھی۔ اور ساتھ ہی اپنے مخصوص نظامِ فکر کو بھی فروغ دیتا ہے، اور اُسے رائج کرنے پر اُسی درجہ قوّت صرف کرتا ہے جس درجہ عقیدہ کی تاسیس اور عمل کی تبدیلی پر کرتا ہے۔ چنانچہ اس دین کا مخصوص نظامِ فکر، اس کی مخصوص آئیڈیالوجی، اور اس کی مخصوص نوعیّت کی جاندار تحریک یہ تینوں جُدا جُدا اور الگ نہیں ہیں بلکہ بیک وقت سرانجام پاتے ہیں کیونکہ ایک ہی پھول ہے کہ جس کی یہ پنکھڑیاں ہیں۔

تشریحِ بالا سے ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ دین کا اپنا مخصوص طریقِ کار ہے۔ اب دوسرے قدم پر ہمیں یہ بھی معلوم رہنا چاہیئے کہ یہ طریقِ کار منفرد ہے، اور ابدی ہے۔ یہ طریقِ کار دعوتِ اسلامی کے کسی مخصوص مرحلے سے وابستہ نہیں ہے، نہ یہ کسی مخصوص حالات رکھنے والے کسی ماحول کے لیے اُترا ہے، نہ صرف اُن حالات کے لیے تجویز کیا گیا تھا جو اوّلیں اسلامی جماعت کے قیام کے وقت موجود تھے۔ بلکہ یہ طریقِ کار زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔ اور جب کبھی دینِ حق کا قیام و فروغ عمل میں آئے گا اِسی طریقِ کار کے نتیجے میں آئے گا۔

اِسلام کی ذمّہ داری محض اتنی نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے عقائد و اعمال میں انقلاب برپا کر دے، بلکہ یہ بھی اُس کی ذمّہ داری میں شامل ہے کہ وہ لوگوں کے طرزِ فکر اور اندازِ نظر کو بھی بدل ڈالے، اور تصوّرات اور حالات کے بارے میں اُن کے زاویۂ نگاہ میں بنیادی تبدیلی پیدا کر دے۔ چونکہ اسلام کا نظامِ فکر بھی ہدایتِ الٰہی سے ہی ماخوذ ہے اس لیے یہ اپنی فطرت و ساخت کے لحاظ سے ان تمام ناقص و بے روح اندازہائے فکر و نظر سے سراسر مختلف ہے جنہیں فانی اور کوتاہ نظر انسانوں نے تخلیق کیا ہے۔

جب ہم اسلام کو ایک نظریہ مجرّد کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ یہ صرف بحث و مطالعہ کے حلقے کی رونق بنا رہے تو اس طرح ہم اُسے اُس کے ربّانی طریقِ کار اور ربّانی طرزِ فکر دونوں سے جُدا کر دیتے

ہیں۔ اور اُسے انسانی نظامِ فکر کا تابع بنا دیتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کا تجویز کردہ طریق فکر —— معاذ اللہ —— انسانی طریق ہائے فکر سے فروتر ہے، اور ہم فکر و عمل کے خدائی نظام کو "ترقی" دے کر اُسے انسانی نظاموں کے ہم پلّہ کر دینا چاہتے ہیں —— یہ زاویۂ نگاہ انتہائی خطرناک اور مضر ہے، اور اس انداز کی ذہنی و فکری ہزیمت ملّت کے لیے سخت تباہ کُن ثابت ہوا کرتی ہے۔

نظامِ حق اُن سب اصحاب کو جو دعوتِ اسلامی کے میدان میں سرگرم عمل ہیں فکر و تدبر کے مخصوص پیمانے اور اسلوب دیتا ہے۔ جن کی بدولت وہ ان تمام پیمانوں اور اسالیب کی خرابیوں سے بچ سکتے ہیں جو جاہلیت نے دنیا بھر میں رائج کر رکھے ہیں، اور جنھوں نے خود ہماری عقلوں کو ماؤف، اور ہماری تعلیم و ثقافت کو زہر آلود کر رکھا ہے۔ اس فتنۂ عظیم کے مقابلے میں اگر ہم نے اس دین کو ایسے انداز سے سمجھنے کی کوشش کی جو اس کی فطرت کے لیے بالکل اجنبی ہے، اور جاہلیت غالبہ ہی کا ایک نتیجہ ہے، تو ہماری یہ کوشش دُہرے خسارے پر منتج ہوگی۔ ایک طرف ہم دین کو اپنے اصل وظیفہ اور عمل سے معطل کر دیں گے جسے سرانجام دینے کے لیے وہ انسانیت کے پاس آیا ہے، اور دوسری طرف ہم بحیثیت انسان اپنے آپ کو ایک ایسے سنہری موقع سے بھی محروم کر لیں گے جس میں ہم عصرِ حاضر کے جاہلی نظام سے گلو خلاصی کرا سکتے تھے، اور جاہلیت کے اُن

تمام زہریلے اثرات سے اپنے آپ کو بچا سکتے تھے جو ہمارے ذہنوں اور ہماری تربیت میں پائے جاتے ہیں۔ معاملے کا یہ پہلو بھی انتہائی خطرناک اور سنگین ہے، اور اس انداز کا خسارہ بھی انتہائی تباہ کُن ثابت ہوگا۔

اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے خود نظامِ فکر اور لائحۂ عمل کی جو اہمیت و ضرورت ہے وہ اُس اہمیت و ضرورت سے کسی پہلو کم نہیں ہے جو اسلام کے عقیدہ اور نظامِ حیات کو حاصل ہے۔ کیونکہ یہ تمام پہلو ایک دوسرے سے منفک اور جُدا جُدا نہیں ہیں۔ ہمیں یہ خیال خواہ کتنا ہی اچھا اور خوشنما معلوم ہو، اور ہم اسلام کے عقیدہ و نظام کی خوبیوں کو زبان و قلم سے چاہے کتنا ہی واضح کرتے پھریں، مگر یہ حقیقت ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیئے کہ ہماری یہ خدمت دنیا کے اندر اسلام کو کبھی ایک واقعہ اور تحریک کی صورت میں برپا نہیں کر سکتی۔ بلکہ یہ بات بھی فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ اس شکل میں اگر ہم اسلام کو پیش کرتے رہیں گے تو اس سے باہر کے لوگ نہیں، صرف وہ گروہ ہی استفادہ کر سکے گا جو بالفعل اسلامی تحریک کے لیے کام کر رہا ہے۔ اور خود یہ گروہ بھی زیادہ سے زیادہ اس سے جو استفادہ کر سکے گا وہ یہ ہے کہ اپنے تحریکی سفر میں وہ جس مرحلے تک پہنچ چکا ہے اُس مرحلے کی ضرورت و تقاضا کو اس کی مدد سے پُورا کر سکے۔ لہٰذا اس مناسبت سے میں دوبارہ یہ کہوں گا کہ اصل طریقہ یہ ہے کہ ایک طرف اسلامی عقیدہ کو بلا تاخیر عملی تحریک میں تبدیل ہو جانا چاہیئے، اور دوسری طرف یہ تحریک

بھی اُسی ساعت سے عقیدہ کی صحیح تصویر اور حقیقی ترجمان ہونی چاہیئے۔ میں مکرر کہوں گا کہ اسلام کے غلبہ کا یہی فطری طریقِ کار ہے اور یہ طریقِ کار نہ صرف خوب تر اور سیدھا اور صاف ہے، بلکہ نہایت مؤثر و دل نشین بھی ہے، اور اُن تمام طریق ہائے کار کی نسبت فطرتِ انسان سے زیادہ قریب ہے جو پہلے نظریات و افکار کی تراش خراش کر کے انہیں مجرد علمی بحثوں کے انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ مرحلہ کہ انسان ان نظریات کے بل پر کوئی عملی تحریک اُٹھائیں یا خود ان نظریات کا چلتا پھرتا نمونہ بنیں، اور ان کی رہنمائی میں منزل بہ منزل کوئی پیش قدمی کریں، ابھی بہت دور ہوتا ہے، نہ کبھی اس کے ان لوگوں کو پیش آنے کا امکان ہی کہیں موجود ہوتا ہے۔

اِسلامی نظام کے نفاذ سے پہلے اِسلامی قانون کا مطالبہ سراسر بے معنی ہے۔

یہ نقطۂ نگاہ اگر بذاتِ خود اسلام کے نظریہ و عقیدہ کے بارے میں درست ہے تو اسے اسلامی نظام کی بنیادوں اور اس کی قانونی تفصیلات کے بارے میں قدرتی طور پر بدرجۂ اولیٰ صحیح ہونا چاہیئے۔ یہ جاہلیت جو آج ہمارے گرد و پیش میں بُری طرح چھائی ہوئی ہے، جہاں یہ دعوتِ اسلامی کے بعض مخلص خادموں کے اعصاب پر اس قدر بارِ گراں بن رہی ہے کہ وہ بے صبر ہو کر اسلامی نظام کے تمام مراحل کو بعجلت عبور کر جانا چاہتے ہیں وہاں وہ انہیں ایک اور نازک

سوال سے بھی دوچار کر رہی ہے۔ وہ اُن سے بار بار یہ سوال کرتی رہتی ہے کہ اس نظام کی تفصیلات کیا ہیں جس کے تم داعی ہو؟ اُسے نافذ کرنے کی خاطر تم نے اُس پر کتنی ریسرچ کر رکھی ہے؟ کتنے مقالے اور مضامین تیار کر رکھے ہیں؟ اور فقہ کو کس حد تک جدید اصولوں پر مرتّب کر رکھا ہے؟ گویا آج لوگوں کے پاس شریعتِ اسلامی کو جاری وساری کرنے کے لیے اور کسی چیز کی کمی نہیں ہے، صرف فقہی احکام اور فقہی تحقیقات کی کمی ہے۔ وہ اللہ کی حاکمیّت کو بھی مان چکے ہیں اور اللہ کی شریعت کو حاکم بنانے پر بھی راضی ہیں۔ بس ایک ہی کسر رہ گئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ "مجتہدین" کی طرف سے ابھی تک انہیں جدید طرز پر مدوّن کی ہوئی فقہ سپلائی نہیں کی گئی ہے!! درحقیقت یہ اسلام پر ایک نہایت رکیک طنز ہے۔ اور اس پر ہر اُس شخص کو آتش پا ہو جانا چاہیئے جس کے دل میں دین کا ذرّہ بھر بھی احترام اور غیرت موجود ہے۔

جاہلیّت کے ہتھکنڈوں سے متنبّہ رہنا چاہیئے۔

جاہلیّت اس طرح کی چھیڑ خانیوں اور اشغلہ بازیوں سے صرف یہ چاہتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اُسے شریعتِ الٰہی کو ردّ کر دینے کا بہانہ مل جائے۔ اور وہ انسان پر انسان کی آقائی کے نظام کو قائم ودائم رکھ سکے۔ اُس کی یہ بھی خواہش ہے کہ اسلام کے نام لیواؤں کو اقامتِ دین کے اُس طریقِ کار سے پھیر دے جو اللہ تعالیٰ نے تجویز فرمایا ہے۔ انہیں اس اصول پر قائم نہ رہنے دے کہ فکر وعقیدہ

کی تعمیر تحریک کی شکل میں ہو۔ وہ طریقِ دعوت کا وہ مزاج ہی مسخ کر دینا چاہتی ہے جس کی رُو سے اسلامی نظریہ کی تکمیل تحریک کی طوفان خیزیوں کے منجدھار میں ہوتی ہے، نظامِ اسلامی کے خد و خال عملی کاوشوں کے ذریعہ اُجاگر ہوتے ہیں، اور قانون سازی اسلامی زندگی کے عملی مسائل اور حقیقی مشکلات کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہے، لیکن داعیانِ حق کو جاہلیت کی اس فسوں کاری پر دھیان نہ دینا چاہیئے۔ بلکہ انہیں جرأت کے ساتھ ہر ایسے طریقِ کار کو ٹھکرا دینا چاہیئے جو ان کی تحریک اور ان کے دین پر جاہلیت کی طرف سے ٹھونسا جا رہا ہو۔ داعیانِ حق کو موم کی ناک نہ بننا چاہیئے کہ مخالفِ دین عنصر انہیں جس طرح چاہے توڑتا مروڑتا رہے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ جاہلیت کی تمام چال بازیوں کا بھانڈا پھوڑیں، اور ان کا اچھی طرح قلع قمع کریں۔ خاص کر اس مسخرہ پن کی پوری قوت سے تردید کریں جو "فقہ اسلامی کی تجدید" کے پردے میں ایک ایسے معاشرے کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے جو نہ قانونِ خداوندی کی برتری کو تسلیم کرتا ہے اور نہ غیر الٰہی قوانین سے اظہارِ بیزاری کرتا ہے۔ اس طرح کی باتیں درحقیقت سنجیدہ اور ٹھوس اور مثمر کام سے غافل کرنے کے لیے کی جاتی ہیں۔ اور اس لیے کی جاتی ہیں کہ اسلام کے چاہنے والے محض ہوا میں تخم ریزی کر کے اپنا وقت ضائع کرتے رہیں۔ چنانچہ ان کا فرض ہے کہ وہ اس طرح کے ناپاک ہتھکنڈوں کا پردہ چاک کریں، اور انہیں کامیاب نہ ہونے دیں۔ اس دین نے تحریک کا جو طریقِ کار پیش کیا ہے اُسی کے

مطابق ہی اقامتِ دین کی جدّ و جہد کرنی چاہیئے ۔ اسی طریقِ کار کے اندر دین کی طاقت کا راز مضمر ہے اور یہی ان کی اپنی طاقت و شوکت کا منبع بھی ہے ۔

اسلام اور احیائے اسلام کا طریقِ کار دونوں مساوی اہمیّت کے حامل ہیں ۔ دونوں میں دوئی نہیں ہے ۔ کوئی اور طریقِ کار خواہ وہ کیسا ہی جاذبِ نظر ہو اسلامی نظام کو کبھی غالب نہیں کر سکتا ۔ انسانوں کے وضع کردہ نظام تو باہر سے درآمد کردہ طریقِ کار سے قائم و برپا ہو سکتے ہیں ۔ لیکن ہمارے نظام کو بروئے کار لانے سے وہ قاصر ہیں ۔ لہٰذا اسلامی تحریک کے لیے اقامتِ دین کے مخصوص طریقِ کار کی پابندی اتنی ہی لازم ہے جتنی خود اسلام کے بنیادی عقیدہ اور اس کے نظامِ حیات کی پابندی اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ (یہ قرآن اُس راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا اور صاف ہے)

بابِ سوم

اِسلامی معاشرے کی خصوصیات
اور
اس کی تعمیر کا صحیح طریقہ

انبیاء کی اصل دعوت

دعوتِ اسلامی کا وہ دَور جس کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک نے ڈالی اُس دعوت الی اللہ کے طویل سلسلہ کی آخری کڑی ہے جو انبیائے کرام کی قیادت میں ازل سے جاری رہا ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں اس دعوت کا ایک ہی مقصد اور نصب العین رہا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسانوں کو ان کے خدائے واحد اور حقیقی پروردگار سے آشنا کرایا جائے، انہیں ربِ واحد کی غلامی میں داخل کیا جائے، اور دنیا کے اندر انسان کی ربوبیت کی بساط لپیٹی جائے۔ ان

معدودے چند افراد کے سوا جو گاہے بگاہے تاریخ میں پائے جاتے رہے ہیں انسان بحیثیّت مجموعی کبھی الوہیّت کے نظریہ کے منکر نہیں رہے ہیں، اور نہ انہوں نے مطلقاً اللہ کی ہستی کا انکار کیا ہے۔ بلکہ یا تو وہ اپنے حقیقی رب کی صحیح معرفت میں غلطی کرتے رہے ہیں اور یا اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی الوہیت میں شریک ٹھیراتے رہے ہیں، کبھی عقیدہ و عبادت میں، اور کبھی غیر اللہ کی حاکمیّت اور اتّباع اختیار کرنے کی صورت میں۔ یہ دونوں شکلیں اس اعتبار سے خالصۃً شرک ہیں کہ وہ انسانوں کو اللہ کے دین سے دُور لے جانے والی تھیں جسے وہ ہر نبی اور رسول کی زبان سے سمجھتے آئے تھے۔ مگر طویل مدّت گزر جانے کے بعد اُس کو بھُول جاتے تھے اور آخر کار اسی جاہلیّت کی طرف لوٹ جاتے تھے جس سے اللہ نے ان کو اپنے فضل سے نکالا تھا۔ وہ دوبارہ شرک کی راہ پر چل پڑتے: کبھی عقیدہ اور عبادت غیر اللہ کی حد تک، اور کبھی دوسروں کی حاکمیت تسلیم کرنے اور ان کی پیروی کرنے کی حد تک، اور کبھی بیک وقت ان دونوں صورتوں میں مبتلا ہو کر۔

کائنات کے اندر انسان کی اصل حیثیّت

انسانی تاریخ کے ہر دَور میں دعوت الی اللہ کا ایک ہی مزاج رہا ہے۔ اس دعوت کا نصب العین "اسلام" ہے۔ جس کے معنی ہیں: انسانوں کو ان کے پروردگار کا مطیع و فرمانبردار بنانا، انہیں بندوں کی غلامی سے نجات دلا کر خدائے واحد کا غلام بنانا، انہیں انسانوں کی حاکمیت، انسانوں کے وضع کردہ شرائع، انسانوں کی خود ساختہ اقدارِ حیات اور روایات کے پنجے سے نکال کر زندگی کے

ہر شعبے میں انہیں خدائے واحد کے اقتدار و حاکمیت ، اور اس کے قانون کا پیرو بنانا انبیائے سابقین اسی مشن کو لے کر آتے تھے ، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی جس اسلام کو لے کر مبعوث ہوئے ہیں اُس کا پیغام یہی ہے ۔ وہ انسان کو اُسی طرح اللہ کی حاکمیت کے آگے سرافگندہ کرنے کے لیے آیا ہے جس طرح یہ پوری کائنات اُس کی حاکمیت کے آگے سرنگوں ہے ، انسان اسی کائنات کا ایک حقیر جز ہے ، لہٰذا جو "قوت" انسان کے طبعی وجود کی تدبیر کرتی ہے ضروری ہے کہ وہی "قوت" اس کی تشریعی زندگی کی مدبر اور کارفرما ہو اور جو نظام اور اقتدار اور اسکیم اس پوری کائنات پر متصرف ہے بلکہ خود انسان کے غیر ارادی پہلوؤں پر بھی متصرف ہے انسان اس سے ہٹ کر اپنے لیے الگ کوئی نظام ، کوئی اقتدار ، اور کوئی اسکیم تجویز نہ کرے ۔ انسان اپنی نشوونما ، اپنی صحت و بیماری اور موت و حیات کے معاملے میں ان طبعی قوانین کے پابند ہیں جو اللہ تعالےٰ نے جاری فرما رکھے ہیں ۔ بلکہ اپنی ارادی تگ و دو کے جن نتائج و عواقب سے دوچار ہوتے ہیں ، اُن کے بارے میں بھی وہ کائناتی قوانین کے سامنے بے بس ہیں ۔ ان تمام پہلوؤں میں وہ اللہ کی سنّت کو بدلنے پر قادر نہیں ہیں اور نہ اس بات پر قادر ہیں کہ وہ اس کائنات پر حاوی و متصرف نوامیس میں کسی قسم کا تغیّر و تبدل کر سکیں ۔ پس انسان کے لیے یہی رویّہ مناسب ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تشریعی اور ارادی گوشوں میں بھی اسلام کی اتّباع کرے ، اور زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملے سے لے کر بڑے سے بڑے معاملے تک اللہ کی شریعت کو حاکم بنائے ۔ تاکہ ایک طرف اس کی زندگی کے غیر ارادی گوشوں اور

اختیاری پہلوؤں کے درمیان ہم آہنگی اور توافق پیدا ہو سکے، اور دوسری طرف زندگی کے ان دونوں حصّوں اور وسیع تر کائنات کے درمیان بھی مطابقت اور یک جہتی پیدا ہو۔[1]

جاہلیت کی ہمہ گیر گرفت سے نجات پانے کا صحیح طریقہ

لیکن جاہلیت جس کا خمیر ہی اس مادّۂ فاسد سے تیار ہوتا ہے کہ انسان پر انسان کی حاکمیت قائم ہو، اور جو انسان کو کائنات کے ہمہ گیر نظام سے جُدا کرتی ہے، اور انسانی زندگی کے ارادی اور تکوینی حصّے کو اختیاری اور تشریعی حصّہ سے متصادم کرتی ہے ——— وہی جاہلیت، جس کے مقابلے میں انبیاء اور رسولوں نے اسلامی دعوت کو پیش کیا ——— اور ——— نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلّم اُسی کے استیصال کے لیے دنیا میں تشریف لائے ——— یہ جاہلیت کسی تجریدی نظریہ کے قالب میں موجود نہیں رہی، بعض حالات میں تو اس کا سرے سے کوئی "نظریہ" ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ہمیشہ جیتی جاگتی تحریک کے روپ میں اُبھرتی رہی ہے، ایک ایسے معاشرے کی شکل میں نمودار ہوتی رہی ہے جس کی اپنی لیڈرشپ، اپنے تصورات و اقدار، اپنی روایات و عادات اور اپنے جذبات و احساسات ہوتے ہیں۔

---

[1] اس نکتے کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو: "دینیات" تالیف مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی، پاکستان۔ مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور (مصنف)

وہ ایک منظم معاشرہ ہوتا ہے ، اس کے افراد کے درمیان باہمی ربط وتعاون، اور منظم توافق و وفاداری اس درجہ پائی جاتی ہے کہ پُورا معاشرہ شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے وجود کی حفاظت کے لیے یکساں طور پر متحرک اور چاق وچو بند رہتا ہے ۔ اپنی شخصیت کے دفاع میں وہ ایسے تمام خطرانگیز عناصر اثرات کے ازالہ میں سرگرم رہتا ہے ، جو اس کے مستقل نظام کے لیے کسی بھی حیثیت سے خطرے کی تمہید ہوتے ہیں۔

جب جاہلیّت محض علمی نظریے کی شکل میں نہیں بلکہ ایک زندہ و فعّال تحریک اور جیتا جاگتا معاشرہ بن کر سامنے آتی ہے تو اس جاہلیّت کو مٹانے اور انسانوں کو از سرِ نو خداوند قدوس کے آستاں پر لانے کے لیے ہر وہ کوشش غیر مناسب اور بے سُود ہو گی جو اسلام کو محض علمی نظریہ کی حد تک پیش کرنے پر اکتفاء کرتی ہو۔ جاہلیّت عملی دنیا پر قابض ہے اور اس کی پُشت پر ایک زندہ و متحرّک ادارہ موجود ہے ۔ ایسی حالت میں نظری کوشش جاہلیّت کے مقابلے کے لیے فائق تر تو کجا مساوی جواب بھی نہیں ہے ۔ جب مقصد یہ ہو کہ ایک بالفعل قائم نظام کو ختم کر کے اُس کی جگہ ایک ایسے نظام کو برپا کرنا ہے جو اپنے مزاج ، اپنے اصول حیات اور ہر کلّی و جزئی معاملے میں موجودہ غالب جاہلی نظام سے اختلاف رکھتا ہے تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ نیا نظام بھی ایک منظم تحریک اور جان دار معاشرہ بن کر میدانِ مبارزت میں اُترے ۔ اور اس عزم کے ساتھ اُترے کہ اُس کی نظریاتی بنیادیں ، اس کی انتظامی تدابیر اور نظم اجتماعی، اس کے کارکنوں کے باہمی روابط و تعلّقات قائم شدہ جاہلی نظام سے ہر ہر پہلو

میں قوی تر اور محکم تر ہوں۔

اسلامی معاشرہ کی نظریاتی بنیاد

وہ نظریاتی بنیاد جس پر اسلام نے تاریخ کے ہر دَور میں اپنے معاشرے کی تعمیر کی ہے وہ یہ شہادت ہے کہ: لا الٰہ الا اللہ ——— اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے ——— اس شہادت کا مطلب یہ ہے کہ اِلٰہ صرف اللہ ہے، وہی رب ہے، وہی منتظِم کائنات ہے، وہی حاکم حقیقی اور مقتدر اعلیٰ ہے۔ قلب وضمیر اُس کی وحدانیت سے منوّر ہونے چاہئیں، عبادات وشعائر میں اُسی کی وحدانیت کا ثبوت پیش کرنا چاہیئے، عملی زندگی کے قانون میں اُسی کی وحدانیت کا تصوّر کارفرما ہونا چاہیئے، اس کامل اور ہمہ گیر صورت کے علاوہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت عملی لحاظ سے کسی اور طرح نہیں دی جاسکتی، اور نہ شرعی لحاظ سے ہی ایسی شہادت معتبر ہوگی۔ یہ کامل وہمہ گیر صورت اس قولی شہادت کو ایسے عملی اور مؤثر نظام کا پیرایہ دے دیتی ہے کہ اس کی بنیاد پر اس کے قائل کو مسلم اور منکر کو غیر مسلم قرار دیا جاسکتا ہے۔ نظری لحاظ سے اس بنیاد کو قائم کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ انسانی زندگی پوری کی پوری اللہ کے تصرّف میں دے دی جائے۔ انسان اپنی زندگی کے کسی معاملے میں اور کسی گوشے میں اپنے آپ کوئی فیصلہ نہ کرے، بلکہ اللہ کے حکم کی جانب رجوع کرے اور اُسی کی پیروی کرے۔ اللہ کا حکم اُسے صرف ایک ذریعہ سے معلوم کرنا چاہیئے، اور وہ ذریعہ ہے اللہ کا رسول۔ کلمۂ شہادت کے دوسرے حصّے میں اسی ذریعہ کو اسلام کے رکن دوم کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ اور فرمایا

گیا ہے: "واشہد ان محمداً رسول اللہ" (اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں)۔

یہ ہے وہ نظریاتی اساس جس پر اسلام کی عمارت قائم ہوتی ہے اور جو اسلام کی اصل روح ہے۔ یہ بنیاد انسانی زندگی کا مکمل ضابطہ فراہم کرتی ہے جسے زندگی کے ہر ہر پہلو میں نافذ کیا جانا چاہیئے، اور جسے ہاتھ میں لے کر ایک مسلمان اپنی انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی کے ہر ہر مسئلہ کو حل کرتا ہے خواہ یہ مسئلہ اُسے دارالاسلام کے اندر پیش آئے یا دارالاسلام سے باہر۔ ان روابط سے متعلق ہو جو مسلم معاشرے کے ساتھ وہ قائم کرتا ہے یا ان تعلقات اور رشتوں کے بارے میں ہو جو ایک مسلم معاشرہ دوسرے غیر مسلم معاشروں کے ساتھ قائم کرتا ہے۔

جاہلی معاشرے کے اندر رہنے والے "مسلمان"

اسلام، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، جامد اور مجرد نظریہ نہیں ہے کہ جو لوگ چاہیں اسے عقیدہ کے طور پر قبول کر لیں، اور پوجا پاٹ کی حد تک اس پر عمل کر لیں، اور پھر دھڑلّے سے بالفعل قائم شدہ اور حرکت پذیر جاہلی معاشرے کے کل پُرزے بنے رہیں۔ اس طرز پر اسلام کے ماننے والوں کا پایا جانا اسلام کے "عملی وجود" کو بروئے کار نہیں لا سکتا، خواہ تعداد کے لحاظ سے وہ جمّ غفیر ہی کیوں نہ ہوں۔ اس لیے کہ "نظری مسلمان" جو جاہلی معاشرے کے اجزائے ترکیبی کا ایک جز ہوں وہ لامحالہ اس معاشرے کے تمام تنظیمی تقاضوں کو لبیک کہنے پر مجبور اور بے بس ہوں گے، اور اُن تمام اساسی ضروریات کو جو اس معاشرے کی زندگی اور حرکت اور بقاء کے لیے ناگزیر ہیں شعوری اور غیر شعوری طور پر،

طوعاً اور کرھاً، پورا کرنے کے لیے محوِ روش رہیں گے۔ بلکہ اس پر مستزاد یہ کہ اس معاشرے کے محافظ بن کر کھڑے ہوں گے، اور ان اسباب و عوامل کی سرکوبی کریں گے جو اُس کے وجود اور نظام کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ اس لیے کہ "کُل" جب یہ تمام فرائض انجام دے گا تو "جز" کو لازماً ارادی طور پر یا غیر ارادی طور پر انہی فرائض کو ادا کرنے کے لیے کل کے مطابق ہی حرکت کرنا ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں ایسے "نظری مسلمان" جس جاہلی معاشرے کی نظریاتی حیثیت سے مخالفت کر رہے ہوتے ہیں عملاً وہ اُس کو مضبوط و مستحکم کرنے میں لگے ہوتے ہیں۔ بلکہ اُس نظام کے نسبتہً جاندار خلیے (Cells) ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے لیے عناصر بقا اور اسباب حیات مہیا کرتے ہیں۔ اپنی قابلیتیں، اپنے تجربات، اور اپنی تازہ دم قوتیں اُس کی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔ تاکہ اُسے عُمر دراز اور قوت مزید حاصل ہو، حالانکہ ان کی تمام تر حرکت اور سرگرمی اِس جاہلی معاشرے کو ختم کرنے میں صرف ہونی چاہیئے تاکہ وہاں صحیح اسلامی معاشرہ قائم کیا جاسکے۔

جاہلی قیادت سے انحراف لازم ہے

اِس وجہ سے یہ بات ناگزیر ہے کہ اسلام کی نظریاتی بنیاد (عقیدۂ الوہیت) ابتداء سے ایک منظّم و فعّال جماعت کے پیکر میں نمودار ہو۔ یہ جماعت جاہلی اجتماع سے الگ تھلگ ہو جاہلیت کے متحرک و منظّم معاشرے سے جس کا نصب العین ہی "اسلام" (حاکمیتِ اللہ) کی روک تھام ہے، ہر طرح برتر اور منفرد و ممتاز ہو۔ اس نئی جماعت کا مرجع و محور جدید قیادت ہو۔ وہ قیادت جس کی باگ ڈور اوّلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تھی، اور آپؐ کے بعد ہر وہ اِسلامی

قیادت اِس ذمّہ داری کی امین ہے جو انسانوں کو صرف اللہ کی الوہیت و ربوبیت، اللہ کے اقتدار و حاکمیت، اور اللہ کے قانون و شریعت کا پابند بنانا چاہتی ہے۔ جو شخص یہ شہادت ادا کرے کہ: "اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے، اور محمد اللہ کے رسول ہیں" وہ جاہلی اجتماع سے ــــــ جسے وہ خیرباد کہہ چکا ہے ــــــ اپنی وفاداریوں کا رشتہ کاٹ دے، اور جاہلی قیادت سے بغاوت کرے، چاہے کسی بھیس میں ہو: کاہنوں، پروہتوں، جادوگروں اور قیافہ شناسوں کی مذہبی قیادت ہو، یا سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی قیادت ہو، جیسی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قریش کو حاصل تھی۔ اُسے اپنی تمام تر وفاداریاں نئی اسلامی جماعت، خداشناس نظام اور اس کی خداپرست قیادت کے ساتھ مخصوص رکھنا ہوں گی۔

جاہلی فضا میں اسلام کے احیا کی صورت

یہ فیصلہ کن اقدام اُسی لمحہ سے ہو جانا چاہیے جس لمحہ ایک شخص اسلام میں داخل ہوتا ہے، اور یہ قولی شہادت دیتا ہے کہ: "لا الٰہ الا اللہ" اور "محمد رسول اللہ"۔ مسلم معاشرہ اس انقلابی اقدام کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا۔ مسلم معاشرہ محض افراد کے دلوں میں اسلام کی نظریاتی بنیاد قائم ہو جانے سے کبھی وجود میں نہیں آ سکتا۔ خواہ ایسے زبانی نام لیواؤں اور دلی خیرخواہوں کی دنیا کے اندر کتنی بڑی بھیڑ جمع ہو جائے۔ اس معاشرہ کو برپا کرنے کے لیے شرط یہ ہے کہ اسلام کی قولی شہادت ادا کرنے والے ایک ایسی تحریک کی شکل اختیار کریں جو زندگی سے لبریز اور فعّال و منظم ہو، اس کے افراد کے اندر باہمی تعاون

اور یکجہتی ہو، ہم آہنگی اور ہمنوائی ہو، وہ جداگانہ تشخّص رکھتی ہو، اُس کے اعضاء انسانی جسم کے اعضاء وجوارح کی طرح منظّم اجتماعی حرکت کے جِلو میں اس کے وجود کا دفاع و استحکام کرتے ہوں، اس کی جڑوں کو زمین کی گہرائیوں میں اُتاریں اور اُس کی شاخوں کو افق تا افق وسیع کریں، اور اُن عوامل واسباب کا سدِّباب کریں جو اُس کے وجود اور نظام پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اُسے مٹانے کے دَرپے ہیں۔ یہ سب فرائض وہ ایک ایسی بیدار مغز، دُور اندیش، اور روشن ضمیر قیادت کی رہنمائی میں سرانجام دے سکتے ہیں، جو جاہلی قیادت سے مستقل اور جُداگانہ وجود رکھتی ہو، جو ایک طرف ان کی حرکت اور تگ ودو کی تنظیم کرے، اور اس میں یکجہتی، وحدت اور یگانگت پیدا کرے، اور دوسری طرف ان کے "اسلامی وجود" کے استحکام اور توسیع و تقویت کا انتظام بھی کرے، اور اپنے حریفِ مقابل ——— جاہلی وجود ——— کو زائل اور اس کے اثرات کو ناپید کرنے میں اُن کی رہنمائی کرے۔

یہی وہ فطری طریقِ کار ہے جس کی بدولت اسلام کا عملی وجود دنیا میں قائم ہوا تھا۔ وہ ایک نظریاتی ضابطہ کی شکل میں آیا جو اگرچہ مُجمل حیثیت میں تھا مگر پوری زندگی پر محیط تھا۔ آتے ہی اُس کی بنیاد پر ایک ٹھوس، جاندار اور متحرک جماعت وجود میں آگئی۔ جس نے نہ صرف جاہلی معاشرے سے اپنا جُداگانہ اور مستقل تشخّص قائم کیا بلکہ جاہلیت کے وجود کو بھی اُس نے چیلنج کر دیا۔ وہ ہرگز عملی وجود سے عاری حالت میں محض "خیالی نظریہ" کی صورت میں نہیں اُترا تھا۔ اور آئندہ بھی اس کا وجود ایک عملی نظام کے ذریعہ ہی منصۂ ظہور پر آسکتا ہے۔ جاہلی معاشرے کی

تہ بہ تہ ظلمتوں کے اندر اگر از سرِ نو اسلام کی شمع فروزاں کی جائے گی تو خواہ کوئی دور ہو اور کوئی ملک ہو اس کے بغیر قطعاً چارۂ کار نہ ہو گا کہ پہلے اسلام کے اس مزاج اور فطرت کو لازمی طور پر سمجھ لیا جائے کہ اس کی نشو و نما ایک تحریک اور ایک نامیاتی (organic) نظام کے بغیر ہرگز نہ ہو سکے گی۔

اسلام کا اصل نصب العین "انسانیت" کا فروغ ہے۔

اس تفصیل کے بعد یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ اسلام جب مذکورہ طریقِ کار کے مطابق عقیدۂ الوہیت کی بنیاد پر ایک مسلم اُمّت کی داغ بیل ڈالتا ہے، اور اُسے ایک وحدت پسندانہ متحرک جماعت کے سانچے میں ڈھالتا اور عقیدہ کو اس جماعت کا واحد رشتہ قرار دیتا ہے تو اس تمام جدّ و جہد سے اُس کا منتہائے مقصود درحقیقت یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کی "انسانیت" کو بیدار اور اُجاگر کرے، اُسے پروان چڑھائے، اُسے طاقت ور اور بالاتر کرے، اور انسان کے وجود میں پائے جانے والے تمام پہلوؤں پر اُسے غالب کرے۔ چنانچہ وہ اپنے جامع اور ہمہ گیر نظام کی وساطت سے اسی مقصدِ جلیل کی تکمیل کے درپے رہتا ہے، اُس کے اساسی ضابطے، اُس کی جملہ ہدایات، اُس کے تمام احکام و شرائع سب کا ھدف یہی مقصد ہوتا ہے۔

انسان اپنے بعض اوصاف و خصائل میں حیوانات بلکہ جمادات کے ساتھ اشتراک رکھتا ہے۔ چنانچہ ان اوصاف و خصائل نے "سائنٹفک جہالت" کے علمبرداروں کو کبھی تو اس وہم میں ڈال دیا کہ دوسرے حیوانات کی طرح انسان بھی ایک حیوان ہے، اور کبھی انہیں اس خام خیالی میں مبتلا کر دیا کہ انسان جمادات ہی کی ایک

قسم ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان حیوانات اور جمادات کے ساتھ بعض باتوں میں اشتراک کے باوجود کچھ ایسے خصائص بھی رکھتا ہے جو اُسے ان دونوں سے ممیز کرتے ہیں، اور اُسے ایک منفرد مخلوق کی حیثیت عطا کرتے ہیں۔ "سائنٹفک جہالت" کے علمبرداروں نے بھی بالآخر اس حقیقت کا اعتراف کرلیا ہے۔ دراصل ناقابلِ تردید حقائق نے اُن کی گردن اس طرح دبوچ لی ہے کہ وہ کائنات کے اندر انسان کی امتیازی حیثیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ مگر بایں ہمہ ان کا یہ اعتراف نہ مخلصانہ ہے اور نہ دوٹوک۔[1]

"اِنسانیت" کو فروغ دینے کے نتائج

اس مسئلے میں اسلام کے پاکیزہ نظام حیات نے جو خدمت سرانجام دی ہے اُس کے نہایت درخشاں اور محسوس نتائج برآمد ہوتے۔ اسلام نے نسل و رنگ، زبان و وطن، مادی مصلحتوں اور جغرافی حدبندیوں کی گھٹیا عصبیتوں اور کمزور رشتوں کو پامال کرکے صرف عقیدہ و دین کے رشتہ پر اسلامی معاشرہ کی بنا ڈالی۔ اس معاشرے کے اندر انسان اور حیوان کے مشترک خصائص کے بجائے صرف انسانی خصائص کو اُبھارا اُن کی آبیاری کی اور غالب و برتر کردیا۔ اس کارنامۂ عظیم کے جو درخشاں اور محسوس نتائج برآمد ہوئے اُن میں سے ایک اہم نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی معاشرہ ایک ایسا وسیع الظرف اور کھلا معاشرہ بن گیا جس میں ہر نسل، ہر قوم، ہر زبان اور ہر رنگ کے افراد داخل ہو سکتے تھے۔

---

[1] ان لوگوں میں پیش پیش جدید ڈارونزم کے داعی جولین ہکسلے ہیں۔ (مصنف)

اس میں فضول اور حیوانی خصوصیت کی حامل حد بندیوں کا نام ونشان نہ تھا۔ اس کے بحر بیکراں میں تمام انسانی نسلوں کی اعلیٰ تر صلاحیتوں اور بوقلموں قابلیتوں کی ندیاں آکر گرتی رہیں۔ اور باہم خلط ملط ہوتی رہیں۔ اور ان کے امتزاج سے ایک ایسا اعلیٰ درجہ کا مرکب تیار ہوا جس کی عمر اگرچہ نسبتًہ کم تھی مگر اُس نے دنیا کے اندر ایک ایسی خیرہ کُن اور عظیم تہذیب کو جنم دیا، جس نے اپنے دَور کی تمام انسانی صلاحیتوں اور انسانی فکر و دانش کا نچوڑ اپنے دامن میں جمع کر لیا تھا، اس کے باوجود کہ اس دَور میں مسافتیں نہایت کٹھن تھیں، اور مواصلات کے ذرائع و وسائل نہایت سُست رفتار تھے۔ اس اعلیٰ درجہ کے اسلامی معاشرہ میں عربی، فارسی، شامی، مصری، مراکشی، ترکی، چینی، ہندی، رومی، یونانی، انڈونیشی، افریقی الغرض ہر قوم اور ہر نسل کے جوہر تاباں جمع ہوئے۔ ان سب کی خصوصیات یکجا ہو گئیں اور اختلاط باہم، تعاون و توافق اور ہم آہنگی و یکجہتی کے ساتھ انہوں نے اسلامی معاشرے اور اسلامی تہذیب کی تعمیر میں حصّہ لیا اور اُسے چار چاند لگائے۔ یہ حیرت انگیز تہذیب ایک دن بھی "عربی تہذیب" نہ تھی، بلکہ خالصتًا "اسلامی تہذیب" تھی۔ یہ کبھی بھی "قومی تہذیب" نہیں رہی، بلکہ ہمیشہ "نظریاتی تہذیب" کی حیثیت سے متعارف رہی۔ ہر قوم کے افراد اس میں مساویانہ شان کے ساتھ شریک ہوئے۔ محبت اور اخلاص کے مقدس رشتوں نے انہیں باہم منسلک کر رکھا تھا، اُن کے اندر یہ احساس کُوٹ کُوٹ کر بھر دیا کہ وہ سب ایک ہی منزل کے راہی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس تہذیب کی خدمت کے لیے اپنی

انتہائی قابلیتیں صرف کیں، اپنے ممتاز نسلی خصائص کو اُجاگر کر کے اُسے تہذیب کے قدموں پر نچھاور کیا۔ اپنے شخصی تجربات، قومی خصوصیات اور حاصل تاریخ کو اُسی ایک چمن کی آبیاری اور ترقی کے لیے وقف کر دیا جس طرف وہ سب بلا ادنیٰ تفاوت منسوب تھے، جس کے اندر انہیں وہ رشتہ باہم جوڑے ہوئے تھا جس کا سرا ان کے پروردگار کے ہاتھ میں تھا۔ اور جس میں ان کی "انسانیت" بلا روک ٹوک پروان چڑھ رہی تھی ——————— یہ وہ نمایاں خوبیاں ہیں جو پوری انسانی تاریخ میں کسی اور انسانی اجتماع کو نصیب نہیں ہو سکیں۔

کیا قدیم معاشروں نے "انسانیت" کو فروغ دیا؟

قدیم انسانی تاریخ میں سب سے نامور اور مشہور ترین معاشرہ رومن امپائر سمجھا جاتا ہے۔ اس معاشرے میں بھی متعدد نسلیں جمع تھیں اور مختلف زبانوں اور متعدد رنگوں اور گوناگوں مزاج کے لوگ جمع تھے۔ لیکن ان کا اتحاد اور اجتماع "انسانی رشتہ" پر قائم نہ تھا۔ اور نہ کوئی اور اعلیٰ تر قدر مثلاً عقیدہ ان کو باہم پیوستہ رکھنے والا تھا، بلکہ ان کا یہ اجتماع طبقاتی تقسیم پر قائم تھا۔ ایک طرف "شرفا" کا طبقہ تھا اور دوسری طرف "غلاموں" کا پوری امپائر انہی دونوں طبقوں میں منقسم تھی، علاوہ ازیں نسلی امتیاز بھی اس کے خمیر میں شامل تھا۔ جس کی رُو سے رومی نسل کو سیادت و تفوق حاصل تھا اور دوسری تمام نسلیں اس کے مقابلے میں غلاموں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ لہٰذا اس معاشرے کو وہ بلندی نصیب نہ ہو سکی جس تک اسلامی معاشرہ پہنچ گیا تھا اور نتیجۃً وہ انسانیت کو ان ثمرات و برکات سے بھی بہرہ اندوز نہ کر سکا جن سے اسلامی معاشرے نے اُسے مالا مال

کیا تھا۔

کیا جدید معاشرے "انسانیت" کو فروغ دے سکتے ہیں؟

تاریخ حاضر میں بھی کئی معاشرے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر برٹش امپائر کو لیجیے۔ لیکن وہ بھی رومی معاشرے سے جو اس کا مورث اعلیٰ ہے، مختلف نہیں ہے۔ یہ قومی پیمانے پر لوٹ کھسوٹ کا ایک اجتماع ہے جس کی بنیاد انگریز قوم کی برتری اور ان نوآبادیات کی خون آشامی پر ہے جن میں برٹش امپائر کا دیو استبداد ناچ رہا ہے۔ دوسری یورپین سلطنتوں کا بھی یہی حال ہے۔ اسپین اور پرتگال کی آنجہانی سلطنتیں، فرانسیسی امپائر، ان سب کا ایک ہی ڈھنگ رہ چکا ہے۔ سب کی سب ظالمانہ نظام کی علمبردار اور پست سطح کی بادشاہتیں تھیں۔

کمیونزم نے بھی ایک نرالے طرز کا معاشرہ قائم کرنا چاہا اور ان دیواروں کو مسمار کرنے کا دعوے کیا جو رنگ و نسل، قوم و وطن اور جغرافیہ نے چن رکھی تھیں۔ لیکن اس اجتماع کی تعمیر بھی "انسان دوستی" کی ہمہ گیر نیو پر نہیں کی گئی۔ بلکہ "طبقاتی تقسیم" کو بنائے اجتماع قرار دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے کمیونسٹ معاشرہ قدیم رومی معاشرہ ہی کا دوسرا رُخ ہے۔ رومی معاشرہ طبقۂ شرفاء کو امتیاز دیتا تھا، اور کمیونسٹ معاشرہ طبقۂ عمال (پرولتاریہ) کو یہ امتیازی حیثیت دیتا ہے۔ اور اس کی تہہ میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ دوسرے تمام طبقوں کے خلاف حسد اور بغض کا جذبہ ہے۔ اس قسم کا کم ظرف اور کینہ توز معاشرہ اس کے سوا اور کوئی پھل نہیں دے سکتا کہ وہ انسان کے ادنیٰ جذبات کو بھڑکائے۔ وہ

اپنی داغ بیل ہی اس بات پر ڈالتا ہے کہ انسان کے اندر صرف حیوانی اور سفلی اوصاف کو برانگیختہ کرے اور ان کو خوب پالے پوسے، اور ان کو زیادہ سے زیادہ طاقت ور بنائے۔ اس لیے کہ اس کی نگاہ میں انسان کے بنیادی مطالبات وہی کچھ ہیں جو حیوان کے بنیادی تقاضے اور ضرورتیں ہیں۔ یعنی غذا، مکان اور جنسی تسکین۔ چنانچہ اس کے فلسفہ کی رُو سے پوری انسانی تاریخ روٹی کی تلاش میں سرگرداں رہی ہے۔

اس میدان میں اسلام یکتا اور منفرد ہے

صرف اسلام ہی وہ ربانی نظامِ حیات ہے جو انسان کی اعلیٰ ترین خصوصیات کو اوپر ابھار کر لاتا ہے، اور پھر انہیں پوری طرح پرورش کرتا ہے، اور انسانی معاشرے کی تعمیر کے لیے انہیں زیادہ سے زیادہ فروغ دیتا ہے۔ اسلام آج تک اس میدان میں یکتا اور منفرد چلا آ رہا ہے۔ جو لوگ اس نظام سے منحرف ہو کر کسی اور نظام کے خواہاں ہیں، خواہ وہ نظام قوم پرستی کی بنیاد پر ہو یا وطنیت کی بنیاد پر، رنگ و نسل کو اہمیت دیتا ہو یا طبقاتی کشمکش کا علمبردار ہو یا ان جیسے اور فاسد نظریات کے خمیر سے تیار ہوا ہو وہ لوگ بلاشبہ انسان کے دشمن ہیں۔ وہ دراصل یہ نہیں چاہتے کہ انسان اس صفحۂ ہستی پر اپنی ان بلند تر خصوصیات کے ساتھ نمودار ہو جو اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں سمو رکھی ہیں، اور نہ یہ پسند کرتے ہیں کہ انسانی سوسائٹی تمام انسانی نسلوں کی ہمہ گیر صلاحیتوں اور خوبیوں سے اور ان کے صدیوں کے تجربات سے استفادہ کرے، اور اس غرض کے لیے کوئی مخلوط اور متناسب نظام تجویز کرے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًاؕ اَلَّذِيْنَ
ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ
اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ
لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ
بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ۝

(کہف۔)

اے محمد ان سے کہو، کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد راہ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ اس لیے اُن کے سارے اعمال ضائع ہو گئے۔ قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے۔ ان کی جزا جہنّم ہے اُس کفر کے بدلے جو انہوں نے کیا اور اُس مذاق کی پاداش میں جو وہ میری آیات اور میرے رسولوں کے ساتھ کرتے رہے۔

باب چہارم

جہاد فی سبیل اللہ

تحریک جہاد کے مراحل

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے:
———— بعثت سے لے کر وصال تک کفار و منافقین کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ کیسا رہا؟ ———— اس باب میں امام موصوف نے درحقیقت اسلامی جہاد کی تحریک کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر جو وحی نازل فرمائی، وہ یہ تھی:" اقرأ باسم ربك الذی خلق ......" یہ آغاز نبوت تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا کہ آپؐ اس وحی کو دل میں پڑھا کریں۔ ابھی تک اس کی تبلیغ کا حکم نہیں دیا۔ پھر اللہ نے یہ نازل فرمایا کہ "یا ایھا

المدثر، قم فانذر" اس طرح "اقراء" کی وحی سے اللہ نے آپ کو نبوّت عطا فرمائی، اور "یاایھا المدثر" کے ارشاد سے آپ کو رسالت کا منصب دیا۔ بعد میں آپ کو حکم دیا کہ آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیں۔ چنانچہ آنجناب نے پہلے اپنی قوم کو ڈرایا، پھر آس پاس کے عربوں کو ڈرایا۔ اور پھر آگے بڑھ کر تمام عربوں کو ڈرایا۔ اور پھر بالآخر آپ نے تمام اہلِ جہان کو ڈرایا۔ چنانچہ آپ اپنی بعثت کے بعد تقریباً ۱۳ سال تک دعوت و تبلیغ کے ذریعہ لوگوں کو اللہ کا خوف دلاتے رہے۔ اس عرصہ میں نہ جنگ کی اور نہ جزیہ لیا۔ بلکہ آپ کو یہی حکم ملتا رہا کہ ہاتھ روکے رکھیں، صبر سے کام لیں اور عفو و درگزر کو شعار بنائیں۔ پھر آپ کو ہجرت کا حکم ملا۔ اور قتال کی بھی اجازت دی گئی۔ پھر یہ حکم ملا کہ جو لوگ آپ سے جنگ کریں آپ اُن سے جنگ کریں۔ اور ان لوگوں سے ہاتھ کو روک لیں جو الگ تھلگ رہے ہیں اور آپ سے جنگ کے لیے نہیں نکلے۔ بعدازاں یہ حکم دیا کہ مشرکین سے جنگ کریں، یہاں تک کہ دین پورے کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر حکم جہاد آنے کے بعد کفار کی تین قسمیں ہو گئیں: ایک اہلِ صلح، دوسرے اہلِ حرب، اور تیسرے اہلِ ذمہ۔ جن کفار سے آپ کا معاہدہ اور صلح تھی۔ حکم ہوا کہ اُن کا معاہدہ پورا کریں، اور جب تک وہ خود عہد پر استوار رہیں، اُن کے معاہدہ کا ایفاء کیا جائے۔ اور اگر ان سے خیانت کا اندیشہ ہو تو

اُن کا عہد اُن کے منہ پر دے ماریں، اور اس وقت تک ان کے خلاف تلوار نہ اُٹھائیں جب تک نقضِ عہد کی ان کو اطلاع نہ کر دیں۔ اور حکم ہؤا کہ عہد شکنی کرنے والوں سے جنگ کی جائے ——

اور جب سورۃ براءت نازل ہوئی تو اس سورہ میں تینوں قسم کے احکام بیان کیے گئے۔ اور یہ واضح کر دیا گیا کہ اہل کتاب میں سے جو لوگ خدا اور رسول کے دشمن ہیں اُن سے جنگ کریں یہاں تک کہ وہ جزیہ دینا قبول کریں، یا اسلام میں داخل ہو جائیں۔ کفار اور منافقین کے بارے میں اس سورہ میں بتایا گیا کہ ان کے خلاف جہاد کیا جائے، اور اُن سے سخت برتاؤ کیا جائے۔ چنانچہ آپؐ نے کفار کے ساتھ شمشیر و سناں سے جہاد کیا۔ اور منافقین کے ساتھ دلیل و زبان سے۔ اسی سورۃ میں یہ بھی فرمایا گیا کہ کفار کے ساتھ کیے ہوتے اپنے تمام معاہدوں سے اعلانِ برائت کر دیں، اور ان کے معاہدے ان کے منہ پر دے ماریں —— اس سلسلہ میں اہلِ معاہدہ کی تین قسمیں قرار دی گئیں: ایک وہ قسم جس سے قتال کا حکم دیا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے خود عہد شکنی کی تھی۔ اور عہد کی پابندی پر قائم نہ رہے تھے۔ آپؐ نے ان سے جنگ کی اور ظفر یاب ہوئے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کے ساتھ آپؐ کے معاہدے ایک معین مدت تک کے لیے تھے۔ اور انہوں نے ان معاہدوں کی خلاف ورزی نہیں کی، اور نہ آپؐ کے خلاف کسی کو مدد دی۔ ان کے بارے میں اللہ نے حکم دیا کہ

ان کے معاہدوں کی مدّت پوری کریں ۔ تیسری قسم ان لوگوں کی تھی جن کے ساتھ آپؐ کا کوئی معاہدہ نہ تھا اور نہ وہ آپؐ سے برسرِ پیکار ہوئے ، یا ایسے لوگ تھے جن کے ساتھ غیر معین عرصہ کے لیے آپؐ کا معاہدہ تھا ۔ تو ایسے سب لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوا کہ انہیں چار ماہ کی مہلت دی جائے ، اور جب یہ مہلت ختم ہو جائے تو ان سے قتال کیا جائے ——— چنانچہ عہد شکنی کرنے والوں کو قتل کیا گیا ، اور جن سے کوئی معاہدہ نہ تھا یا جن کے ساتھ غیر محدود مدت کا معاہدہ تھا انہیں چار ماہ کی مہلت دی گئی ۔ اور ایفائے معاہدہ کرنے والوں کی مدّتِ معاہدہ کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ۔ اس طرح کے تمام لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے ۔ اور عرصۂ مہلت کے خاتمہ تک وہ کفر پر قائم نہ رہے ۔ اہلِ ذمہ پر جزیہ عائد کر دیا گیا ———

الغرض سورۂ براءت کے نازل ہونے کے بعد کفار کے ساتھ آپؐ کے برتاؤ نے مستقل طور پر تین شکلیں اختیار کر لیں ۔ محاربین ، اہل عہد ، اور اہلِ ذمہ ۔ اہلِ عہد بھی بالآخر اسلام میں شامل ہو گئے ، اور صرف دو قسم کے لوگ رہ گئے : محاربین اور اہلِ ذمہ ۔ محاربین آپؐ سے خائف رہتے تھے ۔ اس طرح تمام اہلِ زمین تین شکلوں میں آپؐ کے سامنے آگئے : ایک مسلمان جو آپؐ پر ایمان لائے ، دوسرے صلح جو جن کو آپؐ کی طرف سے امان ملی ، اور تیسرے خائفین جو برسرِ جنگ رہے ۔ رہا منافقین کے معاملہ میں آپؐ کا

اسوہ، تو آپؐ کو حکم دیا گیا کہ آپؐ اُن کے ظاہر کو قبول کریں اور اُن کے باطن کے حالات کو اللہ پر چھوڑ دیں، اور علم اور دلیل سے اُن کے ساتھ جہاد کریں۔ اُن سے رُوکشی کریں اور شدت کا برتاؤ کریں۔ اور قول بلیغ کے ساتھ ان کے دلوں پر اثر ڈالیں ان کا جنازہ پڑھنے سے اور ان کی قبروں پر قیام کرنے سے آپؐ کو منع کر دیا گیا۔ اور آپؐ کو بتا دیا گیا کہ اگر آپؐ ان کے لیے مغفرت بھی طلب کریں گے تو اللہ ان کو معاف نہیں کرے گا ——— یہ ہے آپؐ کا اسوہ کافر اور منافق دشمنوں کے بارے میں۔"

اس مضمون میں جہاد اسلامی کے تمام مراحل کی بڑی عمدگی سے تلخیص کی گئی ہے۔ اس تلخیص میں دین حق کے تحریکی نظام کے امتیازی اور دُور رس اوصاف کی جھلک ملتی ہے۔ یہ اس قابل ہیں کہ ان کا بغائر نظر مطالعہ کیا جائے۔ لیکن ہم یہاں چند مجمل اشارات ہی سے کام لے سکتے ہیں:

تحریک جہاد کی پہلی امتیازی خصوصیت

دین حق کا پہلا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس دین کا پُورا نظام عملی اور حقیقت پسندانہ ہے۔ اس کی تحریک واقعہ میں موجود انسانوں کو پکارتی ہے، اور ان وسائل و ذرائع سے کام لیتی ہے جو انسان کے عملی حالات کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں۔ چونکہ اس تحریک کا مقابلہ ایک ایسی جاہلیت سے ہوتا ہے جو ایک طرف خیالات اور عقائد پر قابض ہوتی ہے، دوسری طرف اس کی بنیاد پر زندگی کا عملی نظام قائم ہوتا ہے۔ اور تیسری طرف اسے اور اس کے قائم کردہ نظامِ زندگی

کی پشت پناہی کے لیے سیاسی اور مادی اقتدار موجود ہوتا ہے اس لیے اسلامی تحریک کو جاہلیت کا مقابلہ کرنے کے لیے متوازی وسائل و اسباب بروئے کار لانا پڑتے ہیں۔ یہ تحریک خیالات و عقائد کی اصلاح کے لیے دعوت و تبلیغ کو ذریعہ بناتی ہے، جاہلی نظامِ زندگی اور اس کے پشت پناہ اقتدار کے ازالہ کے لیے مادی طاقت اور جہاد سے کام لیتی ہے۔ کیوں کہ یہ نظام اور یہ اقتدار عامۃ الناس کے عقائد و خیالات کی اصلاح کی کوشش میں حائل ہوتا ہے اور اپنے وسائل اور گمراہ کن ہتھکنڈوں کے ذریعہ اپنی اطاعت پہ مجبور کرتا ہے، اور ان کو اپنے ربّ جلیل کے بجائے انسانوں کے آگے جُھکا دیتا ہے۔ یہ تحریک مادی اقتدار سے نبرد آزمائی میں محض دعوت و تبلیغ پر ہی اکتفاء نہیں کرتی، اور نہ عام انسانوں کے افکار کو بدلنے کے لیے جبر و اکراہ اور قوّت کا استعمال مناسب سمجھتی ہے۔ یہ دونوں اصول اس دین کے طریقِ کار میں یکساں طور پر اہمیّت رکھتے ہیں اور یکساں طور پر اختیار کیے جاتے ہیں۔ یہ تحریک برپا ہی اس غرض کے لیے ہوتی ہے کہ انسان کو انسان کی غلامی کے جُوئے سے آزاد کر کے اُسے خدائے واحد کا بندہ بنائے۔

دوسری امتیازی خصوصیّت

اس کا دوسرا امتیازی وصف یہ ہے کہ یہ ایک عملی تحریک ہے جو مرحلہ بمرحلہ ترقی کرتی ہے، اور ہر مرحلے میں اپنی عملی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق متوازی اور موزون وسائل اختیار کرتی ہے۔ ہر مرحلہ بعد میں آنے والے مرحلہ کے لیے فضا ہموار کرتا ہے ——— دراصل یہ دین عملی زندگی کا تجریدی نظریات

سے سامنا نہیں کرتا اور نہ وہ زندگی کے مختلف مراحل کو جامد اور ناقابل تغیر ذرائع سے طے کرتا ہے۔ جو لوگ دین کے نظام جہاد پر گفتگو کرتے ہوئے قرآنی نصوص کو بطور استدلال پیش کرتے وقت دین کے اس امتیازی وصف کا لحاظ نہیں کرتے، اور نہ ان مراحل کی فطرت وحقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں جن سے تحریکِ جہاد گزری ہے، اور نہ ان کی نظر اس پہلو پر ہوتی ہے کہ مختلف نصوص کا ہر ہر مرحلہ سے کیا تعلق ہے، تو اس طرح کے لوگ جب اسلام کے نظامِ جہاد پر کلام کرتے ہیں تو بات کو نہایت بھونڈے طریقے سے خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اور دین کے نظامِ جہاد کو گمراہ کن انداز سے بیان کرتے ہیں۔ اور آیاتِ قرآنی کو زبردستی کھینچ تان کر ان میں سے ایسے اصول اور قواعد کلیہ اخذ کرتے ہیں جن کی ان آیات میں قطعًا گنجائش نہیں ہوتی۔ ان کی غلطی کی بنیاد یہ ہے کہ وہ قرآن کی ہر آیت کے بارے میں یہ خیال کرتے ہیں کہ یہی آخری اور کلّی نص ہے۔ اور اس میں دین کا آخری اور کلّی حکم بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ گروہِ مفکّرین دراصل ان مایوس کن حالات کے دباؤ کے سامنے روحانی اور عقلی طور پر ہتھیار ڈال چکا ہے، جس میں اس وقت موجودہ مسلمان نسل مبتلا ہے اور جس کے پاس سوائے اسلام کے لیبل کے اور کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ یہ اسی شکست خوردہ ذہنیت کا اثر ہے کہ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ: "اسلام صرف مدافعانہ جنگ کا قائل ہے"! اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ وہ اس گمان میں مبتلا ہیں کہ انہوں نے اس تاویل سے دین پر بڑا احسان کیا ہے۔ حالانکہ اس غلط تاویل سے وہ دین کو اپنے امتیازی طریقِ کار سے دستبردار ہو جانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ گویا دین اپنا یہ نصب العین چھوڑ دے کہ وہ رُوئے

زمین سے تمام طاغوتی طاقتوں کو مٹانے کے لیے آیا ہے، انسانیت کا سر صرف خدائے واحد کے آگے خم کرنے کے لیے آیا ہے، انسانوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر بندوں کے پروردگار کی غلامی میں داخل کرنے کے لیے آیا ہے۔ لیکن اسلام اپنا یہ نصب العین سرانجام دینے کے لیے لوگوں سے بزورِ شمشیر اپنا عقیدہ نہیں منواتا، بلکہ وہ لوگوں کے لیے انتخابِ عقیدہ کی آزاد فضا فراہم کرتا ہے۔ وہ برسرِ اقتدار سیاسی نظاموں کو کلیتہً مٹا دیتا ہے یا انہیں زیرنگیں کرکے جزیہ قبول کرنے اور سرِ اطاعت خم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس طرح وہ کوئی ایسی رکاوٹ باقی نہیں رہنے دیتا، جو اس عقیدہ کو ماننے کی راہ میں لوگوں کے سامنے حائل ہوتی ہو۔ اس کے بعد وہ لوگوں کو مکمل آزادی دیتا ہے کہ چاہے تو وہ اس عقیدہ کو قبول کریں یا نہ کریں۔

تیسری امتیازی خصوصیت

تیسرا امتیازی وصف یہ ہے کہ دین کی یہ سخت کوش اور رواں دواں تحریک، اور اس کے نوبنو وسائل دین کو اس کے بنیادی اصول و مقاصد سے دُور نہیں کرتے۔ دین نے روزِ اوّل ہی سے، خواہ وہ رسول کے قریبی رشتہ داروں سے ہم کلام ہو، یا قریش سے خطاب کر رہا ہو، یا سب عربوں کی طرف اس کا روئے سخن ہو، یا تمام دنیا کے باشندے اُس کے مخاطب ہوں اُس نے سب سے ایک ہی بنیاد پر گفتگو کی ہے ——— وہ سب سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ انسانوں کی بندگی سے نکل کر صرف خدائے واحد کی بندگی کے لیے یکسو ہو جائیں۔ اس اصول پر وہ کوئی سودا بازی نہیں کرتا، اور نہ کسی لچک

کو گوارا کرتا ہے۔ پھر وہ اس یکتا مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایک لگے بندھے منصوبے پر عمل پیرا ہو جاتا ہے، یہ منصوبہ چند معین مراحل پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر مرحلے کے لیے متوازی اور نئے وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں۔

چوتھی امتیازی خصوصیت

چوتھا امتیازی وصف یہ ہے کہ یہ دین مسلم معاشرے اور دیگر معاشروں کے باہمی تعلقات کو باقاعدہ قانونی شکل دیتا ہے —— جیسا کہ زاد المعاد کی مذکورہ تلخیص سے واضح ہوتا ہے —— یہ قانونی ضابطہ جس بنیاد پر قائم ہے وہ یہ ہے کہ "اسلام" (خدا کی فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کا رویہ اختیار کرنا) ایک عالم گیر حقیقت ہے جس کی طرف رجوع کر لینا انسانیت پر لازم ہے۔ اور اگر وہ اس کی طرف رجوع نہ کرے اور اسے اختیار نہ کرے تو اُسے چاہیئے کہ وہ اسلام کے ساتھ بالجملہ مصالحت کا موقف اختیار کرے، اور کسی سیاسی نظام یا مادی طاقت کی شکل میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے آگے کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کرے۔ وہ ہر فرد کو آزاد چھوڑ دے تاکہ وہ اپنی آزاد مرضی سے اُسے اختیار کرے یا نہ اختیار کرے اور اگر اسے اختیار نہ کرنا چاہے تو اس کی مزاحمت بھی نہ کرے اور دوسروں کے لیے سدِّ راہ نہ بنے۔ اگر کوئی شخص مزاحمت کا رویہ اختیار کرے گا تو اسلام کا فرض ہوگا کہ وہ اس سے جنگ کرے یہاں تک کہ اُسے موت کے گھاٹ اُتار دے یا پھر وہ وفاداری اور اطاعت کا اعلان کر دے۔

شکست خوردہ اور مرعوب ذہنیت کے ادیب جب "اسلام میں جہاد کی حقیقت" کے موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہیں اور دامن اسلام سے جہاد کا "دھبہ" دھونے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ دو باتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں۔ ایک دین کا یہ رویہ کہ وہ عقیدہ کو جبراً ٹھونسنے کی مخالفت کرتا ہے جیسا کہ نصِّ قرآنی (لا اکراہ فی الدین) سے عیاں ہے۔ اور دوسرا دین کا یہ طریقِ کار کہ وہ ان تمام سیاسی اور مادّی قوتوں کو نیست و نابود کرتا ہے جو عقیدۂ دین اور انسانوں کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہوتی ہیں، اور جو انسان کو انسان کے سامنے سرافگندہ کرتی ہیں، اور اُسے اللہ کی عبودیت سے روکتی ہیں —— یہ دونوں اصول بالکل الگ الگ ہیں، ان کا باہم کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ دونوں کو باہم گڈمڈ کرنے کی کوئی گنجائش ہے۔ بایں ہمہ یہ لوگ اپنی شکست خوردہ ذہنیت سے مجبور ہو کر خلط مبحث کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسلام میں جہاد کو صرف اس مفہوم میں محصور کر دیا جائے جسے آج "دفاعی جنگ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلامی جہاد ایک جداگانہ حقیقت ہے، عہدِ حاضر کی انسانی جنگوں سے اس کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے، نہ اسباب جنگ کے لحاظ سے اور نہ جنگ کے ظاہری رنگ ڈھنگ کے لحاظ سے۔ اسلامی جہاد کے اسباب خود اسلام کے مزاج اور دنیا میں اس کے اصل کردار کے اندر تلاش کرنے چاہئیں، اور ان اعلیٰ اصولوں کے اندر تلاش کرنے چاہئیں جو اللہ تعالیٰ نے اس دین کے لیے مقرر فرمائے، اور جنہیں بروئے کار لانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو رسالت کے منصب عظیم پر سرفراز فرمایا، اور پھر آپ کو خاتم النبیین اور آپ کی رسالت کو خاتم الرسالات کا درجہ قرار دیا۔

اسلام انسان کی آزادی کا اعلانِ عام ہے

دین حق دراصل اس عالمگیر اعلان کا نام ہے کہ دنیا میں انسان، انسان کی غلامی سے، اور خود نفس کی غلامی سے جو انسانی غلامی ہی کی ایک شکل ہے، آزاد ہو، یہ اعلان دراصل اُس اعلان کا طبعی نتیجہ ہے کہ الوہیت کا مقام صرف خدائے واحد کے لیے مخصوص ہے اور اس کی شان ربوبیت تمام اہلِ جہان کو محیط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین حاکمیتِ انسان کی ہر نوعیت، ہر شکل، ہر نظام اور ہر حالت کے خلاف ہمہ گیر اور کُلّی انقلاب، اور روئے زمین پر قائم شدہ ہر اُس ہیئت کے خلاف مکمل بغاوت کرتا ہے جس میں کسی شکل میں بھی حکمرانی انسان کے ہاتھ میں ہو۔ یا دوسرے الفاظ میں الوہیت کا مقام انسان نے کسی نہ کسی صورت میں حاصل کر رکھا ہو۔ ایسا نظام حکمرانی جس میں معاملات کا آخری رجوع انسان کی طرف ہوتا ہو، اور انسان ہی اختیارات کا منبع ہوں، انسان کو درحقیقت الوہیت کا درجہ دیتا ہے، اور بعض انسانوں کو اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے لیے ارباباً من دون اللہ ٹھیراتا ہے۔ مگر جب یہ اعلان کر دیا گیا کہ ربوبیت اور الوہیت صرف خدائے واحد کے لیے مخصوص ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا غصب شدہ اقتدار غاصبین سے لے کر دوبارہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹا دیا جائے۔ اور ان غاصبین کو نکال باہر کیا جائے جو خانہ ساز شریعتوں کے ذریعہ انسانوں کی گردنوں

پر تخت حکومت بٹھاتے ہیں، خود کو ان کے لیے رب کا مقام دیتے ہیں اور انہیں اپنے غلاموں کا درجہ دیتے ہیں۔ مختصر لفظوں میں اللہ کی الوہیت اور ربوبیت کا آوازہ بلند کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ساری انسانی بادشاہتوں کی بساط لپیٹ کر اس زمین پر صرف پروردگار عالم کی بادشاہت کا ڈنکا بجا دیا جائے۔ یا قرآن کریم کے الفاظ میں یہ اعلان کر دیا جائے:

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلٰهٌ وَّ فِي الْأَرْضِ إِلٰهٌ۔ (زخرف: ۸۴)

وہی ایک آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی خدا ہے۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوْا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ (یوسف: ۴۰)

حکم صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔ اُس کا فرمان ہے کہ اُس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، یہی دین حق ہے۔

قُلْ يٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔

(آل عمران: ۶۴)

کہہ دیجیے، اے اہلِ کتاب، آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی

کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو خدا کی بندگی کرنے والے ہیں۔

دنیا میں حکومت الٰہیہ کیسے قائم ہو سکتی ہے

دنیا میں خدا کی بادشاہت کے قیام کی یہ صورت نہیں ہے کہ مسند حاکمیت پر کچھ "مقدس افراد" (یعنی دینی رہنما) فروکش ہو جائیں، جیسا کہ چرچ کی بادشاہت کا حال تھا اور نہ یہ درست ہے کہ دیوتاؤں کے کچھ "نمائندے" زمام حاکمیت ہاتھ میں لے لیں جیسا کہ تھیوکریسی یا "خدا کی مقدس حکومت" کے نام سے یاد کیے جانے والے نظام میں رائج تھا۔ خدا کی بادشاہت کا قیام یہ ہے کہ خدا کی شریعت حکمرانی کرے اور تمام معاملات کا آخری فیصلہ اس کے مطابق کیا جائے۔ لیکن یہ پیش نظر رہے کہ دنیا میں خدا کی بادشاہت کا قیام، انسان کی بادشاہت کا خاتمہ، غاصبین کے ہاتھوں سے اقتدار چھین کر خدا کی طرف اُسے لوٹانا، شریعت الٰہی کی فرماں روائی، انسانی قوانین کی تنسیخ ——— یہ سب مہمیں مجرد دعوت و تبلیغ سے انجام نہیں پا سکتیں۔ جو لوگ خلق خدا کی گردنوں پر سوار ہیں اور انہوں نے اقتدارِ خداوندی پر غاصبانہ تسلط قائم کر رکھا ہے یہ نری تبلیغ اور اپیل سے اپنے تختِ اقتدار سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اگر ایسا ہی معاملہ ہوتا تو انبیاء علیہم السلام کے لیے دنیا کے اندر دین حق کی سرفرازی نہایت سہل اور خوش گوار کام ہوتا۔ لیکن انبیاء کی تاریخ سے جو کچھ واضح ہوتا ہے اور

دینِ حق کی صدیوں پر پھیلی ہوئی داستان جس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے وہ اس کے برعکس ہے۔

اتنا اہم اعلان کہ الوہیت اور ربوبیت صرف خداوندِ عالم کے لیے مخصوص ہے، اور پھر اس اعلان کا یہ اہم نتیجہ کہ انسان اللہ کے ماسوا ہر قسم کے اقتدار اور حاکمیت سے آزاد ہوگا یہ کوئی محض نظریاتی، فلسفیانہ اور منفی نوعیت کا اعلان نہ تھا۔ بلکہ یہ مثبت تحریکی دعوت تھی جس کے پیشِ نظر ایک ایسے نظامِ زندگی کو عملاً بروئے کار لانا تھا جو شریعت الٰہی کے مطابق انسانوں پر حکمرانی کرے، اور انہیں عملی طاقت سے انسانوں کی غلامی سے نکال کر خدائے وحدہ لاشریک کے حلقۂ بندگی میں داخل کرے۔ ظاہر ہے کہ اتنے اہم مشن کو سرانجام دینے کے لیے ضروری تھا کہ یہ اعلان مجرد تبلیغ و دعوت تک محدود نہ رہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تحریک کا قالب بھی اختیار کرے تاکہ عملی صورتِ حال کے ہر ہر پہلو کا مقابلہ متوازی اور عملی وسائل و ذرائع سے ہو سکے۔

انسان نے ہر دور میں —— دورِ ماضی میں بھی، عہدِ حاضر میں بھی اور شاید عالمِ فردا میں بھی —— دینِ حق کا طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے مقابلہ کر کے اسے نیچا دکھانے کی کوششیں کی ہیں کیونکہ یہ دین انسانوں کو غیر اللہ کی آقائی سے آزاد کرتا ہے۔ چنانچہ انسانوں نے اس دین کے راستے میں فکری اور مادّی ہر طرح کی رکاوٹیں کھڑی کیں۔ سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی دیواریں حائل کیں، نسلی اور طبقاتی نعرے استعمال کیے۔ انسان کے منحرف عقائد اور باطل تصوّرات بھی مذکورہ عوامل کے پہلو بہ پہلو کام کرتے رہے

سے تھے۔ اور ان دونوں کے اتحاد سے انتہائی پیچیدہ صورت حال ظہور پذیر ہوتی رہی ہے۔

اگر "تبلیغ" عقائد اور تصوّرات کی اصلاح کرتی ہے تو "تحریک" دوسرے مادّی سنگہائے راہ کو صاف کرتی ہے، جن میں سر فہرست وہ سیاسی قوّت ہے جو پیچیدہ مگر مربوط فکری، نسلی، طبقاتی، اجتماعی اور اقتصادی سہاروں پر قائم ہوتی ہے۔ اور یہ دونوں ـــــ تبلیغ اور تحریک ـــــ مل کر قائم شدہ نظام پر چاروں طرف سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور اُن تمام عوامل و اسباب کے ساتھ اپنے نئے نظام کو بروئے کار لانے میں ممد ہوتے ہیں اور اس غرض کے لیے ہر مخالف حال کا اس کے ہم پلّہ عوامل اور وسائل سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اس زمین پر انسان کی حقیقی آزادی بلکہ پوری دنیا میں پوری انسانیت کی حقیقی آزادی کا عظیم مشن سرانجام دینے کے لیے ان دونوں کو (یعنی تبلیغ اور تحریک کو) دوش بدوش کام کرنا ہوتا ہے۔ یہ نہایت اہم نقطہ ہے جسے بار بار ذہن نشین کرنا نہایت ضروری ہے۔

عبودیت کی اصل حقیقت

یہ دین صرف عربوں کی آزادی کا اعلان نہیں ہے، اور نہ اس کا پیغام صرف عربوں تک محدود ہے۔ اس دین کا موضوع انسان ـــــ پوری نوعِ انسانی ـــــ اور اس کا دائرہ کار زمین ـــــ پوری روئے زمین ـــــ ہے۔ اللہ تعالیٰ صرف عربوں کا پروردگار نہیں ہے۔ حتّٰی کہ اُس کی ربوبیت ان لوگوں تک

ہی محدود نہیں ہے جو عقیدۂ اسلام کے ماننے والے ہیں۔ اللہ تعالٰے تمام اہلِ جہان کا رب ہے۔ یہ دین تمام اہلِ جہان کو ان کے رب کی طرف لوٹا دینا چاہتا ہے، انہیں عبودیت غیر اللہ کے چنگل سے آزاد کرانا چاہتا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں اصل عبودیت یہ ہے کہ انسان ایسے قوانین کا طوق اپنے گلے میں ڈال لے جو خود اُس جیسے انسانوں نے ہی وضع کیے ہوں، اور یہی وہ "عبادت" (بندگی) ہے جس کے بارے میں اس دین نے فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص رہے گی۔ جو شخص غیر اللہ کے آگے اس عبادت کو بجالاتا ہے، وہ چاہے دینداری کا لاکھ دعوٰے کرے مگر وہ دین سے خارج ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف الفاظ میں یہ فرمایا ہے کہ رائج الوقت قانون اور حکومت کی اطاعت "عبادت" کا دوسرا نام ہے۔ عبادت کے اس مفہوم کی رُو سے جب یہود اور نصاریٰ نے خدائے واحد کی "عبادت" سے روگردانی کی تو وہ "مشرکین" میں شمار کیے گئے۔

ترمذی نے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب اُن (عدی بن حاتم) تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پہنچی تو وہ شام بھاگ گئے۔ کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں انہوں نے عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ مگر اُن کی بہن اور قبیلے کے چند لوگ قیدی بنا لیے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بہن پر احسان فرمایا (اور انہیں بلا فدیہ آزاد کر دیا)، اور کچھ عطیہ دے کر

اسلام دعوت اور تحریک دونوں پہلوؤں سے برپا ہو

اگر انسان کی عملی زندگی اسلام کے مذکورہ اعلانِ آزادی کے خلاف پائی جاتی ہو تو اس صورتِ حال کے ازالہ کے لیے ناگزیر ہے کہ اسلام بیک وقت تبلیغ (بیان) اور تحریک (حرکت) دونوں پہلوؤں سے میدان میں اُترے۔ اور اُن سیاسی طاقتوں پر کاری ضربیں لگائے جو انسانوں کو غیر اللہ کی چوکھٹ پر سر افگندہ کرتی ہیں اور اللہ کی شریعت سے بے نیاز ہو کر ان پر حکمرانی کرتی ہیں۔ اور اسلام کی دعوت کو لوگوں کے کانوں تک پہنچنے نہیں دیتیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ عقیدۂ اسلام کا انتخاب کرنا بھی چاہیں تو بھی انہیں یہ آزادی نہیں ہوتی کہ وہ برسرِاقتدار طاقت سے بے خوف اور بے نیاز ہو کر اسے قبول کر سکیں۔ تبلیغ اور تحریک دونوں حیثیتوں سے اسلام کا رُو بکار آنا اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ اسلام طاغوتی اقتدار سے ملکِ خدا کو پاک کرنے کے بعد، چاہے وہ نرا سیاسی نوعیت کا ہو، اور چاہے اُس نے نسلیت کا لبادہ پہن رکھا ہو یا ایک ہی نسل کے اندر طبقاتی امتیازات پیدا کر رکھے ہوں، ایک ایسا نیا معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی نظام قائم کر سکے جو تحریکِ آزادئ انسان کو عملی جامہ پہنائے اور دنیا کے اندر اُسے فروغ دینے میں ممد و معاون ہو۔

اِسلام کے نزدیک آزادئ انسان کا مطلب

اسلام کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ وہ لوگوں پر زبردستی اپنا عقیدہ ٹھونسے۔

انہیں واپس کر دیا۔ وہ اپنے بھائی کے پاس آئیں اور اُن کو اسلام کی ترغیب دی، اور بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ عدی تیار ہو گئے۔ مدینہ میں لوگوں کے اندر عدی کی آمد کا چرچا ہوا۔ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر ہوئے تو ان کے گلے میں چاندی کی صلیب تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت یہ آیات تلاوت فرما رہے تھے: اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ (اہلِ کتاب نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کو چھوڑ کر اپنا رب ٹھیرا لیا)۔ عدی کہتے ہیں: میں نے عرض کی: وہ راہبوں کی عبادت نہیں کرتے۔ آنجناب نے فرمایا: جس چیز کو ان کے علماء اور راہبوں نے حلال کیا اسے وہ لوگ حلال مان لیتے تھے، اور جسے انہوں نے حرام قرار دیا اسے وہ حرام تسلیم کر لیتے تھے۔ اور یوں وہ اپنے علماء اور راہبوں کی عبادت کرتے تھے۔" اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی جو تشریح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے وہ اس بارے میں نص قطعی ہے کہ کسی غیر الٰہی قانون اور حکومت کی پیروی ایک عبادت ہے۔ اور اس کے ارتکاب کے بعد مسلمان دین کے دائرہ سے نکل جاتا ہے۔

اس نص سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ غیر اللہ کی عبادت سے مراد یہ ہے کہ بعض انسان بعض دوسرے انسانوں کو ارباب من دون اللہ ٹھیرالیں۔ دینِ حق اسی منکر کو نیست و نابود کرنے کے لیے آیا ہے۔ اور اُس کا اعلان ہے کہ اِس تختۂ زمین پر بسنے والے انسانوں کو غیر اللہ کی عبودیت سے آزاد ہونا چاہیئے۔

مگر یہ بھی واضح ہے کہ اسلام کسی مجرد عقیدہ کا نام نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا ہے اسلام انسانوں کی غلامی سے انسان کو آزاد کرانے کا ایک عالم گیر اعلان ہے۔ اس کی دعوت کا آغاز ہی اس نصب العین سے ہوتا ہے کہ وہ ایسے تمام نظاموں اور حکومتوں کو ختم کرنا چاہتا ہے، جو انسانوں کی گردنوں پر انسانوں کی حاکمیت کا تخت بچھاتی ہیں اور انسانوں کو انسان کا غلام بناتی ہیں۔ جب وہ لوگوں کی گردنوں کو انسانی حاکمیّت کے سیاسی دباؤ سے چھڑا دیتا ہے، اور ان کے سامنے انسان کی روح وعقل کو منور کر دینے والی دعوت پیش کر دیتا ہے تو پھر انہیں آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ وہ جس عقیدہ اور نظریہ کو چاہیں اپنی آزاد مرضی سے اختیار کر لیں۔ لیکن اس آزادی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان اپنی اہواء واغراض کو الٰہ بنا لیں یا وہ خود یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ انسانوں کی غلامی میں رہیں گے اور ایک دوسرے کو اپنا رب بنائیں گے۔ دنیا کے اندر حکمرانی کا جو نظام بھی قائم ہو وہ بندگیٔ رب کی بنیاد پر قائم ہونا چاہیئے۔ اور قوانینِ حیات کا ماخذ صرف اللہ کی ذات ہونی چاہیئے تاکہ اس اصولی نظام کے سائے میں ہر فرد کو آزادی ہو کہ وہ جس عقیدہ کو چاہے قبول کرے۔ یہی صورت ہے جس میں دین یعنی قانون، سرافگندگی، اطاعت اور بندگی سراسر صرف اللہ کے لیے خالص ہو سکتی ہے۔ دین کا مفہوم عقیدہ کے مفہوم سے زیادہ وسیع اور جامع ہے۔ دین اُس نظام اور طریقِ عمل کا نام ہے جو انسانی زندگی کو اس کی وسعتوں سمیت اپنے قبضۂ اقتدار میں لاتا

ہے۔ اسلام میں اس نظام کا تمام تر اعتماد عقیدہ پر ہوتا ہے۔ مگر اس کی گرفت کا دائرہ عقیدہ سے زیادہ وسیع ہے۔ چنانچہ اسلامی نظام حکومت کے اندر اس امر کی گنجائش ہے کہ اس میں ایسی متعدد آبادیاں پائی جائیں جو اسلام کے مُلکی قانون کی (جو اللہ کی بندگی پر استوار ہوتا ہے) وفادار تو ہوں مگر انہوں نے اسلام کو عقیدہ کی حیثیت سے تسلیم نہ کیا ہو۔

کیا اسلام "دفاعی تحریک" ہے؟

جو شخص دین کے اس مخصوص مزاج کو، جس کی تشریح ہم اوپر کر آئے ہیں، اچھی طرح سمجھ لیتا ہے وہ خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ اسلامی تحریک کا آغاز دونوں صورتوں میں ہونا ناگزیر ہے: یعنی جہاد بالسیف کی صورت میں بھی، اور جہاد بالقول کی صورت میں بھی۔ اور یہ حقیقت بھی اُس پر عیاں ہو جائے گی کہ اسلام ان محدود معنی میں "دفاعی تحریک" نہیں ہے جو عہد حاضر کی مروجہ اصطلاح: "مدافعانہ جنگ" سے متبادر ہوتے ہیں۔ یہ تنگ اور غلط مفہوم دراصل ان حضرات کا تجویز کردہ ہے جو حالات کے دباؤ اور مستشرقین کے عیّارانہ حملوں سے شکست کھا کر اسلام کی تحریک جہاد کی یہ تصویر پیش کر رہے ہیں۔ اسلام ایک سیلِ رواں تھا جو اس لیے اُمڈا کہ دنیا کے اندر انسان کو حقیقی آزادی سے ہمکنار کرے۔ وہ انسان کی عملی زندگی کے ایک ایک پہلو سے نبرد آزما ہوا۔ اور ہر پہلو کی اصلاح کے لیے اُس نے وہ وسائل اختیار کیے جو اُس کے لیے

مناسب اور موزوں تھے ۔ اس کی تحریک جہاد متعین مرحلوں سے گزری اور اس نے ہر مرحلے میں نئے اور کارگر وسائل سے کام لیا۔

بالفرض اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اسلام کی تحریک جہاد ایک دفاعی تحریک ہے تو پھر ہمیں خود لفظِ "دفاع" کے مفہوم کو بدلنا ہوگا، اور "دفاع" سے مراد "انسان کا دفاع" لینا ہوگا۔ یعنی ان تمام محرکات و اسباب کے مقابلے میں انسان کی مدافعت کرنا جو انسان کی آزادی کو پامال کرتے ہیں یا اُس کی حقیقی آزادی کی راہ میں حائل ہوتے ہیں ۔ یہ محرکات جس طرح تصورات اور اعتقادات کی صورت میں پائے جاتے ہیں اسی طرح یہ ایسے سیاسی نظاموں کی شکل میں بھی پائے جا سکتے ہیں جو اقتصادی، طبقاتی اور نسلی حد بندیوں اور امتیازات پر قائم ہوتے ہیں۔ جب اسلام دنیا میں آیا تھا تو اس وقت بھی روئے زمین پر ان محرکات کا دور دورہ تھا، اور عہدِ حاضر کی تازہ جاہلیت میں بھی ان کی بعض شکلیں دنیا میں رائج ہیں ۔ لفظ "دفاع" کا یہ وسیع مفہوم اختیار کر کے ہم بآسانی اُن داعیات کا ادراک کر سکتے ہیں جن کی بدولت دنیا میں اسلامی تحریک کا طلوع جہاد کے جلو میں ہوا۔ بلکہ اِس طرح ہمارے سامنے خود اسلام کا صحیح مزاج بھی آئینہ ہو جائیگا، اور ہمیں یہ سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی کہ اسلام کا مطلب ہے انسان کی بندگیٔ انسان سے آزادی، ربوبیت الٰہی اور تعلیمات ربانی کے سامنے سرافگندگی، دنیا میں خواہشاتِ انسانی کی خود سری اور سرکشی کا خاتمہ اور صرف

شریعتِ الٰہی اور خدا کی حکومت !!

رہی وہ کوششیں جو ایسے دلائل اور وجوہ جواز گھڑنے میں صرف کی جا رہی ہیں جن سے اسلامی جہاد کو اُسی محدود اور تنگ مفہوم کا جامہ پہنایا جا سکے جو "مدافعانہ جنگ" کی رائج الوقت اصطلاح میں پایا جاتا ہے ، اور وہ دیدہ ریزی جو اس غرض کے لیے ایسی روایات و اسناد کا کھوج لگانے میں کی جاتی ہے ، جن سے یہ ثابت ہو سکے کہ جہادِ اسلامی کے جتنے وقائع پیش آئے ہیں وہ محض "وطنِ اسلام" ——— ان میں سے بعض کے نزدیک وطنِ اسلام سے مراد جزیرۃ العرب ہی ہے ——— پر ہمسایہ طاقتوں کی جارحیت کے سدِ باب کے سلسلے میں پیش آئے ہیں ۔ ایسی تمام کوششیں دراصل اس امر کی غماز ہیں کہ یا تو دین کے مزاج کو اور دنیا کے اندر اس کے اصل رول کو اسلام کے ان کرم فرماؤں نے سمجھا ہی نہیں اور یا حالات کی سنگینی کے سامنے اور جہادِ اسلامی پر مستشرقین کے عیارانہ حملوں کے مقابلے میں انہوں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں ۔

کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر حضرت ابوبکر ، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کو یہ اطمینان ہو جاتا کہ رومی اور فارسی طاقتیں جزیرۃ العرب پر حملہ آور نہ ہوں گی تو وہ اسلام کے سیلِ رواں کو دنیا کے اطراف و اکناف تک پہنچانے کی کوشش نہ کرتے ؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے کیونکہ اس کے بغیر اسلام کی دعوت کو آگے بڑھایا ہی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اُس کی راہ میں متعدد

مادی مشکلات حائل تھیں: مثلاً ریاست کا سیاسی نظام، معاشرے کے نسلی اور طبقاتی امتیازات، اور پھر ان نسلی اور طبقاتی نظریوں کی کوکھ سے جنم لینے والے اقتصادی نظام اور ان کی محافظت اور پُشت پناہی کرنے والے ریاست کے مادی وسائل۔ یہ سب عوامل راستے کے سنگ ہائے گراں تھے۔

یہ تصور کرنا کتنی بڑی سادہ لوحی ہے کہ ایک دعوت روئے زمین پر بسنے والی پوری نوعِ انسانی کی آزادی کا اعلان بھی کرے اور پھر وہ مذکورہ بالا رکاوٹوں کا سامنا محض زبان و بیان کے جہاد سے کرتی پھرے! بے شک یہ دعوت زبان و بیان سے بھی جہاد کرتی ہے۔ مگر کب؟ اس وقت جب انسان اس دعوت کو قبول کرنے میں آزاد ہوں۔ چنانچہ یہ دعوت تمام اثرات و موانع سے انسانوں کو آزاد کر دینے کے بعد آزادی کی فضا میں اُن سے اپیل کرتی ہے۔ اور "لا اکراہ فی الدین" کے ضابطے کی پابندی کرتی ہے۔ لیکن جب مذکورہ بالا مادی اثرات اور رکاوٹوں کی عمل داری ہو تو اس کے بغیر چارہ نہیں ہے کہ پہلے انہیں بذریعہ قوّت دُور کیا جائے، تاکہ جب یہ دعوت انسان کے دل و دماغ سے اپیل کرے تو وہ ایسی تمام زنجیروں اور بیڑیوں سے آزاد ہوں اور کُھلے دل سے اس اپیل کے بارے میں اپنا فیصلہ دے سکیں۔

دعوتِ اسلامی کا نصب العین اگر انسان کی آزادی کا فیصلہ کُن اعلان ہے، اور پھر یہ اعلان محض فلسفیانہ اور نظریاتی تشریحات تک محدود نہیں

ہے، بلکہ وہ عملی حالات سے نبرد آزما ہونا چاہتا ہے، اور ہر ہر پہلو کا ایسے وسائل سے توڑ کرنا چاہتا ہے جو اس کیلیے موزون و مؤثر ہوں تو ایسی انقلابی دعوت کے لیے جہاد کا راستہ بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ اور اس کا جہاد سے وہی تعلق ہے جو چولی کا دامن سے ہے، چاہے وطن اسلام ——— اور صحیح اسلامی اصطلاح میں دارالاسلام ——— امن کی حالت میں ہو اور چاہے اس کے سر پر ہمسایہ طاقتوں کا خطرہ منڈلا رہا ہو۔ اسلام جب امن کے لیے تگ و دو کرتا ہے تو اس کے پیش نظر وہ "سستا امن" نہیں ہوتا جس کی تان صرف اس بات پر آکر ٹوٹ جائے کہ اسلام کے نام لیوا جس مخصوص خطۂ ارضی میں رہتے ہیں وہ خطرات سے محفوظ و مصوؔن ہو جائے۔ اسلام جس امن کا خواہاں ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے اندر دین پورے کا پورا قائم ہو جائے۔ تمام انسان صرف خدائے واحد کی عبودیت بجا لائیں۔ اور اللہ کو چھوڑ کر اپنے جیسے انسانوں کو رب نہ ٹھیرائیں۔ عہدِ نبوّت کے بعد اصل اعتبار ان آخری مراحل کا ہے جن تک اسلام کی تحریک جہاد بحکم خداوندی پہنچی ہے۔ دعوت کے ابتدائی مراحل یا درمیانی مراحل اب معتبر نہیں ہوں گے۔ ابتدائی اور درمیانی مراحل گزر چکے ہیں، اور جیسا کہ امام ابن قیم نے بیان کیا ہے کہ "بالآخر آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ برأت کے نازل ہونے کے بعد کفّار کے ساتھ جو رویّہ اختیار فرمایا اُس کی تین شکلیں ہوئیں: وہ کفّار جو برسرِ جنگ ہیں، دوسرے وہ جو معاہدین

ہیں اور تیسرے اہلِ ذمہ۔ معاہدین اور اہلِ صلح بھی جب حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تو صرف دو ہی قسم کے کفار آنجناب کے مقابلے میں رہ گئے ایک محاربین اور دوسرے اہل ذمہ۔ محاربین وہ لوگ ہیں جو آپؐ سے خائف ہیں (اس لیے ان کے ساتھ ہر وقت جنگ کی حالت رہتی ہے)۔ گویا تمام اہلِ جہان آپؐ کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کی رُو سے تین قسموں میں منقسم ہو گئے۔ ایک وہ مسلمان جو آپؐ پر ایمان لائے، دوسرے وہ صلح جُو جن کو آپؐ سے امن ملا (اور ان سے مراد اہلِ ذمہ ہیں جیسا کہ اوپر کی عبارت سے واضح ہے) اور تیسرے محاربین جو آپؐ سے خائف تھے"۔

اس بحث میں کفار کے ساتھ دعوت اسلامی کے رویے کی جو شکلیں بیان کی گئی ہیں منطقی طور پر یہی شکلیں اس دین کے مزاج اور مقاصد کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں۔ حالات سے شکست خوردہ ذہنیت اور مستشرقین کے حملوں سے بوکھلا جانے والی فکر جہاد کی جو تشریح کرتی ہے منطق و عقل کی رُو سے وہ اس دین کے مزاج سے کوسوں دور ہے۔

جہاد کے تدریجی احکام

مسلمان جب شروع شروع میں مدینہ میں ہجرت کر کے گئے تو اللہ تعالےٰ نے انہیں قتال سے باز رہنے کا حکم دیا اور مسلمانوں سے فرمایا کہ: کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ (اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو) بعد میں انہیں قتال کی اجازت دی گئی اور ارشاد

ہوا کہ :-

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ
اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۙ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن
دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَ
لَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ
صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا
اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ
إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ
فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَ
أَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ
عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝

اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ جاری ہے کیوں کہ وہ مظلوم ہیں، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے، صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے، اگر اللہ ان لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے سب مسمار کر ڈالی

جائیں - اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں - اللہ بڑا طاقت ور اور زبردست ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے، اور منکر سے منع کریں گے، اور تمام معاملات کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اس کے بعد اگلا مرحلہ آیا جس میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ جو لوگ ان کے خلاف تلوار اٹھائیں وہ بھی اُن سے قتال کریں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ

(بقرہ - ۱۹۰)

اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔

اور آخر میں تمام مشرکین کے خلاف عمومی طور پر قتال کو فرض کیا گیا - اور حکم ملا کہ:-

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِکِیْنَ کَآفَّةً کَمَا یُقَاتِلُوْنَکُمْ کَآفَّةً - (توبہ:

اور مشرکوں سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں۔

قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ

الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَاحَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ
وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ
حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۔

(توبہ : ۲۹)

جنگ کرو اہلِ کتاب میں سے اُن لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں لاتے، اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں مانتے ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

یوں امام ابن قیم رحمہ اللہ کی تصریح کے مطابق پہلے مسلمانوں کو مشرکین اور کفار کے خلاف قتال کرنے سے منع کیا گیا، پھر اُس کی اجازت نازل ہوئی، اس کے بعد ان لوگوں کے خلاف قتال کو فرض کیا گیا جو قتال کی ابتداء کریں، اور آخر میں تمام مشرکین اور کفّار کے خلاف قتال فرض کر دیا گیا۔ جہاد کے بارے میں قرآن کی واضح نصوص، جہاد پر برانگیختہ کرنے والی احادیثِ رسول، صدرِ اسلام کی اسلامی جنگیں، بلکہ پوری اسلامی تاریخ کا سرگزشتِ جہاد سے لبریز دفتر، یہ تمام ایسے واضح اور روشن دلائل ہیں کہ ان کی موجودگی میں مسلمان کا دل جہاد کی وہ تفسیر قبول کرنے سے سخت اِبا کرتا ہے جو ان حضرات کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے جن کا ذہن درحقیقت

ناسا عد حالات کے دباؤ اور مستشرقین کے مکّارانہ پروپگنڈے سے مات کھا چکا ہے۔ ایسا کون عقل کا دھنی ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے واضح احکام بھی سُنے، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح اقوال پر بھی اس کی نظر ہو اور اسلامی فتوحات سے لبریز تاریخ کا دفتر بھی اُس کے سامنے ہو اور پھر وہ اس خام خیالی میں مبتلا ہو جائے کہ جہاد کی پوری اسکیم ایک عارضی ہدایت تھی اور تغیر پذیر حالات اور اسباب کے ساتھ اُس کا تعلق تھا اور اس اسکیم کا صرف وہ پہلو دائمی حیثیت رکھتا ہے جو سرحدوں کی حفاظت سے تعلق رکھتا ہے۔

اِذنِ قتال کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ابتدائی احکام نازل ہوئے اُن میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو اس امر سے آگاہ کر دیا تھا کہ دنیاوی زندگی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ابدی اور مستقل اصول جاری ہے کہ وہ انسانوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے دفع کرتا رہتا ہے تاکہ خدا کی زمین میں فساد کا قلع قمع ہوتا رہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ
اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِينَ أُخْرِجُوا
مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا
اللَّهُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ
لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ

يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا ۝ (حج : ۴۰)

اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔ اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے۔ اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے سب مسمار کر ڈالی جائیں۔

لہٰذا یہ کشمکش ایک عارضی حالت نہیں ہے بلکہ ابدی اور مستقل جنگ ہے۔ یہ جنگ اس ابدی فیصلے کا لازمی تقاضا ہے کہ روئے زمین پر حق اور باطل دوش بدوش نہیں رہ سکتے۔ اسلام نے جب کبھی دنیا میں اللہ کی ربوبیت پر مبنی نظام قائم کرنے کا اعلان کیا ہے اور انسان کو بندگیٔ انسان کی لعنت سے نجات دینے کی تحریک کی ہے تو اللہ کی حاکمیت پر غاصبانہ قبضہ رکھنے والی طاقتیں اس کے خلاف شمشیر برہنہ بن کر کھڑی ہو گئیں اور اُس کے وجود کو کسی قیمت پر بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوئیں۔ خود اسلام بھی ان باغیوں کے قلع قمع پر کمر بستہ رہا اور انسانوں کی گردنوں پر سوار ان کے طاغوتی نظام کو مٹاتا رہا۔ چراغ مصطفوی اور شرار بولہبی کے درمیان یہ ستیزہ کاری ازل

سے جاری ہے۔ اور جہاد آزادی کا سیلِ رواں بھی اس وقت تک نہیں تھم سکتا جب تک بو بھی ختم نہ ہو اور دین پورے کا پورا اللہ کے لیے خالص نہ ہو جائے۔

مکّی دور میں جہاد بالسیف کیوں منع تھا؟

مکّی زندگی میں قتال سے ہاتھ روک رکھنے کا حکم طویل المیعاد منصوبہ بندی کا محض ایک عارضی مرحلہ تھا۔ یہی حکمت ہجرت کے ابتدائی ایّام میں کار فرما تھی۔ لیکن ابتدائی ایّام کے بعد جب مسلم جماعت جہاد کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تو اس کا محرک محض مدینہ منوّرہ کے تحفظ اور دفاع کا احساس نہ تھا۔ بلاشبہ یہ تحفظ بھی ناگزیر تھا لیکن یہ اسلامی تحریک کا ایک ابتدائی مقصد یا حیلہ تھا منتہائے مقصود نہ تھا۔ اور اس کی روح یہ تھی کہ تحریک کے "مرکز طلوع" کو خطرات سے محفوظ رکھا جائے تاکہ کاروانِ تحریک رواں دواں رہے اور انسان کی آزادی کا فریضہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے برابر پیش قدمی کرتا رہے۔ اور اُن تمام دیواروں کو ڈھا دے، جو آزادیٔ انسان کی راہ میں حائل ہوں۔ مکّی زندگی میں مسلمانوں کا جہاد بالسیف سے دست کش رہنا قابلِ فہم اور قرینِ عقل معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ مکّہ میں حریّتِ تبلیغ کا انتظام موجود تھا۔ صاحب دعوت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم بنو ہاشم کی تلواروں کی حمایت میں تھے۔ اور اس وجہ سے آپؐ کو دعوتِ حق کا کُھل کر اعلان کرنے کے مواقع مل رہے تھے۔ آپؐ اس دعوت کو انسانوں کے گوش گزار کر سکتے تھے، ان کے دل و دماغ سے اپیل کر سکتے تھے اور فرداً فرداً ہر شخص سے مخاطب ہو سکتے تھے۔ وہاں کوئی ایسی منظم سیاسی طاقت موجود نہ تھی جو تبلیغ و دعوت کی آواز کے سامنے ایسی دیواریں کھڑی کر سکتی کہ افراد

اُسے سننے سے قطعی محروم ہو جاتے لہٰذا اس مرحلہ میں تحریک کے لیے طاقت کے استعمال کی کوئی حاجت نہ تھی۔ علاوہ ازیں اور بھی متعدد ایسے اسباب موجود تھے جو اس مرحلہ میں دعوت کو قتال کے بغیر ہی جاری و ساری رکھنے کے متقاضی تھے۔ ان تمام اسباب کو میں نے بالاختصار اپنی تفسیر "فی ظلال القرآن" میں آیت: الم تر الی الذین قیل لھم کفوا ایدیکم .... الخ کی تشریح کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ اس تفسیر کے بعض حصوں کو یہاں نقل کر دینا غیر مفید نہ ہوگا۔

اس دور میں جہاد بالسیف کی ممانعت کی دوسری وجہ

"اس مرحلہ میں جہاد بالسیف کی ممانعت اس وجہ سے بھی ہو سکتی ہے کہ دعوت اسلامی کا یہ مرحلہ ایک مخصوص ماحول، مخصوص قوم، اور مخصوص حالات کے اندر تربیت اور فراہمی استعداد کا مرحلہ تھا۔ اِس طرح کے ماحول میں تربیت اور استعداد کی فراہمی جن مختلف النوع مقاصد کے تحت ضروری تھی اُن میں سے ایک مقصد یہ تھا کہ ایک عرب انسان کو ان باتوں کے گوارا کرنے کی تربیت دی جائے جنہیں وہ گوارا کرنے کا عادی نہیں ہے۔ مثلاً اپنی ذات پر یا ان لوگوں پر جو اس کی پناہ میں ہوں ظلم و زیادتی کو صبر سے برداشت کرنا۔ تاکہ وہ اپنی شخصیت کی پرستش اور اپنے منہ زور نفس کے غلبہ سے آزاد ہو۔ اور صرف ذات کا دفاع اور حلیفوں کا تحفظ ہی اُس کی پوری زندگی کا محور اور اُس کی تمام سرگرمیوں کا محرک بن کر نہ رہ جائے۔ نیز اُسے ضبطِ نفس کی مشق ہو تاکہ وہ ——— جیسا کہ اُس کی فطرت ہے ——— ناگوار بات سنتے ہی بے قابو نہ ہو جایا کرے اور کسی بھی ہیجان خیز واقعہ کا سامنہ کرتے ہی کف بر دہن نہ ہو جائے،

بلکہ اُس کے مزاج اور تمام حرکات و سکنات میں اعتدال اور وقار کی شان جلوہ گر ہو۔ اُسے یہ تربیّت بھی دی جائے کہ وہ ایک ایسی جماعت کے ڈسپلن کی پابندی کرے جو نہایت منظم ہے اور جسے ایک اعلیٰ قائد کی سرپرستی حاصل ہے۔ زندگی کے ہر معاملہ میں وہ اس قائد کی طرف رجوع کرے، اُس کا ہر فعل قائد کے حکم کا آئینہ دار ہو بلالحاظ اس کے کہ وہ حکم اُس کی عادت یا ذوق کے خلاف ہے یا موافق۔ مکّی زندگی میں ایک عرب کی سیرت کی تعمیر و اصلاح کے لیے یہی امور بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور مدّعا یہ تھا کہ اعلیٰ سیرت و کردار کے حامل افراد سے ایک ایسا مسلم معاشرہ تشکیل کیا جائے جو قائد کے اشارۂ ابرو پر حرکت کرتا ہو، ترقی یافتہ اور مہذّب ہو، وحشیانہ خصائل اور قبائلی مفاسد سے پاک اور منزہ ہو۔

تیسری وجہ

اس دَور میں جہاد بالسیف کے امتناع کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ قریش کا ماحول تفاخر اور نسبی شرافت و برتری کے احساسات سے بھرپور ماحول تھا۔ اس طرح کے ماحول میں پُرامن دعوت زیادہ مؤثر اور کارگر ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس مرحلے میں قتال کا طریقہ اختیار کرنا عناد اور عداوت کو مزید بھڑکانے کا باعث بن سکتا تھا اور خونی انتقام کے نئے جذبات اور محرکات کو جنم دے سکتا تھا۔ عربوں کے اندر پہلے سے خونی انتقام کے چکر چل رہے تھے جنہوں نے داحس اور غبراء اور بسوس کی جنگوں کو برس ہا برس تک جاری رکھا اور آخر قبیلوں کے قبیلے مٹا کر رکھ دیے۔ خونی انتقام کے نئے جذبات اُن کے ذہنوں اور دلوں

میں اسلام کے ساتھ منسوب ہو کر اُترتے تو پھر وہ کبھی فرو نہ ہو پاتے۔ نتیجۃً اسلام ایک دعوت اور ایک دین کے بجائے خونی انتقام کے جھگڑوں کے سلسلۂ لامتناہی میں تبدیل ہو جاتا، اور یوں اس کی بنیادی تعلیمات مرحلۂ آغاز ہی میں زینتِ طاقِ نسیاں ہو کر رہ جاتیں اور آئندہ کبھی اُن کو زندہ کرنے کی نوبت نہ آپاتی۔

چوتھی وجہ

یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ وسیع پیمانے پر خانہ جنگی کی صورتِ حال پیدا کرنے سے اجتناب مقصود تھا۔ اس وقت کسی باضابطہ حکومت کا کوئی وجود نہ تھا جو اہلِ ایمان کو تعذیب اور ایذا رسانی کا نشانہ بناتی، بلکہ تعذیب و تادیب" کی خدمت ہر مومن کے اپنے ہی رشتہ دار اور سرپرست انجام دے رہے تھے۔ اس طرح کی فضا میں اذنِ قتال کے صاف معنی تھے کہ گھر گھر میں معرکہ بپا ہو جاتا، اور خانہ جنگی کا طویل اور لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اور لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ: "یہ ہے اسلام"!۔ بلکہ فی الواقع اسلام کے بارے میں ایسا کہا بھی گیا تھا، باوجودیکہ اسلام نے قتال کی ممانعت کا حکم دے رکھا تھا۔ مگر قریش کے لوگ حج کے موسم میں حج اور تجارت کی خاطر دور و دراز سے آنے والے عرب قافلوں میں جا جا کر اُن سے یہ کہتے تھے کہ: "محمد نہ صرف اپنی قوم اور اپنے قبیلے میں تفریق ڈال رہا ہے، بلکہ باپ اور بیٹے میں جدائی پیدا کر رہا ہے۔" قریش یہ اعتراض ایسی صورت میں کر رہے تھے جب کہ اہل ایمان کو تلوار اُٹھانے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن اگر فی الواقع بیٹے کو باپ کی گردن اُڑانے اور غلام کو ولی کے قتل کرنے کا حکم دے دیا جاتا، اور ہر گھر اور ہر محلّہ میں یہ محاذ کھول دیا

جاتا تو معترضین کیا کہتے اور عملاً کیا صورت حال پیدا ہوتی -؟!

پانچویں وجہ

یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ اسلام کے مخالفین کی اکثریت جنہوں نے آغاز کار میں مسلمانوں کو طرح طرح کی دینی آزمائشوں میں ڈالا، زہرہ گداز اذیتیں دیں اور اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا خود ایک نہ ایک دن اسلام کے مخلص اور وفا شعار سپاہی بلکہ قائد تک بننے والے ہیں ـــــــ کیا عمر ابن خطاب انہی لوگوں میں سے نہیں تھے ؟ مگر اسلام لانے کے بعد اُن کو جو مرتبہ ملا ہے وہ محتاج وضاحت نہیں ہے۔

چھٹی وجہ

یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ عربوں کی نخوت و حمیت بالخصوص قبائلی ماحول میں فطرۃً ایسے ستم رسیدہ انسان کی حمایت پر تُل جاتی ہے جو ظلم و اذیت تو برداشت کر لیتا ہے مگر پسپا ہونا نہیں جانتا۔ یہ حمیت اس وقت اور زیادہ جوش میں آتی ہے جب ظلم و ستم کا ہدف اُن کے اشراف اور اخیار بن رہے ہوں۔ مکّہ کے ماحول میں ایسے بکثرت واقعات پیش آئے ، جو اس نظریہ کی صحت کی تصدیق کرتے ہیں۔ مثلاً جب ابو بکرؓ ـــــــ ایک انتہائی شریف اور کریم النفس انسان ـــــــ مکّہ کو چھوڑ کر کسی اور مقام کی طرف ہجرت کے لیے نکل کھڑے ہوئے تو ابن الدغنہ اسے برداشت نہ کر سکا اور انہیں ہجرت سے روک دیا۔ کیونکہ وہ اس بات کو عربوں کے لیے باعثِ ننگ سمجھتا تھا۔ چنانچہ اُس نے حضرت ابو بکرؓ کو اپنی حمایت اور اپنی پناہ پیش کی۔

ایسے واقعات کی بہترین مثال اُس وثیقہ کی شکست و ریخت ہے جس کے تحت بنو ہاشم کو شعب ابی طالب میں محصور کیا گیا، مگر جب ان کی بھوک اور فاقہ زدگی کا دَور طول پکڑ گیا، اور ان کی تکلیف حد سے بڑھ گئی تو بالآخر خود عرب نوجوانوں نے ہی اس وثیقہ کے پُرزے پُرزے کر ڈالے ۔ یہ نخوت عرب کا امتیازی وصف تھا۔ جب کہ قدیم تہذیبوں کے اندر جو انسانیت کی تذلیل کی عادی رہی ہیں اس کے برعکس صورتِ حال نظر آتی ہے ۔ وہاں ظلم و اذیت پر مہر بلب رہنے سے انسان خود ماحول کی طرف سے تمسخر و استہزاء اور حقارت کا نشانہ بنتا ہے اور اُلٹا ظالم موذی کی تعظیم و تکریم کی جاتی ہے ۔

ساتویں وجہ

یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد کم تھی ۔ اور وہ صرف مکہ ہی میں پائے جاتے تھے ۔ دعوتِ اسلامی ابھی تک جزیرۂ عرب کے دوسرے حصوں تک نہیں پہنچی تھی ۔ یا اگر پہنچی تھی تو محض اُڑتی اُڑتی خبروں کی صُورت میں ۔ دوسرے قبائل اسے قریش اور ابنائے قریش کی اندرونی جنگ سمجھ کر ابھی تک غیر جانب دار تھے ، اور آخری فیصلے کے منتظر ۔ ان حالات میں اگر قتال مسلمانوں پر فرض کر دیا جاتا تو یہ محدود جنگ مسلمانوں کی اس قلیل جماعت کے کلّی خاتمہ پر منتج ہوتی ۔ اور خواہ مسلمان اپنے سے کئی گنا زیادہ لوگوں کو مار ڈالتے مگر وہ خود پورے کے پُورے صفحۂ وجود سے محو ہو جاتے ۔ شرک کی عملداری جوں کی توں رہ جاتی ، اور اسلامی نظام کے قیام کی صبح طلوع نہ ہو سکتی ۔ اور کبھی اس کا عملی نظام اپنی بہار نہ دکھا سکتا ۔ حالانکہ وہ اس لیے نازل ہوا ہے کہ انسانی زندگی کا عملی نقشہ اُس

پر استوار رہو۔"

مدنی دَور کے ابتدائی ایام میں جہاد کیوں ممنوع رہا؟

مدنی زندگی کے اوائل ایام میں بھی قتال کی ممانعت رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے یہود کے ساتھ، اور ان عربوں کے ساتھ جو مدینہ کے اندر اور مدینہ کے اطراف میں آباد تھے اور ابھی تک شرک پر قائم تھے عدم جنگ کا معاہدہ کر لیا تھا۔ آپؐ کا یہ اقدام درحقیقت اس نئے مرحلے کا طبعی تقاضا تھا، اور اس کا پس منظر یہ تھا کہ:

اوّلاً: وہاں تبلیغ و نصیحت کے کھلے مواقع حاصل ہو گئے تھے۔ کوئی سیاسی قوّت اُس پر قدغن لگانے والی اور لوگوں کو اُس سے روکنے والی موجود نہ تھی۔ تمام آبادی نے نئی مسلم ریاست کو تسلیم کر لیا تھا اور اُس کے سیاسی معاملات کو سُلجھانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت پر اتفاق کر چکے تھے۔ چنانچہ مذکورہ بالا معاہدے میں یہ طے کر دیا گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر کوئی شخص معاہدۂ صلح کرنے یا جنگ چھیڑنے یا خارجہ تعلقات قائم کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو گئی تھی کہ مدینہ منورہ کی اصل سیاسی قوّت مسلم قیادت کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے دعوت کے فروغ کے دروازے کھُلے تھے، عقیدہ کی آزادی موجود تھی، اور لوگ جس عقیدہ کو چاہتے اُسے اختیار کرنے میں کوئی قوّت انہیں روکنے والی نہ تھی۔

ثانیاً: اس مرحلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے ساتھ یکسو ہو کر نبٹنا چاہتے تھے۔ کیونکہ ان کی مخالفت دوسرے قبائل کے اندر دینِ حق کی اشاعت

کے لیے سدِ راہ بن رہی تھی۔ وہ قبائی اس انتظار میں تھے کہ قریش اور ابنائے قریش کا یہ داخلی معرکہ کس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ اسی منصوبے کے مدِ نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موقع گنوائے بغیر جنگی دستوں (سرایا) کو اِدھر اُدھر بھیجنے میں عجلت کی۔ اور آپؐ نے سب سے پہلا دستہ جو روانہ کیا اُس کی کمان حضرت حمزہ بن عبد المطلبؓ کے سپرد فرمائی۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا اور ابھی ہجرت کو چھ ماہ ہوئے تھے۔ اس دستہ کے بعد پے در پے کئی دستے روانہ کیے گئے۔ ایک ہجرت کے نویں ماہ کے آغاز پر، دوسرا تیرھویں ماہ کے آغاز پر، تیسرا سولھویں ماہ کے آغاز پر اور جب ہجرت کا سترھواں ماہ شروع ہوا تو عبداللہ بن جحش کی قیادت میں ایک سریّہ روانہ کیا گیا۔ اس سریّہ نے وہ پہلا معرکہ برپا کیا جس میں خونریزی تک نوبت پہنچی۔ یہ معرکہ ماہ حرام (رجب) میں پیش آیا۔ اسی معرکے کے بارے میں سورۂ بقرہ کی یہ آیات نازل ہوئیں:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ، قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ، وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ، وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ، وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ...... الخ (بقرہ: ۲۱۷)

لوگ پوچھتے ہیں ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو، اِس میں لڑنا بہت بُرا ہے، مگر راہِ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر

کرنا اور مسجدِ حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے
رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اِس سے بھی
زیادہ بُرا ہے اور فتنہ خونریزی سے شدید تر ہے۔

پھر ہجرت کے دوسرے سال کے اندر ہی ماہ رمضان المبارک میں غزوۂ بدر کُبریٰ پیش آیا۔ سورۂ انفال میں اسی جنگ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

اسلامی تحریک کا یہ موقف اگر حالات کے اس پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو یہ کہنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اسلامی تحریک کا بنیادی منصوبہ دراصل رائج الوقت مفہوم کے مطابق اپنی "مدافعت" کے سوا کچھ نہ تھا۔ یعنی وہی تاویل جو حالاتِ حاضرہ کی "سرخ آنکھوں" کا یارانہ رکھنے والے حضرات، اور مستشرقین کی عیارانہ تنقیدوں سے بوکھلا اُٹھنے والے مفکرّین کی طرف سے پیش کی جا رہی ہے۔ درحقیقت جو لوگ غلبۂ اسلام کی بے نظیر تحریک کو خالص مدافعانہ اسباب کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور پھر اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، یہ "اربابِ تحقیق" مستشرقین کی اُس جارحانہ تحریک سے مات کھا چکے ہیں جس نے اسلام پر ایسے وقت میں تابڑ توڑ حملے شروع کر رکھے ہیں جب نہ مسلمانوں کی شان و شوکت باقی رہی ہے، اور نہ اسلام کیساتھ اُن کی وابستگی قابلِ رشک ہے۔ البتہ ایک گروہ قلیل بہ توفیق ایزدی ایسے ہتھکنڈوں سے ضرور محفوظ ہے، اور وہی لوگ اس بات پر بھی ڈٹے ہوئے ہیں کہ اسلام کا یہ ابدی پیغام کہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان اقتدار الٰہی کے سوا ہر قسم کے اقتدار و استبداد سے نجات پائیں اور دین سراسر اللہ

کے لیے ہوں غالب و برتر کر کے رہیں گے۔ مگر اس گروہ قلیل کے ماسوا باقی تمام منکرین کا یہ حال ہے کہ وہ اس تلاش میں رہتے ہیں کہ انہیں اسلامی جہاد کے لیے اخلاقی وجوہ مل جائیں جن سے وہ معترضین کو مطمئن کر سکیں۔ مگر خاک بر سر آنہا، اسلامی فتوحات کے لیے قرآن نے جو وجوہ جواز پیش کر دیے ہیں ان سے زائد کسی اور اخلاقی سند کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے:

فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ اَجْرًا عَظِيمًا ٥ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيرًا ٥ اَلَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ، فَقَاتِلُوا اَوْلِيَاءَ الشَّيْطٰنِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا ٥ (النساء: ۴، ۷۶ تا ۷۶)

اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیئے ان لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو فروخت کر دیں، پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اُسے ضرور ہم اجرِ عظیم عطا کریں گے

آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پاکر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔ جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کر لیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور اور جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں، پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ (انفال: ۳۸ تا ۴۰)

اے نبی ان کافروں سے کہو کہ اگر اب بھی باز آ جائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے اس سے درگزر کر لیا جائے گا، لیکن اگر یہ اسی پچھلی روش کا اعادہ کریں گے تو گزشتہ قوموں کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ اے ایمان والو اُن کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو

جائے۔ پھر اگر وہ فتنہ سے رُک جائیں تو ان کے اعمال کا دیکھنے والا اللہ ہے اور اگر وہ نہ مانیں تو جان رکھو کہ اللہ تمہارا سرپرست ہے اور وہ بہترین حامی و مددگار ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۔

(توبہ : ۲۹ تا ۳۲)

جنگ کرو اہل کتاب میں سے اُن لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں لاتے، اور جو کچھ اللہ اور اُس کے

رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو
اپنا دین نہیں بناتے ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ
دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔ یہودی کہتے ہیں کہ عُزَیرُ اللہ کا بیٹا ہے
اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بے حقیقت باتیں
ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں ان لوگوں کی دیکھا دیکھی جو
ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے۔ خدا کی مار ان پر یہ کہاں
سے دھوکہ کھا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں
کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا ہے اور اس طرح مسیح ابن مریم کو
بھی۔ حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم
نہیں دیا گیا تھا۔ وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پاک
ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ یہ لوگ چاہتے
ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بُجھا دیں۔ مگر اللہ اپنی روشنی
کو مکمل کیے بغیر رہنے والا نہیں ہے خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی
ناگوار ہو۔

جہاد کے جو وجوہ و محرکات ان آیات کے اندر بیان ہوئے ہیں وہ ہیں:
دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا سکہ رواں کرنا، انسانی زندگی میں اللہ
تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام حق کو قائم کرنا، تمام شیطانی طاقتوں اور شیطانی نظامہائے
حیات کا قلع قمع کرنا، انسان کی آقائی ختم کرنا جو انسانوں کو اپنی غلامی کی
زنجیروں میں جکڑتی ہے حالانکہ انسان صرف خدا کے غلام ہیں اور سوائے اُس

کے کسی غلام کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ انسانوں کو اپنے خود ساختہ اقتدار کا تابع بنائے اور ان پر اپنی اھواء و اغراض کی شریعت نافذ کرے۔ یہی وجوہ و محرکات جہاد قائم کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ اس اصول کی بھی پابندی کی جانی چاہیے کہ "لا اکراہ فی الدین" (دین میں جبر نہیں ہے)۔ یعنی بندوں کے اقتدار اور الوہیت سے چھٹکارا پا جانے کے بعد اور اس اصول کی بالاتری کے بعد کہ اقتدار صرف اللہ کا ہو گا یا بالفاظ دیگر دین سراسر اللہ کے لیے ہو گا کسی فرد بشر کو عقیدۃً اسلام قبول کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا۔ جہاد کے ان وجوہ و محرکات پر اگر آپ غور کریں گے تو ان کا حاصل یہ نکلے گا کہ اسلام جس غرض کے لیے جہاد کا علمبردار ہے وہ اس دنیا کے اندر انسان کی مکمل اور حقیقی آزادی ہے۔ اور یہ آزادی تبھی مکمل ہو سکتی ہے کہ انسان کو انسان کی عبودیت سے نکال کر اُسے خدا کی عبودیت کاملہ کی فضائے بسیط میں لایا جائے جو صرف ایک ہے اور اُس کا کوئی ساجھی نہیں ہے۔ کیا جہاد کو برپا کرنے کے لیے صرف یہی مقصد عظیم کافی نہیں ہے؟۔

بہر حال قرآن نے جہاد کے جو وجوہ و مقاصد بیان کیے ہیں یہی وجوہ و مقاصد ہر وقت مسلمان مجاہدین کے پیش نظر رہتے تھے۔ ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ کسی مسلمان مجاہد سے یہ دریافت کیا گیا ہو کہ تم کس لیے جہاد پر نکل کھڑے ہوئے ہو، اور اُس نے یہ جواب دیا ہو کہ: "ہمارے وطن کو خطرہ در پیش ہے، ہم اُس کے دفاع کے لیے اُٹھے ہیں" یا "ہم مسلمانوں پر اہل فارس اور اہل روم کی جارحانہ کارروائیوں کو روکنے کے لیے نکلے ہیں" یا

ہم ملک کے رقبہ کی توسیع چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ غنائم حاصل ہوں"!! ——— اس کے برعکس ان کا جواب وہ ہوتا تھا جو ربعی ابن عامر، حذیفہ بن محصن اور مغیرہ بن شعبہ نے قادسیہ کی جنگ میں فارسی لشکر کے سپہ سالار رستم کو دیا تھا۔ رستم آغازِ جنگ سے تین روز پہلے تک برابر ان مجاہدین کرام سے الگ الگ یہ پوچھتا رہا کہ: "کیا خواہش تمہیں یہاں لے کر آئی ہے"؟ مگر ان سب کا جواب یہ تھا کہ:

> "اللہ نے ہمیں اس لیے بھیجا ہے کہ ہم انسان کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے نکال کر صرف خدائے واحد کی بندگی کی طرف لائیں، دُنیا کی تنگی سے نکال کر انہیں دُنیا کی فراخی سے بہرہ ور کریں، ادیان کے ظلم و ستم سے نجات دے کر عدلِ اسلام سے ہمکنار کریں۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنا دین دے کر اپنی مخلوق کے پاس بھیجا ہے۔ پس جو ہمارے اس دین کو قبول کر لیتا ہے، ہم اس کے اقرار کو تسلیم کر لیتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں اور اُس کا ملک اُسی کے حوالے کر دیتے ہیں، اور جو سرتابی کرتا ہے اُس سے جنگ کرتے ہیں یہاں تک کہ شہادت پا کر جنّت حاصل کر لیں یا فتح یاب ہو جائیں۔"

جہاد کی ایک اور طبعی وجہ

جہاد کے خارجی وجوہ و محرّکات کے علاوہ اس کی ایک قائم بالذّات وجہِ جواز

بھی ہے جو خود اس دین کی سرشت میں مُضمر، اور اس کے انسانی آزادی کے ہمہ گیر مطالبے میں پنہاں ہے۔ یہ دین جس طرح انسان کے عملی حالات سے کامیاب جوابی وسائل کے ساتھ دُو بدُو ہوتا ہے، اور متعین مراحل کے اندر ہر ہر محاذ پر نئے نئے ذرائع اختیار کرتا ہے خود یہ حقیقت پسندانہ طریقِ کار بھی جہاد کی اس طبعی وجہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ وجہ آغازِ دعوت ہی سے پیدا ہو جاتی ہے اور سرزمینِ اسلام پر اور اُس کے مسلمان باشندوں پر کسی بیرونی حملے کا خطرہ ہو یا نہ ہو یہ برقرار رہتی ہے۔ اس وجہ کو وجود میں لانے کے ذمہ دار محدود نوعیّت کے دفاعی تقاضے یا وقتی حالات نہیں ہیں بلکہ بے خدا معاشروں کے اندر دعوتِ اسلامی کے لیے جو عملی مشکلات اور رکاوٹیں پائی جاتی ہیں ایک طرف وہ اور دوسری طرف خود اسلام کا اپنا مخصوص طرزِ زندگی اور عملی زندگی میں اس کی دعوتِ کشمکش مِل جُل کر اس وجہ کی تخلیق کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ بجائے خود جہاد کے حق میں ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ ایک مسلمان اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتا ہے، ان اقدار کے غلبہ و فروغ کے لیے جہاد کرتا ہے جن کے اندر اس کی کوئی ذاتی منفعت شامل نہیں ہوتی اور نہ اس طرح کا کوئی اور لالچ اُسے اس پر اُبھارتا ہے۔ ایک مسلمان جب جہاد کے لیے نکلتا ہے اور میدانِ کارزار میں قدم رکھتا ہے تو اس سے بہت پہلے وہ ایک بڑا معرکۂ جہاد سر کر چکا ہوتا ہے۔ اس معرکہ میں اُس کا حریف نفس کا شیطان ہوتا ہے، اس کی اھواء و خواہشات ہوتی ہیں، خوشنما امنگیں اور آرزوئیں ہوتی ہیں، ذاتی مفادات ہوتے ہیں، اپنی

برادری اور قوم کے مفادات ہوتے ہیں۔ الغرض اس کا مقابلہ ہر اُس نعرے سے ہوتا ہے جو اسلام کے خلاف ہو، ہر اُس جذبہ کے خلاف ہوتا ہے جو بندگیٔ خدا سے متصادم ہو اور دنیا میں حکومتِ الٰہیہ کے قیام اور طاغوت کے خاتمہ میں حائل ہو۔

اِسلام کی نگاہ میں دفاعِ وطن کا اصل محرّک

جو لوگ جہادِ اسلامی کا جواز صرف "وطنِ اسلام" کے دفاع تک محدود رکھتے ہیں وہ دراصل اسلام کے طریقِ زندگی کی عظمت کو کم کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں یہ پاکیزہ طریقِ زندگی اتنی اہمیت بھی نہیں رکھتا جتنی اہمیت "وطن" کو حاصل ہے۔ وطن اور ایسے ہی دوسرے عوامل کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر وہ نہیں ہے جو یہ حضرات پیش کرتے ہیں۔ ان کا یہ نقطۂ نظر عہدِ حاضر کی تخلیق ہے، یہ اسلامی شعور اور اسلامی تعلیم کے لیے قطعاً اجنبی اور نو وارد ہے۔ اِسلامی تعلیم کی رُو سے جہاد کو قائم کرنے کے لیے اصل اعتبار اسلامی عقیدہ کے تحفّظ کا ہے، یا اُس طریقِ حیات کے تحفّظ کا ہے جو اس عقیدہ کی عملی تفسیر پیش کرتا ہے یا اُس معاشرے کے تحفّظ کا ہے جس میں اس طریقِ حیات کی عملداری ہو۔ رہی "خاکِ وطن" تو بذاتِ خود اِسلام کی نگاہ میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی وزن ہے۔ تصوّرِ اسلامی کے تحت "خاکِ وطن" کو اگر کوئی چیز شرف و عظمت بخش سکتی ہے اور اُسے گراں قدر بنا سکتی ہے

تو وہ صرف یہ بات ہے کہ وہاں اللہ کی حکومت کا سکہ رواں ہو اور اللہ کا بھیجا ہوا نظامِ زندگی وہاں نافذ ہو۔ اس نسبت کے بعد وطن عقیدۂ اسلام کا قلعہ، اسلامی نظامِ حیات کی جلوہ گاہ اسلام کا گھر (دارالاسلام) اور انسان کی آزادیٔ کامل کی تحریک کا منبع و مرکز قرار پاجاتا ہے۔ اور بلاشبہ دارالاسلام کا تحفظ اور دفاع خود عقیدۂ اسلام کا دفاع ہے، اسلامی نظامِ حیات اور اسلام کے نمائندہ معاشرہ کا دفاع ہے۔ لیکن دفاع کو اصل اور آخری مقصد نہیں قرار دیا جاسکتا، اور نہ دارالاسلام کا تحفظ ہی اسلام کی تحریک جہاد کی اصل غایت ہے۔ بلکہ دارالاسلام کی حفاظت تو خدا کی حکومت کے قیام کا ایک ذریعہ ہے۔ اور ثانیاً اس کی وجہ یہ ہے کہ دارالاسلام کو وہ مرکزی مقام بنانا مقصود ہوتا ہے کہ جہاں سے اسلام کا آفتاب جہاں تاب دنیا کے کونے کونے میں چمکے اور نوعِ انسانی اُس کے اعلانِ آزادی سے متمتع ہو ـــــــــ یہ بات ہم بیان کرچکے ہیں کہ اس دین کا موضوع "نوعِ انسان" ہے اور اس کا دائرۂ کار پورا کرۂ ارضی ہے۔

جہاد اسلام کی فطری ضرورت ہے

جیسا کہ ہم پیچھے بیان کرچکے ہیں دنیا میں اللہ کی حکومت کے قیام میں کئی مادّی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ ریاست کی بے پناہ طاقت، معاشرے کا نظام اور روایات، پورا انسانی ماحول۔ ان میں سے ہر ہر چیز اسلام کی راہ میں ایک

سنگِ گراں ہے ۔ اسلام ان تمام رکاوٹوں کو ہٹانے کے لیے طاقت کا استعمال کرتا ہے ۔ تاکہ اسلام کے درمیان اور افرادِ انسانی کے درمیان کوئی حجاب حائل نہ رہے اور وہ آزاد فضا کے اندر انسان کی روح اور عقل سے اپیل کر سکے ۔ بناوٹی آقاؤں کی قیود سے رہا کر کے وہ انسانوں کو ارادہ و انتخاب کی آزادی فراہم کرتا ہے تاکہ وہ اپنی آزاد مرضی سے جس بات کو چاہیں قبول کریں اور جسے چاہیں ردّ کر دیں ۔

اسلام کے نظریۂ جہاد پر مستشرقین نے جو مکروہ حملے شروع کر رکھے ہیں ۔ اُن سے ہمیں ہرگز دھوکا نہیں کھانا چاہیئے اور نہ کسی گھبراہٹ کا اظہار کرنا چاہیئے ۔ یہ بات بھی ہماری حوصلہ شکنی کا باعث نہیں ہونی چاہیئے کہ حالات کا دھارا ہمارے خلاف بہ رہا ہے اور دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں بھی ہمارے خلاف ہیں ۔ یہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ ہم ان سے متاثر ہو کر اسلامی جہاد کے وجوہ جواز دین کی فطرت و حقیقت سے کہیں باہر تلاش کرنا شروع کر دیں ۔ اور جہاد کو دفاعی ضرورت اور وقتی اسباب و حالات کا نتیجہ قرار دینے لگیں ۔ جہاد جاری ہے اور جاری رہے گا ۔ خواہ دفاعی ضروریات اور وقتی اسباب و حالات پائے جائیں یا نہ پائے جائیں ۔ تاریخ کے نشیب و فراز کا جائزہ لیتے وقت ہمیں ان اصلی محرکات اور تقاضوں کو ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہیئے جو اس دین کی طبیعت میں ، اس کے عالمگیر اعلانِ آزادی میں ،

اور اس کے حقیقت پسندانہ طریقِ کار میں پنہاں ہیں۔ یہ بات درست نہ ہو گی کہ ہم ان اصل محرّکات اور تقاضوں کے درمیان اور دفاعی ضروریات اور وقتی داعیات کے درمیان خلط مبحث کریں۔

بلاشبہ اس دین کو بیرونی حملہ آوروں سے اپنے دفاع کا پورا پورا انتظام کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ دین کا محض اس شکل میں آنا کہ یہ اللہ کی عالمی ربوبیت کا اعلان اور غیراللہ کی بندگی سے انسان کی رستگاری کی دعوت ہے، اور پھر اس کا ایک منظم تحریک کا قالب اختیار کر لینا جو جاہلی قیادتوں سے باغی اور ایک بالکل نئی اور جُداگانہ طرز کی قیادت کے تابع ہو، اور ایک نرالے اور مستقل معاشرے کی تخلیق کرنا جو انسانی حاکمیّت کو اس لیے تسلیم نہ کرتا ہو کہ حاکمیّت صرف خدائے واحد کا حق ہے ———

دین کا اس شکل میں دنیا سے اپنا تعارف کرانا ہی اس امر کے لیے بہت کافی ہے کہ اردگرد کے وہ تمام جاہلی معاشرے اور طبقے جو بندگیٔ انسان کی بنیاد پر قائم ہیں اس کو نیست و نابود کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور اپنے وجود کے تحفّظ و دفاع کے لیے خم ٹھونک کر باہر نکل آئیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں نئے اسلامی معاشرے کو بھی اپنے تحفظ و دفاع کا انتظام کرنا ہوگا۔ اس صورتِ حال کا رونما ہونا ناگزیر ہے جوں ہی اسلام کا ظہور ہوگا یہ صورتِ حال بھی لازماً پیدا ہوگی۔ اس کشمکش کو چھیڑنے میں اسلام کی پسند و ناپسند کا سوال

ہی نہیں پیدا ہوتا کیوں کہ یہ کشمکش تو اسلام پر ٹھونسی جاتی ہے ۔ یہ وہ طبعی کشمکش ہے جو دو ایسے نظاموں کے مابین چھڑ کر رہتی ہے جو زیادہ عرصہ تک بقائے باہم کے اصول پر ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے ۔ یہ وہ حقیقت ہے جس میں مجال شک نہیں ہے ۔ اور اسی نفس الامری حقیقت کی رُو سے اسلام کے لیے اپنی مدافعت ضروری ہو جاتی ہے ۔ اُسے یہ مسلّط کردہ دفاعی جنگ لڑے بغیر چارہ نہیں ہے ۔

جاہلیت کے مقابلے میں اسلام "جنگ بندی" نہیں کر سکتا

لیکن اس حقیقت نفس الامری کے علاوہ ایک اور اٹل حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیئے جو اس پہلی حقیقت سے زیادہ اہم اور روشن ہے ——— اسلام کی فطرت کا یہ ایک اٹل تقاضا ہے کہ وہ بنی نوع انسان کو غیر اللہ کی بندگی کے گڑھے سے نکالنے کے لیے روزِ اوّل ہی سے پیش قدمی شروع کر دیتا ہے ۔ لہٰذا اس کے لیے جغرافی حدود کی پابندی ناممکن ہے ، اور نہ وہ نسلی حد بندیوں میں محصور ہو کر رہ سکتا ہے ، اُسے یہ گوارا نہیں ہے کہ وہ مشرق سے لے کر مغرب تک پھیلی ہوئی پوری نوع انسانی کو شر و فساد اور بندگیٔ غیر اللہ کا لقمہ بنتے دیکھتے اور پھر اسے چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کر لے ۔ اسلام کے مخالف کیمپوں پر تو ایک ایسا وقت آ سکتا ہے کہ ان کی مصلحت کا تقاضا یہ ہو کہ اسلام کے خلاف کوئی جارحانہ کاروائی نہ کی جائے بشرطیکہ اسلام انہیں اس بات کی اجازت دے دے کہ وہ

اپنی علاقائی حدود کے اندر رہ کر بندگیٔ غیر اللہ کی ڈگر پر چلتے رہیں، اسلام انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے اور انہیں اپنی دعوت اور اپنے اعلانِ آزادی کی پیروی پر مجبور نہ کرے۔ مگر اسلام اُن کے ساتھ "جنگ بندی" کا مؤقف اختیار نہیں کر سکتا۔ اِلّا یہ کہ وہ اسلام کے اقتدار کے آگے اپنا سر خم کر دیں، اور جزیہ دینا قبول کر لیں۔ جو اس امر کی ضمانت ہوگا کہ انہوں نے دعوتِ اسلام کے لیے اپنے دروازے کھول دیے ہیں، اور اُس کی راہ میں کسی سیاسی طاقت کے بل پر روڑے نہیں اٹکائیں گے۔ اس دین کا یہی مزاج ہے اور اللہ کی عالمی ربوبیت کا اعلان، اور مشرق و مغرب کے انسانوں کے لیے غیر اللہ کی بندگی سے نجات کا پیغام ہونے کی حیثیت سے اس کا یہ ناگزیر فرض بھی ہے۔ اسلام کے اس تصوّر میں اور اس تصوّر میں جو اسکو جغرافیائی اور نسلی حدود میں مقید کر دیتا ہے، اور جب تک کسی بیرونی جارحیت کا خطرہ نہ ہو، اس کو کسی اقدام کی اجازت نہیں دیتا، فرق ظاہر ہے! پہلی حالت میں وہ ایک زندہ اور متحرک قوت ہے، جب کہ دوسری صورت میں وہ تمام داخلی اور فطری محرکاتِ عمل سے یکسر محروم ہو جاتا ہے!

اسلام کی پیش قدمی اور حرکت پسندی کے وجوہ جو از زیادہ مؤثر اور واضح طور پر سمجھنے کے لیے یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ اسلام انسانی زندگی کا خدائی نظام ہے، یہ کسی انسان کا وضع کردہ نہیں ہے، نہ یہ کسی انسانی جماعت کا خود ساختہ

مسلک ہے، اور نہ یہ کسی مخصوص انسانی نسل کا پیش کردہ طریقِ حیات۔ اسلام کی تحریک جہاد کے اسباب خارج میں ڈھونڈنے کی ضرورت صرف اسی وقت پیش آتی ہے جب ہماری نگاہوں سے یہ عظیم حقیقت اوجھل ہو جاتی ہے، اور ہم بھول جاتے ہیں کہ دین کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکومت کے قیام کے ذریعے سارے مصنوعی خداؤں کی خدائی کی بساط لپیٹ دی جائے۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان اس اہم اور فیصلہ کن حقیقت کو اپنے ذہن میں ہر وقت تازہ بھی رکھے اور پھر جہادِ اسلامی کے سلسلے میں کسی خارجی وجہ جواز کی تلاش و جستجو میں سرگرداں بھی ہو۔

اسلام کے بارے میں دو تصوّر اور ان کا فرق

اسلام کے ان دو تصوّروں کے درمیان جو فرق ہے اُس کا صحیح اندازہ سفر کی پہلی منزل پر نہیں ہو سکتا۔ ایک تصوّر تو یہ ہے کہ اسلام کو جاہلیت کیخلاف غیرارادی طور پر جنگ لڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس لیے کہ اس کے وجود کا طبعی تقاضا تھا کہ جاہلی معاشرے اس پر حملہ آور ہوں۔ اور اسلام بامر مجبوری مدافعت کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ اور دوسرا تصوّر یہ ہے کہ اسلام لازمًا بذاتِ خود شروع سے پیش قدمی کرے گا اور بالآخر معرکۂ کارزار میں داخل ہو گا۔ اختلافِ مسلک کے آغاز میں تو ان دونوں تصوّرات کا باہمی فرق نمایاں طور پر واضح نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ دونوں حالتوں میں لازمًا اسلام کو جنگاہ میں اُترنا پڑے گا لیکن منزل پر

پہنچ جانے کے بعد معلوم ہوگا کہ دونوں تصوروں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسلام کے بارے میں دونوں کے احساسات و جذبات میں اور خیالات و تصوّرات میں بڑا بنیادی اور نازک سا فرق ہے۔

اس خیال میں کہ اسلام الٰہی نظام حیات ہے اور اس خیال میں کہ وہ ایک علاقائی نظام ہے بہت بڑا اور غیر معمولی فرق ہے۔ اول الذکر خیال کے مطابق اسلام دنیا میں اس لیے آیا ہے کہ وہ خدا کی زمین پر خدا کی حکومت کا اعلان کرے، اور تمام انسانوں کو ایک اِلٰہ کی بندگی کی دعوت دے، اور اپنے اعلان اور دعوت کو عملی سانچے میں ڈھالے، اور پھر ایک ایسا معاشرہ تیار کرے جس میں انسان انسانوں کی بندگی سے آزاد ہوں اور بندگیٔ رب پر جمع ہوں، ان پر صرف شریعت الٰہی جو اللہ کے بالاتر اقتدار کی نمائندگی کرتی ہے حکمراں ہو۔ صرف اسی اسلام کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اُن تمام موانع کو زائل کرے جو اس کے راستے میں حائل ہوں، تاکہ وہ ریاست کے سیاسی نظام یا انسانوں کی خود ساختہ معاشرتی روایات کی دیواروں کو ڈھانے کے بعد افراد کے عقل و وجدان سے آزادانہ اپیل کر سکے ——— ثانی الذکر خیال کی رُو سے اسلام محض ایک وطنی نظام ہے اور اُسے صرف اتنا حق حاصل ہے کہ اس کی علاقائی حدود پر جب کوئی طاقت حملہ کرے تو وہ اپنا دفاع کرے۔ اب یہ دونوں تصوّر آپ کے سامنے ہیں۔ بے شک اسلام دونوں حالتوں میں جہاد

کو قائم کرتا ہے، لیکن دونوں حالتوں میں جہاد کے محرکات، جہاد کے مقاصد اور جہاد کے نتائج سے جو دو عملی تصویریں بنتی ہیں وہ ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہیں۔ فکر و نظر کے لحاظ سے بھی اور منصوبہ و رجحان کے اعتبار سے بھی۔

بے شک اسلام کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ابتداء ہی پیش قدمی سے کرے۔ اسلام کسی قوم یا وطن کی میراث نہیں ہے۔ یہ خدا کا دین ہے اور تمام دنیا کے لیے ہے۔ اسے یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ ان موانع کو پاش پاش کر دے جو روایات اور نظاموں کی شکل میں پائے جاتے ہیں اور جو انسان کی آزادیٔ انتخاب کو پابندِ سلاسل کرتے ہیں۔ وہ افراد پر حملہ نہیں کرتا اور نہ ان پر اپنا عقیدہ زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے، وہ صرف حالات و نظریات سے تعرض کرتا ہے تاکہ افرادِ انسانی کو اُن فاسد اور زہریلے اثرات سے بچائے جنہوں نے اُن کی فطرت کو مسخ کر دیا ہے اور ان کی آزادی انتخاب کو پامال کر رکھا ہے۔

اسلام اپنے اس حق سے بھی کسی طور دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں کہ وہ انسانوں کو بندوں کی آقائی سے نکال کر صرف ایک خدا کی بندگی پر جمع کرے۔ تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور انسانوں کی آزادی کامل کی تحریک کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔ تصوّر اسلامی اور امرِ واقع / دونوں کے نقطۂ نظر سے اللہ تعالیٰ کی بندگی اپنی پوری شان سے صرف اسلامی نظام ہی کے سائے میں رُوبعمل آ سکتی ہے۔ اسلامی نظام ہی ایک ایسا منفرد نظام

ہے جس میں تمام انسانوں کا خواہ وہ حاکم ہوں یا محکوم ، کالے ہوں یا گورے ، غریب ہوں یا امیر ، قریب کے ہوں یا دُور کے ، صرف اللہ تعالیٰ ہی قانون ساز ہوتا ہے ، اور اس کا قانون سب کے لیے برابر ہوتا ہے اور سب انسان یکساں طور پر اُس کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں ۔ رہے دوسرے نظام ہائے حیات تو ان میں انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کی بندگی کرتے ہیں ، اور وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی گھڑی ہوئی شریعت کی اطاعت کرتے ہیں ۔ شریعت سازی الوہیت کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے ۔ جو انسان یہ دعویٰ کرے کہ انسانوں کے لیے حسبِ منشا قانون بنانے کا اُسے اختیار ہے تو بالفاظ دیگر اس کے دعوے کا مطلب یہ ہے کہ وہ الوہیت کا مدعی ہے ، خواہ وہ زبان سے الوہیت کا دعویٰ کرے یا نہ کرے ۔ جو شخص ایسے مدّعی کا یہ حق ——— یعنی آزادانہ قانون سازی کا حق ——— تسلیم کرے گویا اُس نے اس کے حق الوہیت کو تسلیم کیا چاہے وہ اسے الوہیت کا نام دے یا اس کے لیے کچھ دوسرے نام اور اصطلاحیں تجویز کرنا پھرے ۔

اسلام محض عقیدہ و نکر کا نام نہیں ہے کہ وہ لوگوں تک محض وعظ و بیان کے ذریعے اپنا پیغام پہنچا دینے پر اکتفاء کرلے ۔ اسلام ایک طریقِ زندگی ہے جو منظم تحریک کی صورت میں انسان کی آزادی کے لیے عملی اقدام کرتا ہے ۔ غیر اسلامی معاشرے اور نظام ہائے حیات اُسے یہ موقع نہیں دیتے کہ وہ اپنے

نام لیواؤں کو اپنے طریقِ کار کے تحت منظم کر سکے۔ اس لیے اسلام کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے نظاموں کو، جو انسان کی آزادیٔ کامل کے لیے سدِّ راہ بن رہے ہوں، ختم کرے۔ صرف اسی صورت میں دین پورے کا پورا اللہ کے لیے قائم ہو سکتا ہے۔ پھر نہ کسی انسان کا اقتدار باقی رہیگا اور نہ کسی انسان کی بندگی کا سوال پیدا ہوگا جیسا کہ دوسرے نظامہائے زندگی کا حال ہے جو انسان کی آقائی اور انسان کی بندگی پر اپنی عمارت قائم کرتے ہیں۔

اسلام میں مغرب کے تصوّرِ جہاد کی گنجائش نہیں

ہمارے وہ معاصر مسلمان محقق جو حالاتِ حاضرہ کے دباؤ اور مستشرقین کی مکّارانہ تنقیدوں سے مرعوب ہیں وہ اسلام کی مذکورہ بالا حقیقت کے اظہار رد اثبات کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ مستشرقین نے اسلام کی جو تصویر بنائی ہے اُس میں اسلام کو ایک خون آشام تحریک کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، جو شمشیر بدست انسانوں پر اپنے عقاید و نظریات ٹھونستی پھرتی ہے۔ یہ بدطینت مستشرقین خوب جانتے ہیں کہ اسلام اس تصوّر سے قطعًا پاک ہے۔ لیکن اس ہتھکنڈے سے کام لے کر دراصل وہ اسلامی جہاد کے اصل محرّکات و اسباب کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ہمارے مسلمان محققین ــــــــ یہی شکست خوردہ محققین ــــــــ اسلام کی پیشانی سے اس "داغ" کو دھونے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ایسے دلائل کی تلاش میں لگ جاتے ہیں جن سے وہ یہ ثابت کر سکیں کہ اسلام میں جہاد سے مراد صرف "مدافعانہ جنگ" ہے۔ حالانکہ یہ

لوگ اسلام کی فطرت اور اس کے اصل کارنامے سے قطعاً نابلد ہیں ، انہیں یہ تک معلوم نہیں ہے کہ اسلام ——— ایک عالمی اور انسانی مذہب ——— کا یہ ناگزیر حق ہے کہ وہ انسانوں کی آزادی کے لیے خود اقدام کرے ۔ عصرِ حاضر کے ان مرعوب و ہزیمت خوردہ اربابِ تحقیق کے ذہنوں پر دین کا وہ تصوّر غالب ہے جو اصلاً مغرب کا تصور مذہب ہے ۔ مغربی تصوّر کے لحاظ سے دین محض ایک عقیدہ کا نام ہے ، اس کا مقام ضمیر ہے ، زندگی کے عملی نظام سے اُسے کوئی واسطہ نہیں ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ دین کے نام پر جب کوئی جنگ لڑی جاتی ہے ، تو اہلِ مغرب کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ دوسروں پر اپنا عقیدہ اور نظریہ جنگ کے ذریعے زبردستی ٹھونسنا چاہتے ہیں ۔

لیکن اسلام میں دین کا یہ تصوّر کبھی نہیں رہا ، اور نہ اس تصوّر کے تحت اس نے کبھی علم جہاد بلند کیا ہے ۔ اسلام انسانی زندگی کا خدائی نظام ہے ۔ جو صرف اللہ تعالےٰ کی بندگی کا قائل ہے ، اس کے نزدیک الوہیت کا صحیح مظہر حاکمیت خدا ہے ، اسی طرح یہ نظام انسان کی عملی زندگی کے بڑے سے بڑے مسائل سے لے کر روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے معاملات کی مکمّل تنظیم کرتا ہے ۔ اُس کا نظامِ جہاد دراصل اس خدائی نظام کو برپا کرنے اور اسے غالب کرنے کی کوشش ہی کا دوسرا نام ہے ۔ رہا عقیدہ کا معاملہ تو ظاہر ہے کہ اُس کا تعلق آزادئ رائے سے ہے ، اسلام چاہتا ہے کہ انسانی رائے

کو متاثر کرنے کی راہ میں حائل ہونے والی تمام رکاوٹیں دُور ہوں، اور ہمہ پہلو اسلام کا نظام غالب ہو جائے، فرد کو ہر قسم کے عقیدہ اور نظریہ کے ردّ و قبول کی آزادی ہو، اور وہ اپنی آزاد مرضی سے جو عقیدہ چاہے اختیار کر سکے۔ ظاہر ہے کہ دین کا یہ نقشہ اُس نقشے سے اپنے اساسی نظریات اور تفصیل دونوں کے لحاظ سے سر تا پا مختلف ہے جو مغرب نے پیش کیا ہے۔

چنانچہ جہاں کہیں ایسا اسلامی معاشرہ پایا جاتا ہے جو الٰہی نظام حیات کی عملی تفسیر و تعبیر ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اقدام کرے اور آگے بڑھ کر اقتدار کی زمام ہاتھ میں سنبھال لے اور جدیدۂ عالم پر الٰہی نظام حیات کا نقش ثبت کر دے۔ البتہ عقیدہ اور ایمان کے مسئلے کو وہ انسان کے وجدان اور آزاد رائے پر چھوڑ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے امّت مسلمہ کو ایک معین عرصہ تک اگر جہاد سے روکا تھا تو یہ منصوبہ بندی کے طور پر تھا۔ نہ کہ کسی اصول و ضابطے کی تعلیم تھی۔ یہ تحریک کے ایک خاص مرحلے کی ضروریات کا مسئلہ تھا، نہ کہ اسلام کے بنیادی عقیدہ اور نظریہ کا مسئلہ۔ اسی واضح بنیاد کی روشنی میں ہمیں قرآن مجید کی بکثرت ایسی آیات کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے جن کا تعلق تحریک کے بدلتے ہوئے مراحل سے رہا ہے۔ ان آیات کو پڑھتے وقت ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ ان کا ایک مفہوم وہ ہے جو اس مرحلے کے ساتھ وابستہ ہے جس میں یہ نازل ہوئی تھیں، اور دوسرا ان کا عمومی مفہوم ہے جس کا تعلق

اسلامی تحریک کی ناقابل تغیّر اور ابدی شاہراہِ حیات سے ہے۔ ہمیں ان دونوں حقیقتوں کو کبھی گڈمڈ نہ کرنا چاہیئے۔

بابِ پنجم

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ:

اِسلام کا نظامِ حیات

اِسلامی نظامِ زندگی کی اساس

"لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے) اسلامی عقیدہ کے رکن اول ——— یعنی کلمہ شہادت ——— کا پہلا جزو ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ بندگی و عبادت کے لائق صرف ایک اللہ ہے۔ "محمد رسول اللہ" اس کا دوسرا جزو ہے اور اس میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اس بندگی کی کیفیت اور اس کا طریقہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے حاصل کیا جائیگا۔ مومن اور مسلم کا دل وہ دل ہے جس کی گہرائیوں میں یہ کلمہ اپنے ان دونوں

اجزا سمیت پوری طرح جاگزیں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں شہادتوں کے بعد ایمان کے جتنے ستون اور اور اسلام کے جتنے ارکان ہیں وہ دراصل ان شہادتوں ہی کے تقاضے میں پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ملائکہ پر ایمان، اللہ کی کتابوں پر ایمان، اللہ کے رسولوں پر ایمان، آخرت پر ایمان، تقدیر خیر وشر پر ایمان، اسی طرح نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج، اور پھر حدود، تعزیرات، حلال وحرام، معاملات، قوانین، اسلامی ہدایات وتعلیمات ان سب کی اساس اللہ کی عبودیت پر استوار ہوتی ہے۔ اور ان سب کا منبع وہ تعلیم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی طرف سے ہم تک پہنچائی ہے۔

اسلامی معاشرہ وہ معاشرہ ہے جو کلمہ شہادت اور اس کے تمام تقاضوں کی عملی تفسیر ہو۔ اگر یہ کلمہ اور اس کے تقاضوں کی کوئی جھلک معاشرے کی عملی زندگی میں نہ پائی جاتی ہو تو وہ اسلامی معاشرہ نہیں ہے۔ گویا کلمہ شہادت (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ) ایک ایسے مکمّل نظام کی بنیاد ٹھیرتا ہے جس پر امّت مسلمہ کی زندگی اپنی تمام تفصیلات اور ضروریات سمیت تعمیر ہوتی ہے۔ اس بنیاد کے قیام سے پہلے زندگی کی تعمیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر اس بنیاد کے ماسوا کسی اور بنیاد پر زندگی کی عمارت اٹھائی جائے یا اس بنیاد کے ساتھ کسی اور بنیاد کو یا متعدد خارجی بنیادوں کو بھی شامل کر کے

زندگی کی تعمیر کی کوشش کی جائے تو ان کے نتیجے میں قائم ہونے والے معاشرے کو اسلامی زندگی کا نمائندہ کسی طرح بھی نہیں کہا جا سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ، أَمَرَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۔ (یوسف : ۴۰)

حکم صرف اللہ کا ہے۔ اُس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کی جائے۔ یہی دینِ قیّم (ٹھیٹھ اور سیدھا طریقِ زندگی) ہے۔

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۔

(النساء : ۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔

یہ مختصر، اصولی اور فیصلہ کن بیان دینِ حق اور اس کی عملی تحریک سے تعلق رکھنے والے بنیادی مسائل کے بارے میں دو ٹوک فیصلہ کرنے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اوّلاً: یہ "مسلم معاشرے کی فطرت" کے تعیّن میں ہماری رہنمائی کرتا ہے، ثانیاً: "مسلم معاشرے کے طریقۂ تعمیر" کی نشاندہی میں ہمیں اس سے مدد ملتی ہے، اور ثالثاً: ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اسلام نے جاہلی معاشروں کے ساتھ نبٹنے کے لیے کیا طریقِ کار تجویز کیا ہے۔ اور رابعاً: وہ یہ تعین کرتا ہے کہ انسانی زندگی کی عملی صورتِ حال کو بدلنے کے لیے اسلام کا ضابطۂ کار کیا ہے۔ یہ تمام مسائل وہ ہیں جو قدیم زمانے سے لے کر آج تک اسلامی تحریک کے نظامِ کار میں نہ صرف اساسی اہمیت کے

حائل رہے ہیں بلکہ بڑے نازک اور فیصلہ کن سمجھے جاتے رہے ہیں۔

اسلامی معاشرے کا امتیازی وصف

مسلم معاشرے کا امتیازی وصف یہ ہے کہ یہ معاشرہ اپنے تمام معاملاتِ زندگی میں صرف اللہ کی عبودیت کی اساس پر قائم ہوتا ہے۔ کلمۂ شہادت (لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ) اسی عبودیت کا اظہار کرتا ہے اور اس کی کیفیت متعین کرتا ہے۔ انسان کا اعتقاد بھی اس عبودیت کا مظہر ہوتا ہے، عبادات و شعائر میں بھی اسی عبودیت کا پرتو پایا جاتا ہے، قوانین و ضوابط اس کی عملی تصویر ہوتے ہیں۔ جو شخص اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی وحدانیت میں یقین نہیں رکھتا تو اُس نے دراصل صرف ایک اللہ کی بندگی اختیار ہی نہ کی:

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ۔ (النحل: ۵۱-۵۲)

اور اللہ کا فرمان ہے کہ دو خدا نہ بنا لو، خدا تو بس ایک ہی ہے لہذا تم مجھی سے ڈرو، اُسی کا ہے وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور خالصًا اُسی کا دین (کائنات میں) چل رہا ہے۔ پھر کیا اللہ کو چھوڑ کسی اور سے تقویٰ کرو گے۔

اسی طرح جو شخص اللہ کے سوا کسی اور ہستی کے آگے یا اللہ کے ساتھ کسی اور ذات کو شریک کر کے عبادات و شعائر بجا لاتا ہے وہ بھی خدائے واحد کا بندہ نہیں

ہو سکتا:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ (انعام: ۱۶۲ : ۱۶۳)

کہہ دیجیے میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔

اسی طرح جو شخص ان قوانین کو چھوڑ کر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو دیے ہیں کسی اور منبع سے قوانین کو اخذ کرتا ہے تو وہ بھی اللہ کی بندگی خالص سے محروم ہے:

اَمْ لَہُمْ شُرَکٰٓؤُا شَرَعُوْا لَہُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا لَمْ یَاْذَنْۢ بِہِ اللّٰہُ (شوریٰ: ۲۱)

کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریک خدا رکھتے ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا۔

وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَہٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَہُوْا۔ (حشر: ۷)

جو کچھ رسول تمہیں دے اُسے پکڑ لو اور جس چیز سے روکے

اُس سے رُک جاؤ۔

یہ ہیں اسلامی معاشرے کی اقدار اصلی۔ اس معاشرے میں جس طرح افراد کے معتقدات و تصوّرات میں بندگیٔ رب رچی بسی ہوتی ہے، اسی طرح ان کی عبادات اور شعائر و مناسک پر بھی بندگیٔ خالص کا رنگ چڑھا ہوتا ہے اور ان کا جماعتی نظام اور قوانین و ضوابط بھی بندگیٔ رب کے عملی پیکر ہوتے ہیں۔ ان پہلوؤں میں سے ایک پہلو میں بھی اگر بندگی کا رنگ معدوم ہو تو پورے کا پورا اسلام کالعدم ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس طرح اسلام کا رکن اوّل، کلمہ شہادت، جس پر اسلام کی بنیاد ہے سرے سے وجود پذیر ہی نہیں ہو سکتا۔

اوپر ہم نے یہ عرض کیا ہے کہ اسلامی معاشرے کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے افراد کے اعتقادات بھی اسی جذبۂ عبودیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتا دیا جائے کہ اسلامی اعتقاد کیا ہے؟

اسلامی اعتقاد کیا ہے؟

"اسلامی اعتقاد" کس چیز کا نام ہے، دراصل یہ ایک ایسا اعتقاد اور تصوّر ہے جس کا پودا انسان کے شعور و ادراک میں اس وقت پھوٹتا ہے جب وہ عقیدۂ اسلام کے حقائق و رموز کو براہ راست ربانی سرچشمۂ ہدایت (قرآن)، سے اخذ کرتا ہے۔ اور جب اس تصوّر اور اعتقاد کا نقش پُوری طرح انسان کے ذہن پر مُرتسم ہو جاتا ہے تو پھر اُسے اپنے رب کی حقیقت کا عرفان حاصل ہوتا ہے، جس کائنات میں وہ سانس لے رہا ہوتا ہے اُس کی خفی اور جلی حقیقتیں بھی اُسی وقت اُس پر منکشف ہوتی ہیں، جس زندگی کی بدولت وہ زندہ انسانوں

میں شمار ہوتا اور ان کے ساتھ مربوط ہوتا ہے اُس کے پنہاں اور عیاں حقائق بھی اُس پر روشن ہو جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی عرفانِ ذات بھی اسے نصیب ہوتا ہے۔ یعنی وہ خود انسان کی اصلیت سے باخبر ہو جاتا ہے۔ پھر اسی تصوّر کی بنیاد پر وہ تمام حقائق کے ساتھ اپنے معاملات کی کیفیت متعین کرتا ہے۔ اپنے پروردگار کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کرتا ہے جس میں اس کی عبودیت اور بندگی کے نور کا پرتو ہو، کائنات اور کائنات کے قوانین و نوامیس، ذی روح مخلوقات، نوعِ انسانی اور اس کے مختلف اداروں کے بارے میں وہ ایسا رویّہ اختیار کرتا ہے جس کی جڑیں اللہ کے دین میں پیوست ہوتی ہیں اور اُس تعلیم سے ماخوذ ہوتی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسانوں تک پہنچی ہے۔ اس طرح وہ اپنے پورے رویۂ زندگی کے اندر اللہ کی عبودیت و بندگی کا اظہار کرتا ہے، اور یوں اس کی زندگی کی تمام سرگرمیوں پر اسی پاکیزہ روش کی مُہر ثبت ہوتی جاتی ہے۔

اسلامی معاشرہ کو وجود میں لانے کا طریقِ کار

مسلم معاشرے کے حدودِ اربعہ متعین ہو جانے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نوعیت کا معاشرہ کیسے وجود میں آتا ہے؟ اور اس کی تعمیر کا طریقِ کار کیا ہے؟

یہ معاشرہ اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتا جب تک پہلے ایک ایسا انسانی گروہ ظہور پذیر نہ ہو جو یہ فیصلہ کر چکا ہو کہ اس کی بندگی اور عبودیت تمام کی تمام صرف اللہ کے لیے مخصوص ہو گی، اور وہ اللہ کی بندگی کے ساتھ کسی اور ہستی

کی بندگی کی شرکت گوارا نہیں کرے گا، نہ عقیدہ و تصور کے لحاظ سے غیر اللہ کی بندگی کو قبول کیا جائے گا، نہ عبادات و شعائر میں غیر اللہ کی اطاعت کو دخل اندازی کا موقعہ دیا جائے گا، اور نہ قوانین اور نظام زندگی کے اندر غیر اللہ کی بندگی کا کوئی شائبہ برداشت کیا جائے گا۔ اس فیصلہ کے بعد یہ گروہ انسانی بالفعل اپنی زندگی کو اللہ کی عبودیت خالصہ کی بنیاد پر منظم کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اپنے ضمیر اور دل کی دنیا سے وہ ان تمام اعتقادات و تصورات کو کھرچ دیتا ہے جو غیر اللہ کی الوہیت کے قائل یا اللہ کی الوہیت میں کسی اور کو بھی شریک ٹھیراتے ہیں۔ اس معاشرے کی تمام مراسم عبادات ایک اللہ کے لیے مخصوص ہو جاتے ہیں اور اس کے سوا باقی سب سے اس کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے مثالی اسلامی معاشرے کے تمام قوانین کا ماخذ صرف خدا کی ذات ہوتی ہے، اور ان الٰہی قوانین میں وہ کسی اور قانون کی آمیزش کو گوارا نہیں کرتا۔

یہی وہ رویّہ ہے، جس کو اختیار کرنے کے بعد یہ جماعت صحیح معنوں میں مسلم جماعت کہلائے گی اور جو معاشرہ یہ جماعت منظم کرے گی اُسے "مسلم معاشرہ" کہا جا سکے گا۔ کوئی انسانی جماعت اس طرز پر جو ہم نے اوپر بیان کی ہے اللہ کی خالص عبودیت کا اقرار کرنے سے قبل مسلم جماعت نہیں شمار ہو سکتی، اور نہ عبودیت کی اساس پر اپنے نظامِ حیات کو استوار اور منظم کرنے سے قبل اُس کا قائم کردہ معاشرہ "مسلم معاشرہ" قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ اوّلین بنیاد جس پر اسلام کی عمارت قائم ہوتی ہے اور مسلم معاشرہ تشکیل پاتا ہے یعنی "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی شہادت،

وہ اپنے دونوں اجزاء سمیت قائم نہیں ہوتی ہے۔

اس لیے قبل اس کے کہ اسلام کے اجتماعی نظام کو قائم کرنے کے بارے میں سوچ بچار کیا جائے اور اس نظام کی اساس پر ایک مسلم معاشرے کے قیام کی تدبیریں تلاش کی جائیں، ضروری ہے کہ اوّلین توجہ افراد کے قلب و ضمیر کو غیر اللہ کی بندگی کی تمام صورتوں سے پاک کرنے پر صرف کی جائے۔ اور جن لوگوں کے قلوب و اذہان غیر اللہ کی بندگی سے پوری طرح پاک صاف ہوتے جائیں وہ سب مل کر ایک جماعت بنائیں، یہی جماعت جس کے افراد اپنے اعتقادات و تصوّرات کے لحاظ سے، مراسم عبادت کے لحاظ سے اور شریعت و قانون کے لحاظ سے غیر اللہ کی بندگی سے پوری طرح آزاد ہوں، اسلامی معاشرے کی داغ بیل ڈال سکتی ہے، اور جو شخص بھی اسلامی معاشرہ میں زندگی بسر کرنا چاہے گا وہ اس میں شامل ہوتا جائے گا، اور اُسے اس کا عقیدہ اُس کی عبادات اور اُس کا وہ قانون اختیار کرنا ہوگا جس میں اللہ کی عبودیت خالص کے سوا کسی اور چیز کا شائبہ تک نہ ہوگا یا دوسرے لفظوں میں وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی قولی شہادت کی عملی تصویر ہوگا۔ یہی وہ نہج ہے جس کے مطابق دنیا کی پہلی اسلامی جماعت کی تشکیل ہوئی اور پہلا اسلامی معاشرہ منصۂ شہود پر آیا۔ آئندہ بھی صرف اسی نہج پر اسلامی جماعت کی نشو و نما ہوسکتی ہے اور اسلامی معاشرہ پھل پھول سکتا ہے۔

اسلامی معاشرہ اسی صورت میں آشنائے وجود ہوسکتا ہے کہ انسانی افراد اور گروہ اللہ کے ماسوا ہر ہستی کو ——— چاہے وہ مستقل بالذات ہو یا

اللہ کی شریک ہو ———— ٹھکرا کر صرف خدائے واحد و لاشریک کی بندگی کو اپنائیں، اور مستقل طور پر یہ طے کر لیں کہ وہ اپنا نظامِ زندگی اللہ کی بندگی پر استوار کریں گے، ———— اسی اجتماع اور فیصلہ سے ایک نیا معاشرہ جنم لے گا جو اگرچہ قدیم جاہلی معاشرہ ہی کے اندر سے برآمد ہو گا، مگر اپنے نئے عقیدہ و فکر اور نئے نظامِ زندگی کی بدولت فرسودہ جاہلی معاشرے کے لیے ایک چیلنج ثابت ہو گا۔ یہ نیا نظامِ زندگی اسلام کے رُکنِ اوّل: توحید، اور رسالتِ محمدیؐ ———— (لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ) کے نورِ ازلی کی جلوہ گاہ ہو گا!!

عین ممکن ہے کہ قدیم جاہلی معاشرہ کلیتہً نئے اسلامی معاشرے میں مدغم ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو۔ یہ بات بھی خارج از امکان نہیں کہ جاہلی معاشرہ مسلم معاشرے کے ساتھ مصالحت کرنے کی کوشش کرے۔ اسی طرح مسلم معاشرے کے خلاف جاہلیت کا ردِّ عمل مسلح تصادم کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔ ویسے اس باب میں سنّتِ الٰہی تو یہی چلی آ رہی ہے کہ جاہلی معاشرہ ہی اسلام پر شب خون مارتا ہے۔ کبھی اُس نے جیشِ اسلام کے اُس ہراول دستے پر چڑھائی کی، جو اسلامی معاشرے کی داغ بیل ہی سے ابھی فارغ نہ ہوا تھا، اور متفرق افراد اور گروہوں کی شکل میں بٹا ہوا تھا۔ اور کبھی اس نے اسلامی معاشرہ کے قیام کے بعد اُس پر چڑھائی کی۔ حضرت نوح علیہ السّلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک بلا استثناء اسلامی دعوت کی پوری تاریخ میں یہی صورتِ حال پیش آتی رہی ہے۔

یہ ایک واضح اور طبعی حقیقت ہے کہ نیا اسلامی معاشرہ اس وقت تک نہ تعمیر کے کسی مرحلے کو طے کر سکتا ہے اور نہ اپنے وجود کو منوا سکتا ہے، جب تک وہ اس درجہ قوّت حاصل نہ کرے کہ اس کے بل پر قدیم جاہلی معاشرے کے دباؤ کا بآسانی مقابلہ کر سکے۔ یہی نہیں بلکہ یہ قوّت ہمہ جہتی اور ہمہ گیر بھی ہونی چاہیئے۔ اعتقاد اور تصوّر کی قوّت، اخلاق اور نفسیاتی تربیّت کی قوّت، تنظیم کی قوّت اور جماعتی نظام کی قوّت، اور وہ ساری قوّتیں جن کی مدد سے وہ جاہلی معاشرے کا مقابلہ کر سکے، اور اُس پر اگر غلبہ حاصل نہ کر سکے تو کم از کم اُس کے سامنے ڈٹا رہے اور کسی طرح کی ہزیمت کا شکار نہ ہو۔

جاہلی معاشرے کی خصوصیات

اب آیئے یہ دیکھیں کہ "جاہلی معاشرہ" کی حقیقت کیا ہے اور اسلام اُس کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا طریقِ کار اختیار کرتا ہے؟

مختصر لفظوں میں اسلام کی نظر میں مسلم معاشرہ کے سوا ہر دوسرا معاشرہ جاہلی معاشرہ ہے۔ اگر ہم اس کی صحیح منطقی تعریف کرنا چاہیں تو یُوں کہہ سکتے ہیں کہ: ہر وہ معاشرہ جو اپنی بندگی کو خواہ وہ اعتقاد و تصوّر میں ہو، مراسمِ عبادت میں یا قانونی نظام میں صرف اللہ کے لیے خالص نہیں کرتا، وہ جاہلی معاشرہ کہلائے گا۔ اس تعریف کی رُو سے آج دنیا میں جتنے معاشرے پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب "جاہلی معاشرے" ہیں۔

کمیونسٹ معاشرے اس سلسلے میں سرِفہرست ہیں۔ اوّلاً اس بنا پر کہ انہوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات برتر کے متعلق الحاد کی روش اختیار کر رکھی

ہے اور خدا کی ہستی کے سرے سے منکر ہیں۔ اور اس نظریہ کے علمبردار ہیں کہ اس کائنات کا خالق اور علّت مادہ یا نیچر ہے، اور انسان اور اس کی تاریخ کا خالق اور محرّک اقتصاد یا آلاتِ پیداوار ہیں۔ ثانیاً: اس بنا پر کہ جو نظامِ زندگی وہ قائم کرتے ہیں اُس میں بندگی کا حق اللہ تعالیٰ کو نہیں بلکہ کمیونسٹ پارٹی کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کی دلیل وہ اقتدار اور پیشوائی ہے، جو کمیونسٹ ملکوں میں بالفعل کمیونسٹ پارٹی کو حاصل ہوتی ہے۔ مزید برآں کمیونزم کے ان تصوّرات اور اس نظام کے جو نتائج عملاً مترتب ہوتے ہیں وہ بھی ایک "جاہلی معاشرہ" ہی کے رنگ ڈھنگ ہیں۔ مثلاً انہی تصوّرات کا یہ شاخسانہ ہے کہ انسان کے "بنیادی مطالبات" صرف وہی سمجھے جاتے ہیں جو حیوان کے مطالبات ہوتے ہیں۔ یعنی کھانا پینا، لباس، مکان اور جنسی تسکین۔ انسان کو ایک جانور سمجھنے کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بحیثیت انسان اس میں جو اعلیٰ اخلاقی اوصاف پائے جاتے ہیں، انہیں پوری طرح پامال کیا جاتا ہے۔ اور ان تمام ضروریات اور تقاضوں سے اُسے محروم کر دیا جاتا ہے جو "انسانی روح" کا لازمہ ہیں اور انسان کو حیوان سے متمیز کرتی ہیں۔ ان ضروریات اور تقاضوں میں سرفہرست اللہ پر ایمان، اس ایمان کو اختیار کرنے کی کھلی آزادی اور اس کے اظہار و اعلان کا غیر مشروط حق ہے۔ اسی طرح انسان کے لیے اظہارِ "انا" کی آزادی بھی انسانیت کی خاص خصوصیت ہے۔ یہ انا گوناگوں رُوپوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ انفرادی ملکیّت میں اسی انا کا ظہور ہوتا ہے۔ نوعیّت کار کے انتخاب اور اس میں خصوصی

مہارت پیدا کرنے میں بھی اسی کو دخل ہوتا ہے ، فن کے ذریعہ شخصیت کے اظہار میں بھی اس کا اضطراب کارفرما ہوتا ہے ۔ علی ہذا القیاس اشتراکی نظام ہر اس آزادی سے انسان کے لیے پیغام حرمان نصیبی لے کر آتا ہے جو انسان اور حیوان اور انسان اور مشین کے درمیان مابہ الامتیاز ہے ۔

تمام بُت پرست اور مشرک معاشرے بھی جاہلی معاشروں کی صف میں شامل ہیں ۔ اس نوعیت کے معاشرے آج تک ہندوستان ، جاپان ، فلپائن اور افریقہ میں پائے جاتے ہیں ۔ جو بات انہیں جاہلی معاشروں میں داخل کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اوّلاً ؛ یہ معاشرے اللہ کے ماسوا کچھ اور ہستیوں کی صفت الوہیت میں اعتقاد رکھتے ہیں یا الوہیت میں اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں ۔ ثانیاً ؛ انہوں نے طرح طرح کے دیوتا اور معبود تراش رکھے ہیں جن کے بارے میں وہ نہ صرف الوہیت کا عقیدہ رکھتے ہیں بلکہ اُن کے سامنے عملاً مراسم عبودیت و نیاز مندی بھی بجا لاتے ہیں ۔ یہ بات بھی ان معاشروں کو جاہلی معاشرہ ٹھہرانے کے لیے کافی ہے کہ ان میں جو قوانین اور شرائع نافذ کیے جاتے ہیں اُن کا منبع و ماخذ بھی خدا اور اس کی شریعت نہیں بلکہ دوسری ہستیاں ہوتی ہیں ، خواہ وہ پادری ہوں یا کاہن پروہت ہوں یا جادوگر ہوں ، اکابر قوم ہوں یا وہ سیکولر ادارے ہوں جو شریعت الٰہی سے بے نیاز ہو کر قانون سازی کرتے ہیں ، اور جنہیں قوم ، پارٹی یا کسی ہستی کے نام پر حاکمیت اعلیٰ کا منصب حاصل ہوتا ہے ، حالانکہ حاکمیت اعلیٰ کا منصب خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے ۔ اور اُسے صرف اسی شکل میں بروئے کار لایا جا سکتا ہے جو خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعے

اپنے بندوں کے لیے پسند فرمائی ہے:

روئے زمین پر پائے جانے والے تمام یہودی اور عیسائی معاشرے بھی جاہلی معاشرے ہیں۔ انہوں نے اپنے عقائد میں تحریف کر رکھی ہے اور الوہیت کو صرف اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت قرار دینے کے بجائے دوسروں کو بھی اُس میں شریک ٹھیراتے ہیں۔ اس شرک نے کئی صورتیں اختیار کر رکھی ہیں۔ کہیں یہ ابنیت کی شکل میں ہے اور کہیں تثلیث کی شکل میں۔ کہیں اس نے اللہ کے بارے میں ایسا تصوّر قائم کر رکھا ہے جو اللہ کی حقیقت کے منافی ہے۔ کہیں اُس نے مخلوق کے ساتھ اللہ کے تعلق کو ایسا رنگ دے رکھا ہے جو سراسر خلافِ حق ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرُ ابْنُ اللهِ، وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللهِ، ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ، يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ۔ قَاتَلَهُمُ اللهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۔

(توبہ: ۳۰)

یہودی کہتے ہیں عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں اُن لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے۔ خدا کی مار ان پر یہ کہاں سے دھوکا کھا رہے ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللهَ ثَالِثُ

ثَلٰثَةٍ م وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَاِنْ
لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (مائدہ : ۷۳)

یقیناً کفر کیا اُن لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے، حالاں کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی اِن باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے اُس کو دردناک سزا دی جائے گی۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ
اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتَانِ
يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ (مائدہ : ۶۴)

یہودی کہتے ہیں اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، باندھے گئے ان کے ہاتھ اور لعنت پڑی اِن پر اُس بکواس کی بدولت جو یہ کرتے ہیں، اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا
اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ، قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ بَلْ
اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ۔ (مائدہ : ۱۸)

یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ ان سے پوچھو پھر وہ تمہارے گناہوں پر تمہیں سزا

کیوں دیتا ہے۔ درحقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان خدا نے پیدا کیے ہیں۔

یہ معاشرے اس لیے بھی جاہلی ہیں کہ انہوں نے اپنے لیے عبودیت کے جو مراسم اور پرستش کی جو شکلیں وضع کر رکھی ہیں وہ ان کے گمراہانہ عقائد اور مشرکانہ تصوّرات سے ماخوذ ہیں۔ اور اس لیے بھی یہ جاہلی معاشرے ہیں کہ ان کے تمام قوانین و شرائع بندگیٔ رب کی اساس پر قائم نہیں ہیں، نہ وہ خدا کی بے ہمتا حاکمیت کا اقرار کرتے ہیں اور نہ خدا کی شریعت کو اختیارات کی واحد اساس تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے انسانوں پر مشتمل ایسے ادارے قائم کر رکھے ہیں جنہوں نے حاکمیتِ اعلیٰ کے اُس منصب و مقام پر قبضہ جما رکھا ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ قرآن نے اپنے نزول کے دور میں ایسے لوگوں کو مشرک اور کافر کا لقب دیا تھا۔ کیونکہ ان لوگوں نے حاکمیت کا یہی حق اپنے احبار و رہبان کو دے رکھا تھا، جو من مانی شریعت وضع کرتے تھے اور یہ لوگ اسے بے چون و چرا قبول کرتے تھے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ، وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔ (توبہ : ۳۱)

انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے اور اسی طرح مسیح ابنِ مریم کو بھی حالانکہ ان کو

ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں ہے، پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

یہ لوگ اپنے احبار و رہبان کی الوہیت کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے اور نہ اُن کے سامنے مراسم بندگی بجالاتے تھے۔ بلکہ وہ فقط یہ تسلیم کرتے تھے کہ احبار و رہبان کو حاکمیت کا مقام حاصل ہے۔ چنانچہ وہ اللہ کے اذن و حکم سے بے نیاز ہو کر جو شریعت سازی کرتے تھے یہ لوگ اُسے اختیار کر لیتے تھے۔ اگر اُس وقت قرآن نے انہیں مشرک اور کافر کہہ کر پکارا تھا تو آج تو بدرجہ اولیٰ ان کا مشرک اور کافر ہونا ثابت ہے۔ اس لیے کہ آج انہوں نے جن لوگوں کو یہ حق دے رکھا ہے وہ احبار اور رہبان نہیں ہیں بلکہ انہی کے ہم پلّہ افراد ہیں۔

اس سلسلے میں آخری بات یہ سمجھ لینی چاہیئے کہ موجودہ دور میں پائے جانے والے نام نہاد "مسلم" معاشرے در اصل جاہلی معاشرے ہیں۔ جس بنا پر ہم انہیں جاہلی معاشروں میں شمار کرتے ہیں وہ یہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور ہستی کی الوہیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یا غیر اللہ کے سامنے مراسم بندگی بجا لاتے ہیں بلکہ وہ اس معنی میں جاہلی معاشرے ہیں کہ ان کا نظام حیات بندگیٔ رب کے اصول پر نہیں چل رہا ہے۔ وہ اگرچہ اللہ کے سوا کسی اور اِلٰہ پر ایمان نہیں رکھتے۔ مگر انہوں نے الوہیت کی صفت خاص یعنی حاکمیت کو دوسروں کے حوالے کر رکھا ہے، اور غیر اللہ کی حاکمیت تسلیم کر رکھی ہے۔ یہی حاکمیت ان کے نظام زندگی، قوانین، اقدار و معیار حیات، روایات،

رسم و رواج الغرض تقریباً ان کی پوری حیاتِ اجتماعی کی اساس ہے۔

اربابِ حاکمیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ۔ (مائدہ : ۴۴)

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

اور محکومین کے بارے میں فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ، وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِهٖ۔ (النساء : ۶۰)

اے نبی! تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، مگر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا

مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (النساء : ۶۵)

نہیں اے محمد تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں۔ بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہود اور نصاریٰ کو اسی جرم کا مرتکب قرار دیا تھا۔ اور ان کے جرائم کی فہرست میں شرک، کفر، اللہ کی بندگی سے انحراف، اور اس کے مقابلے میں احبار اور رہبان کی بندگی اختیار کر لینا بتایا تھا، اور ان تمام جرائم کی واحد بنیاد یہ بتائی کہ انہوں نے احبار اور رہبان کو وہی حقوق اور اختیارات دے رکھے تھے جو آج اسلام کا دعویٰ کرنے والوں نے اپنی ہی ملت کے کچھ لوگوں کو دے رکھے ہیں۔ یہود اور نصاریٰ کا یہ فعل اللہ تعالیٰ کے نزدیک ویسا ہی شرک قرار پایا جیسا شرک نصاریٰ کا عیسیٰ ابن مریم کو رب اور الٰہ بنانا، اور اُن کی بندگی کرنا تھا۔ اسلام کے نزدیک شرک کی ان دو اقسام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں یکساں لحاظ سے خدائے واحد کی بندگی سے خروج، دین الٰہی سے سرتابی اور لا الٰہ الا اللہ کی شہادت سے انحراف کے مترادف ہیں۔

موجودہ مسلم معاشروں میں سے بعض تو برملا اپنی "لادینیت" کا اعلان کرتے ہیں۔ اور دین کے ساتھ اپنے ہر گونہ تعلقات کی کلی طور پر نفی کرتے ہیں۔ بعض معاشرے زبان کی حد تک "دین کا احترام" کرتے ہیں۔ مگر اپنے نظام

اجتماعی سے انہوں نے دین کو فارغ خطی دے رکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم "غیب" کے قائل نہیں ہیں، ہم اپنے اجتماعی نظام کی عمارت "علم و تجربہ" پر اٹھائیں گے۔ جہاں "علم اور تجربہ" ہوگا وہاں "غیب" نہیں چل سکے گا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن ان کا یہ خیال بذات خود ایک نوع کی جہالت ہے، اور صرف وہی لوگ اس طرح کی باتیں کر سکتے ہیں جو سراسر جہالت کے پتلے ہوں کچھ ایسے معاشرے بھی ہیں جنہوں نے حاکمیت کی زمامِ کار عملاً غیر اللہ کو سونپ رکھی ہے، وہ جیسی شریعت چاہتے ہیں گھڑ لیتے ہیں، اور پھر اپنی اس خانہ ساز شریعت کے بارے میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ "یہ خدا کی شریعت ہے" ——— یہ تمام معاشرے اس لحاظ سے مساوی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کی بنیاد بندگیٔ رب پر قائم نہیں ہیں۔

اس اصولی حقیقت کے الم نشرح ہو جانے کے بعد ان تمام جاہلی معاشروں کے بارے میں اسلام کا موقف اس ایک فقرے میں بیان کیا جا سکتا ہے کہ: "اسلام ان تمام معاشروں کی اسلامیت اور قانونی جواز کو تسلیم نہیں کرتا"۔ اسلام کی نظر ان لیبلوں، ٹائٹلوں اور سائن بورڈوں پر نہیں ہے جو ان معاشروں نے اپنے اوپر لگا رکھے ہیں۔ اس ظاہر فریبی کے باوجود ان تمام معاشروں میں ایک بات مشترک پائی جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان سب کا نظامِ زندگی اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی سے خالی ہے۔ اس لحاظ سے یہ معاشرے دوسرے کافر اور مشرک معاشروں کے ساتھ جاہلیت کے وصف میں ہم رنگ اور ہم آہنگ ہیں۔

اس بحث سے اب ہم خود بخود اس آخری نکتے تک پہنچ گئے ہیں، جسے ہم نے اس فصل کے آغاز میں بیان کیا ہے، یعنی انسانی زندگی میں تبدیلی لانے کے لیے اسلام کا دائمی اور ابدی طریقِ کار کیا ہے، وہ طریقِ کار جو قیدِ زمان و مکان سے آزاد ہے، اور ہر زمانے میں خواہ وہ دورِ حاضر ہو، یا آنے والا کوئی دورِ بعید ——— اسلام کا واحد طریقہ کار رہے گا ——— اس سوال کا جواب ہم اُس بحث کی روشنی میں معلوم کر سکتے ہیں، جو ہم اوپر "مُسلم معاشرے کی فطرت وحقیقت" کے عنوان سے کر چکے ہیں، اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلم معاشرہ اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے کو اللہ کی بندگی پر قائم کرتا ہے۔ مسلم معاشرے کی یہ فطرت معین ہو جانے کے بعد ہمیں ایک اور اہم سوال کا دو ٹوک جواب بھی مل سکتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ: وہ اصل کیا ہے جسے انسانی زندگی کا ماخذ و مرجع اور بنا اور اساس ہونا چاہیئے؟ کیا اللہ کا دین اور اس کا پیش کردہ نظامِ حیات ہماری یہ ضرورت پوری کر سکتا ہے؟ یا اس کے لیے ہمیں کسی انسانی نظامِ حیات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا؟

اسلام اس سوال کا نہایت دو ٹوک، غیر مبہم جواب بلا تامل و تردد ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کو من حیث المجموع جس اصل کو اپنا مرجع و اساس قرار دینا چاہیے وہ اللہ کا دین اور اس کا تجویز کردہ نظامِ حیات ہے۔ جب تک اس کو حیاتِ اجتماعی کی اساس اور اس کا محور و مرکز نہ بنایا جائے گا لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت جو اسلام کا رکنِ اوّل ہے نہ قائم ہو سکے گی اور نہ اپنے حقیقی اثرات و نتائج ہی پیدا کر

سکے گی۔ جب تک اس اصل کو تسلیم نہ کیا جائے اور بے چون وچرا اس کا اتباع نہ کیا جائے اُس وقت تک خدا کی بندگیٔ خالص کا تقاضا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہرگز پورا نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔ (حشر: ۷)

رسول جو کچھ تمہیں دے اُسے پکڑ لو اور جس چیز سے منع کرے اُس سے رُک جاؤ۔

مزید برآں اسلام انسان کے سامنے یہ سوال بھی رکھتا ہے کہ: انتم اعلم ام اللہ (کیا تم زیادہ علم رکھتے ہو یا اللہ؟) اور پھر خود ہی یہ جواب دیتا ہے کہ: واللہ یعلم وانتم تعلمون (اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے)، وما اوتیتم من العلم الا قلیلا (جو کچھ تمہیں علم دیا گیا ہے وہ بہت کم ہے)۔ اب ظاہر ہے کہ وہ ہستی جو علم رکھتی ہے، جس نے انسان کو پیدا کیا، اور جو اس کی رزق رساں ہے اُسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ انسان کی حکمراں بھی ہو اور اُس کا دین زندگی کا نظام ہو، اور اُسی کو زندگی کا مرجع و منبع ٹھیرایا جائے۔ رہا انسان کے خود ساختہ افکار و نظریات تو ان میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ انحراف کا شکار ہو جاتے ہیں، کیوں کہ وہ انسانی علم پر مبنی ہوتے ہیں اور ناقص ہوتے ہیں، ــــ انسان خود ناآشنائے راز ہے۔ اور جو علم اسے دیا گیا ہے وہ بہت تھوڑا اور ناقص ہے۔

خدا کا دین کوئی چیستان نہیں ہے اور نہ اُس کا پیش کردہ نظامِ حیات کوئی سیال شئے ہے بلکہ شہادت کے دوسرے جز میں اُس کی واضح حد بندی کر دی گئی ہے ، اور اُن نصوص اور قواعد و اصول میں اُسے منضبط کر دیا گیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں۔ اگر کسی معاملے میں نص موجود ہو تو وہی بنائے فیصلہ ہو گی اور نص کے ہوتے ہوئے اجتہاد کی گنجائش نہ ہو گی ، اور اگر نص نہ پائی جائے گی تو اجتہاد اپنا رول ادا کرے گا ، مگر اُن اصولوں اور ضابطوں کے تحت جو اللہ نے اپنے نظامِ حیات میں بیان کر دیے ہیں نہ کہ اہواء و خواہشات کا تابع بن کر :

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ
وَالرَّسُوْلِ۔ (النساء : ۵۹)

اگر کسی بات میں تمہارے درمیان نزاع برپا ہو جائے
تو اُسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔

اجتہاد و استنباط کے اصول بھی مقرر کر دیے گئے ہیں۔ اور وہ معلوم و معروف ہیں۔ ان میں کوئی ابہام نہیں پایا جاتا ہے اور نہ اُن میں کسی نوعیت کا ڈھیلا پن پایا جاتا ہے۔ مگر کسی کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنے بنائے ہوئے قانون کو اللہ کی شریعت بنائے۔ البتہ اگر اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کا اعلان کر دیا جائے ، اور قوت و اختیار کا ماخذ صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہو ، کوئی قوم یا پارٹی یا کوئی فرد بشر اس کا سرچشمہ نہ ہو ، اور منشائے الٰہی

معلوم کرنے کے لیے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنّت کی طرف رجوع کیا جاتا ہو تو ایسی صورت میں جو قانون سازی ہوگی وہ شریعت کی حدود کے اندر شمار ہوگی ۔ مگر یہ حق ہر اُس شخص کو نہیں دیا جا سکتا جو اللہ کے نام پر اپنے اقتدار کا سکہ جانا چاہتا ہو، جیسا کہ کسی زمانے میں یورپ تھیاکریسی اور "مقدس بادشاہت" کے پردے میں اس کا مزہ چکھ چکا ہے ۔ اسلام میں اس طرز کی حکومت کی کوئی گنجائش نہیں ہے ، یہاں رسول کے سوا اللہ کے نام پر کسی اور کو اپنا حکم چلانے کا اختیار نہیں ہے ۔ یہاں واضح اور بیّن نصوص موجود ہیں جو شریعت الٰہی کے حدود اربعہ کا تعین کر دیتی ہیں ۔

" دین زندگی کے لیے ہے " یہ ایک ایسا جملہ ہے جسے انتہائی غلط معنی پہنائے گئے ہیں اور اسے یکسر غلط استعمال کیا جاتا رہا ہے ۔ بے شک "دین زندگی کے لیے ہے " مگر کس قسم کی زندگی کے لیے ؟

یہ دین اس زندگی کے لیے ہے جسے یہ خود تعمیر کرتا ، اور اپنے طریق کار کے مطابق پروان چڑھاتا ہے ۔ یہ زندگی انسانی فطرت سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہوتی ہے اور انسان کی تمام حقیقی ضروریات کی کفیل ہوتی ہے ۔ ضروریات سے مراد وہ "ضروریات" نہیں ہیں جن کو انسان بزعم خویش اپنی ضروریات سمجھ بیٹھتا ہے ، بلکہ ان کا تعین صرف وہی ہستی طے کر سکتی ہے اور کرے گی ، جس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کی اور اپنی اور دوسری مخلوق کی تمام ضروریات سے بخوبی واقف ہے ۔

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ۔

(ملک : ۱۴)

کیا جس نے مخلوق کو پیدا کیا ہے وہ اُس کے حال کو نہیں جانتا ہے۔ وہ تو باریک بین اور باخبر ہے۔

دین کا کام یہ نہیں ہے کہ جس طرز کی بھی زندگی ہو وہ اُسے برحق ثابت کرتا پھرے، اور اُس کے لیے سند جواز فراہم کر کے دے اور ایسا شرعی فتوے اُس کے لیے مہیا کر دے جسے وہ مستعار لیبل کی طرح اپنے اوپر چسپاں کر لے۔ بلکہ دین تو اس لیے ہے کہ وہ زندگی کو اپنی کسوٹی پر پرکھے، جو کھرا ہو اُسے برقرار رکھے اور جو کھوٹا ثابت ہو اُسے اٹھا کر پرے پھینک دے۔ اگر زندگی کا پورا نظام بھی اُس کی مرضی کے خلاف ہو تو وہ اُسے ختم کر کے اُس کی جگہ نئی زندگی کی تعمیر کرے۔

دین کی تعمیر کردہ یہ زندگی ہی اصل اور برحق زندگی ہو گی۔ اس فقرے کا مفہوم یہی ہے کہ اسلام زندگی کا دین ہے۔ اس فقرے میں اس کے علاوہ کسی اور مفہوم کی تلاش کسی طرح بھی صحیح اور درست نہیں ہو گی!

یہاں پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ "کیا بشری مصلحت ہی وہ اصل چیز نہیں ہے جسے انسانی زندگی کی صورت گری کرنا چاہیئے؟" لیکن ہم یہاں پھر اسی سوال کو قارئین کے سامنے رکھیں گے، جسے اسلام خود اُٹھاتا ہے اور خود ہی اس کا جواب دیتا ہے کہ "أانتم اعلم ام اللہ (کیا تمہیں زیادہ علم ہے یا اللہ کو) واللہ یعلم وانتم لا تعلمون (وراصل

اللہ ہی جانتا اور علم رکھتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو) ۔ شریعت الٰہی جس شکل میں اللہ نے نازل فرمائی ہے اور جس شکل میں اللہ کے رسول نے ہم تک پہنچائی ہے وہ خود بشری مصالح کا پورا پورا لحاظ کرتی ہے ۔ اگر کبھی انسان کو یہ گمان ہوتا ہے کہ اس کی مصلحت اس قانون کی پابندی میں نہیں بلکہ خلاف ورزی میں ہے جو اللہ نے انسانوں کے لیے تجویز فرمایا ہے تو اوّلاً تو اس کے اس قیاس اور احساس کی حیثیت ایک واہمہ اور وسوسہ سے زیادہ نہیں :

إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ
وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمُ الْهُدَىٰ ○ أَمْ
لِلْإِنْسَانِ مَا تَمَنَّىٰ ○ فَلِلَّهِ الْآخِرَةُ وَالْأُولَىٰ ○

(نجم : ۲۳-۲۵)

یہ لوگ بس اٹکل اور اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں اس کے باوجود کہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے ۔ کہیں انسان کو من مانی مراد بھی ملی ہے ۔ سو آخرت اور دنیا میں سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے ۔

اور ثانیاً اسے یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ شریعت کے بارے میں اس مؤقف کا اختیار کرنا کفر کے مترادف ہے ۔ آخر یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ایک شخص یہ اعلان بھی کرے کہ اس کی رائے میں مصلحت و منفعت شریعت

الٰہی کی مخالفت میں ہے اور اس کے باوجود وہ اس دین کا پیرو بھی رہے،
اور صرف پیرو ہی نہ رہے، بلکہ اہلِ دین میں شمار ہو!!

باب ششم

آفاقی ضابطۂ حیات

اِسلام فکر و عمل کی دنیا میں اپنے عقیدہ کی عمارت اللہ کی بندگیٔ کامل کی بنیاد پر اُٹھاتا ہے ، اس کے اعتقادات ، عبادات اور جملہ قوانین حیات سب میں یکساں طور پر اسی بندگی کا اظہار ہوتا ہے ، بندگی کی اسی جامع صورت کو وہ "لا الٰہ الا اللہ" کی قولی شہادت کا صحیح عملی تقاضا گردانتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیفیتِ بندگی کی تفصیل کا حصول اس کے نزدیک "محمد رسول اللہ" کی شہادت کا ناگزیر عملی نتیجہ ہے ——— اسلام اپنی عمارت اِس طرح اٹھاتا ہے کہ کلمۂ شہادت کے دونوں حصے اسلامی نظامِ زندگی کا تعین کریں ، اس کے نورانی خدوخال کی صورت گری کریں اور اس کی خصوصیات کو طے کریں ، ——— اسلام اگر ایسی لاثانی طرز پر اپنی عمارت چنتا ہے جو تاریخ کے تمام

انسانی نظاموں سے اُسے جُداگانہ حیثیت دے دیتی ہے تو دراصل اسلام اپنے اس رویّے کی بدولت اُس "مرکزی قانون" سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے جو صرف انسانی وجود ہی کو نہیں پوری کائنات کو بھی محیط ہے، اور جس کا دائرہ عمل صرف انسانی زندگی کے نظام تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ پورے نظام ہستی کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

پُوری کائنات ایک ہی مرکزی قانون کے تابع ہے۔

اسلامی نظریہ کے مطابق اس تمام کائنات کو اللہ نے خلعتِ تخلیق بخشا ہے، اللہ تعالیٰ نے اُس کو وجود میں لانے کا ارادہ فرمایا اور وہ وجود پذیر ہوگئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے اُس کے اندر ایسے نوامیسِ فطرت ودیعت کر دیے جن کی بدولت وہ حرکت کر رہی ہے اسی کے طفیل اُس کے تمام اجزاء اور پُرزوں کی حرکت میں بھی تناسب اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور اس کی کلی حرکت میں بھی نظم وضبط اور تناسب و توازن ملتا ہے:

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۞ (نحل: ۴۰)

جب ہم کسی چیز کو وجود میں لانا چاہتے ہیں تو اُسے صرف یہی کہنا ہوتا ہے کہ ہو جا اور بس وہ ہو جاتی ہے۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا۔

(فرقان: ۲)

اور اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اُسے ٹھیک اندازے

پر رکھا۔

اس کائنات کے پس پردہ ایک ارادہ کارفرما ہے جو اس کی تدبیر کرتا ہے، ایک طاقت ہے جو اسے حرکت بخشتی ہے، ایک قانون ہے جو اسے پابند نظم رکھتا ہے۔ یہی قوت اس کائنات کے مختلف اجزاء میں نظم و ضبط قائم رکھتی ہے اور ان کی حرکت و گردش کو ایک ضابطے میں کس کر رکھتی ہے۔ چنانچہ نہ وہ کبھی ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، نہ ان کے نظام میں کبھی کوئی خلل ہی واقع ہوتا ہے، وہ کبھی متعارض و بے ہنگم نہیں ہوتے، اُن کی مسلسل و منظم حرکت میں کبھی ٹھیراؤ راہ نہیں پاتا، وہ اُس وقت تک جاری ہے اور رہے گی جب تک مشیتِ ایزدی اُسے جاری رکھنا چاہے گی۔ یہ کائنات اس مدبّر ارادے، محرک قوت اور غالب و قاہر ضابطے کی مطیع اور تابع اور اس کے آگے سرِ عجز و نیاز خم کیے ہوئے ہے۔ حتیٰ کہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ اس الٰہی ارادے سے سرتابی کرے، اس کی نافرمانی کرے اور اس کے بنائے ہوئے قانون کے خلاف چلے۔ اسی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری کی وجہ سے یہ کائنات صحیح و سلامت گردش کر رہی ہے، اور اس وقت تک اس میں کوئی خرابی اور فساد اور انتشار راہ نہیں پا سکتا جب تک مشیت ایزدی اسے ختم کرنے کا فیصلہ نہ کر دے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی
الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۔(اعراف: ۵۴)

درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر اپنے تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے۔ جس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کیے۔ سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار رہو! اُسی کی خلق ہے اور اُسی کا امر ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ، سارے جہانوں کا مالک اور پروردگار۔

انسان غیر ارادی پہلوؤں میں مرکزی قانون کا تابع ہے۔

انسان اس کائنات کا ایک جز ہے۔ جو قوانین انسان کی فطرت پر فرمانروائی کرتے ہیں وہ اس مرکزی نظام سے مستثنیٰ نہیں ہیں جو پوری کائنات کو محیط ہے۔ اس کائنات کو بھی اللہ ہی نے خلعت وجود بخشا، اور انسان کا خالق بھی اللہ ہے۔ انسان کی جسمانی ساخت اسی زمین کی مٹی سے کی گئی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر کچھ ایسی خصوصیات بھی رکھ دی ہیں جو ایک ذرّہ خاکی سے فزوں تر ہیں۔ انہی کی بدولت آدمی انسان بنتا ہے، لیکن یہ خصوصیات اللہ تعالیٰ نے ایک مقررہ اندازے کے مطابق اُسے ارزاں فرمائی ہیں۔ انسان اپنے جسمانی وجود کی حد تک طوعاً و کرہاً اُس قانون فطرت کا تابع ہے جو اللہ تعالیٰ نے اُس کے لیے مقرر فرما دیا ہے۔ اس کی تخلیق کا آغاز اللہ کی مشیت

سے ہوتا ہے نہ کہ اُس کی اپنی مرضی سے یا اپنے باپ اور ماں کی مرضی سے۔ اس کے ماں اور باپ صرف باہمی اتصال پر قادر ہیں، لیکن قطرۂ آب کو وجود انسانی میں بدلنے کی طاقت وہ ہرگز نہیں رکھتے۔ اللہ نے مدّتِ حمل اور طریقۂ ولادت کے لیے جو اصول وضع فرما دیا ہے انسان اُسی کے مطابق پیدا ہوتا ہے۔ اور اُسی ہوا میں سانس لیتا ہے جو اللہ نے اُس کے لیے پیدا کی ہے، اور اتنی مقدار میں اور اُسی کیفیت کے تحت لیتا ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دی ہے۔ وہ قوتِ احساس و ادراک رکھتا ہے، درد سے متاثر ہوتا ہے، اُسے بھوک اور پیاس ستاتی ہے، وہ کھاتا اور پیتا ہے، الغرض وہ چاہے نہ چاہے اس کو اپنی پوری زندگی ناموسِ الٰہی کے مطابق بسر کرنا پڑتی ہے، اور اُس کے ارادہ و اختیار کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے اس میں اور اس کائنات اور اس میں پائے جانے والی ذی روح اور غیر ذی روح مخلوق میں سرِ مُو فرق نہیں ہے۔ سب اللہ کی مشیئت، قدرت اور قانون کے آگے غیر مشروط طور پر سرِ تسلیم و اطاعت خم کیے ہوئے ہیں۔

جس اللہ نے اس کائنات کو وجود بخشا اور انسان کو پیدا کیا، اور جس نے انسان کو بھی ان قوانین کے تابع بنایا جن قوانین کے تابع یہ پوری کائنات ہے، اُسی ذاتِ بے عیب نے انسان کے لیے ایک شریعت مقرر فرمائی ہے جس سے وہ اپنی ارادی زندگی کی بھی تنظیم کر سکتا ہے اور اُسے طبعی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ کر سکتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ شریعت اُسی ہمہ گیر قانونِ الٰہی کا ایک حصّہ ہے جو انسان کی فطرت پر اور اس

مجموعی کائنات کی فطرت پر فرماں روائی کر رہا ہے اور اس کو ایک لگے بندھے ضابطے کے تحت چلا رہا ہے۔

اللہ کا ہر کلمہ، اس کا ہر امر و نہی، اس کا ہر وعدہ، اس کی ہر وعید، اس کا ہر قانون، اور اس کی ہر ہدایت کائنات کے مرکزی قانون ہی کا ایک حصّہ ہے اور ویسے ہی سر بسر سچائی اور صحت پر مبنی ہے جو ان قوانین میں پائی جاتی ہے جنہیں ہم نوامیس فطرت ——— یا خدا کے کائناتی قوانین ——— سے تعبیر کرتے ہیں اور جو اپنی پوری فطری اور ازلی صداقت کے ساتھ ہمیں اس کائنات میں رو بعمل نظر آتے ہیں۔ ان کی کارفرمائی میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ان اندازوں کا پرتو ملتا ہے جو اس نے ان کے لیے ٹھیرا رکھے ہیں

شریعت الٰہی مرکزی قانون سے ہم آہنگ ہے۔

یہ اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ وہ شریعت جسے اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کی تنظیم کے لیے وضع فرمایا ہے دراصل ایک کائناتی شریعت ہے، اس لحاظ سے کہ وہ کائنات کے مرکزی قانون سے مربوط اور ہم آہنگ ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر شریعت الٰہی کا اتباع انسانی زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت بن جاتا ہے کیوں کہ صرف اسی طرح انسان اور کائنات میں جس میں وہ جی رہا ہے، توافق اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انسان کی طبعی زندگی میں کارفرما (طبعی) قوانین (Physical Laws) اور اس کی ارادی زندگی کے (اخلاقی) قوانین (Moral Laws) میں بھی ہم آہنگی شریعت الٰہی کے اتباع ہی سے اُبھر سکتی ہے۔ صرف اسی طریقہ سے

"اندر" اور" باہر" کے انسان کو وحدت اور یگانگی سے ہم کنار کیا جا سکتا ہے۔ انسان کائنات کے تمام قوانین اور اس میں کارفرما مرکزی نظام کے ادراک سے عاجز اور قاصر ہے۔ کائناتی قوانین کا ادراک فہم تو بڑی بات ہے۔ وہ تو اس قانون کو بھی نہیں سمجھ پاتا جس کے ضابطے میں اس کی ذات جکڑی ہوئی ہے اور جس سے سرِمو انحراف بھی اس کے لیے ناممکن ہے۔ یہی وہ عجز و درماندگی ہے جس کی وجہ سے انسان اس بات پر قادر نہیں کہ وہ اپنی زندگی کے لیے کوئی ایسی شریعت وضع کر سکے جس کی تنفیذ سے حیات انسانی اور حرکت کائنات کے مابین ہمہ گیر توافق تو کجا خود اس کی اپنی فطرت خفی اور حیات ظاہری کے درمیان ہی ہم آہنگی قائم ہو سکے۔ یہ قدرت صرف اُسی ذات کو حاصل ہے جو کائنات کی صانع ہے اور انسان کی خالق بھی، جو کائنات کی تدبیر و انتظام بھی کرتی ہے اور انسانی معاملات کی مدبّر و منتظم بھی ہے۔ اور سب کو اُسی ایک مرکزی قانون میں جکڑے ہوئے ہے جسے اُس نے خود منتخب و پسند فرمایا ہے۔

پس یہی وہ حقیقت ہے جو شریعت اتباع کو لازم اور ناگزیر بنا دیتی ہے۔ تاکہ کائنات کے ساتھ مکمّل موافقت پیدا ہو سکے۔ اس کا اتّباع اتنا ہی لازم و ناگزیر ہے جتنا اعتقادی اور نظری طور پر اسلام کا قیام۔ کسی فرد یا جماعت کی زندگی اس وقت تک اسلام کے رنگ سے خالی رہے گی جب تک بندگی کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص نہ کیا جائے گا، اور بندگی کو بجا لانے کا وہ طریقہ نہ اپنایا

جائے گا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو سکھایا ہے۔ بالفاظ دیگر جب تک اسلام کے رکن اوّل کے دونوں اجزاء لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کا عملی زندگی میں ظہور نہ ہوگا، زندگی خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی نورِ اسلام سے بے بہرہ ہوگی۔

شریعت الٰہی کا اتباع کیوں لازم ہے۔

انسانی زندگی اور قانون کائنات کے مابین ہمہ گیر توافق نوع انسان کے لیے سراسر خیر و فلاح کا موجب ہے۔ یہی ایک صورت ہے جس سے انسانی زندگی فساد و شر سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ انسان اگر کائنات کے ساتھ سلامتی کا رویّہ اختیار کرنا ہے، اور خود اپنی ذات سے بھی امن میں رہنا ہے تو اس کے لیے کائنات سے توافق و ہم آہنگی پیدا کرنا ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اب رہا کائنات کی جانب سے انسان کے مامون و مصئون رہنے کی صورت تو وہ صرف انسان اور کائنات کی حرکت میں باہمی مطابقت اور یک جہتی پر موقوف ہے۔ اسی طرح خود انسان اور اس کی اپنی ذات کے درمیان امن و سلامتی کا قیام بھی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان کی ظاہری حرکت اور اس کے صحیح فطری تقاضوں میں مکمل ہمنوائی ہو تاکہ انسان اور فطرت کے درمیان تصادم اور معرکہ آرائی کی کیفیت رونما نہ ہو۔ یہ صرف شریعتِ الٰہی ہی کا کمال ہے کہ اس کے ذریعے انسان کی مادّی زندگی اور اس کی فطرتِ حقیقی کے درمیان نہایت

سہولت اور ہمواری کے ساتھ توافق اور تعاون پیدا کیا جا سکتا ہے اور جب فطرت کے ساتھ انسان تعاون و یکجہتی کی فضا پیدا کر لیتا ہے تو اس کے نتیجہ میں انسانوں کے باہمی تعلقات اور زندگی کی عمومی جدوجہد کے درمیان از خود توافق کی عمل داری قائم ہو جاتی ہے، کیوں کہ انسان جب فطرت کے ساتھ تعاون کی روش اختیار کرتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حیات انسانی اور کائنات میں مکمّل توافق جنم لیتا ہے، اور انسان کی زندگی اور کائنات میں ایک ہی نظام کی کارفرمائی قائم ہو جاتی ہے۔ یُوں انسانی زندگی کا اجتماعی پہلو بھی باہمی تصادم و تعارض سے پاک ہو جاتا ہے۔ اور انسانیت خیرِ کلّی سے بہرہ اندوز ہو جاتی ہے۔ اُس کے بعد کائنات کے مختلف اسرار بھی اس کے لیے اسرار نہیں رہتے۔ انسان فطرت کا آشنائے راز بن جاتا ہے، کائنات کی مخفی طاقتیں اسکے سامنے آشکار ہو جاتی ہیں، اور کائنات کی پہنائیوں میں چھپے ہوئے خزانوں کا سراغ اُسے مل جاتا ہے۔ وہ ان قوّتوں اور خزانوں کو اللہ کی شریعت کی رہنمائی میں انسانیّت کی کُلّی فلاح و سعادت کے لیے استعمال کرتا ہے اس طرح کہ نہ کہیں تصادم پیدا ہوتا ہے، اور نہ انسان اور فطرت میں رسّہ کشی اور نزاع کی نوبت آتی ہے، بصورت دیگر ان دونوں میں مستقل طور پر کھینچا تانی ہوتی رہتی ہے اور اللہ کی شریعت کے بالمقابل انسان کی خواہشات اور نفسانی اہواء سر اُٹھاتی رہتی ہیں۔ اس بارے میں اللہ کا ارشاد ہے کہ:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَ هُمْ لَفَسَدَتِ
السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ۔

(مومنون : ۷۱)

اور اگر حق ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین اور آسمان
اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔

"حق" ناقابلِ تقسیم ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی نظریہ کی رُو سے "حق" ایک اکائی ہے۔ یہی اس دین کی بنیاد ہے، اور اُسی پر زمین و آسمان کا نظام قائم ہے، اور اسی سے دنیا و آخرت کے تمام معاملات درست ہوتے ہیں، اُسی کے بارے میں انسانوں کو اللہ تعالیٰ کے روبرو جواب دہی کرنی ہے۔ اور جو اس سے تجاوز کرتے ہیں، ان کو وہ سزا بھی دیتا ہے۔ حق ایک وحدت ہے، جس کی تقسیم ناممکن ہے۔ اور یہ کائنات کے اُسی مرکزی قانون سے عبارت ہے جس کو اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ نے تمام حالات کے لیے جاری فرما رکھا ہے اور جس کے آگے عالم وجود کی تمام انواع اور تمام ذی روح و غیر ذی روح مخلوقات سرِ اطاعت خم کیے ہوئے ہیں اور مکمل طور پر اس کی گرفت میں ہیں:

لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ط
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ

ظَالِمَةً وَّأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِيْنَ ۝ فَلَمَّا
أَحَسُّوْا بَأْسَنَآ إِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝ لَا تَرْكُضُوْا
وَارْجِعُوْٓا إِلٰى مَآ أُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ
تُسْـَٔلُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ إِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ فَمَا زَالَتْ
تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ۝
وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝
لَوْ أَرَدْنَآ أَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ
إِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ
فَيَدْمَغُهٗ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا
تَصِفُوْنَ ۝ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَمَنْ
عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ
يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ۔

(انبیاء : ١٠ تا ٢٠)

بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔ کتنی ہی ظالم بستیاں ہیں جن کو ہم نے پیس کر رکھ دیا اور اُن کے بعد دوسری کسی قوم کو اُٹھایا۔ جب اُن کو ہمارا عذاب محسوس ہُوا تو لگے سرپٹ دوڑنے (کہا گیا)

بھاگو نہیں، جاؤ اپنے گھروں اور عیش کے سامانوں میں جن کے اندر تم چین کر رہے تھے، شاید کہ تم سے پوچھا جائے۔ کہنے لگے ہائے ہماری کم بختی، بے شک ہم خطاوار تھے۔ اور وہ یہی پکارتے رہے یہاں تک کہ ہم نے کھلیان کر دیا۔ اور وہ بھسم ہو کر رہ گئے۔ ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ بھی ان میں ہے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے۔ مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے، اور تمہارے لیے تباہی ہے اُن باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو۔ زمین و آسمان میں جو مخلوق بھی ہے وہ اللہ کی ہے۔ اور جو (فرشتے) اس کے پاس ہیں وہ نہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اُس کی بندگی سے سرتابی کرتے ہیں اور نہ ملول ہوتے ہیں۔ شب و روز اُسی کی تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ دم نہیں لیتے۔

کائنات "حق" پر قائم ہے

انسان کی فطرت اپنی گہرائیوں میں اس "حق" کا پورا پورا ادراک رکھتی ہے۔ ایک طرف انسان کی اپنی ہیئت اور ساخت اور دوسری طرف اس کے اردگرد پھیلی ہوئی وسیع و عریض کائنات کی ساخت و ترکیب ہر لحظہ انسان

کو یاد دلاتی رہتی ہے کہ یہ کائنات حق پر استوار ہے، اور حق ہی اس کا اصل و جوہر ہے، اور یہ ایک ایسے مرکزی قانون سے مربوط ہے جس نے اس کو ثبات و دوام بخش رکھا ہے۔ چنانچہ اس کائنات میں کوئی اختلال پیدا نہیں ہوتا، اس کی راہیں جُدا جُدا نہیں ہیں، اس میں اختلافِ دُور نہیں ہے، اُس کے اجزاء میں کوئی تضاد نہیں ہے، وہ الل ٹپ طریقے پر کام نہیں کر رہی ہے، نہ وہ محض بخت و اتفاق کی مرہونِ منّت ہے، نہ ایک باقاعدہ منصوبے اور اسکیم کے بغیر رواں دواں ہے، وہ ہر آن بدلتی ہوئی خواہشات اور سرکش اہواء انسانی کے ہاتھوں میں محض کھلونا بھی نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے جُز رَس، سخت گیر اور مقررہ نظام کی شاہراہ پر بے چون و چرا چل رہی ہے۔ اختلاف کا آغاز انسان اور اس کی فطرت کے درمیان تصادم پیدا ہو جانے سے ہوتا ہے۔ اور وہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان اُس "حق" سے منحرف ہو جاتا ہے، جو اُس کی فطرت کی اتھاہ گہرائیوں میں پنہاں ہے اور اُس کی خواہشات اُس پر حاوی ہو جاتی ہے، اور پھر وہ اپنا قانون حیات اللہ کی شریعت سے اخذ کرنے کے بجائے خواہشات کی شریعت سے حاصل کرنے لگتا ہے، اور جس طرح یہ کائنات اپنے مولیٰ کے آگے سرافگندہ ہے اُسی طرح وہ اپنے ارادہ و اختیار سے اُس کے آگے سرافگندہ ہونے کے بجائے سرتابی اور سرکشی کو شیوہ بنا لیتا ہے۔

حق سے انحراف کے نتائج

جس طرح انسان اور اس کی فطرت اور انسان اور کائنات کے درمیان تصادم اور اختلاف پیدا ہوجاتا ہے اسی طرح یہی اختلاف بڑھتے بڑھتے انسانی افراد، انسانی گروہوں، قوموں اور ملّتوں اور مختلف انسانی نسلوں کے باہمی اختلاف کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کائنات کی تمام قوّتیں اور ذخائر و خزائن بجائے اس کے کہ نوعِ انسانی کی فلاح و ترقی میں استعمال ہوں، الٹا اس کے حق میں وسائل ہلاکت اور اسباب شقاوت بن جاتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ واضح مقصد جس کے لیے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی شریعت کا قیام مطلوب ہے وہ صرف آخرت کے لیے ذخیرۂ عمل جمع کرنا ہی نہیں ہے، دنیا اور آخرت دو مختلف چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی منزل کے دو مرحلے ہیں، دونوں برابر کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی شریعت ایک طرف انسانی زندگی میں ان دونوں مرحلوں میں توافق کا رنگ پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف پوری انسانی زندگی کو کائنات کے مرکزی قانون کے ساتھ مربوط کرتی ہے۔ چنانچہ کائنات کے مرکزی قانون کے ساتھ جب توافق پیدا ہوگا تو اس کے نتیجے میں انسان کو سعادت و خوش بختی کی جو دولت ملے گی وہ آخرت تک کے لیے ملتوی نہیں رکھی جائے گی بلکہ پہلے مرحلہ (دنیا) میں بھی اُس کے فوائد ظاہر ہو کر رہیں گے۔ البتہ آخرت میں

وہ اَوجِ کمال اور نقطۂ عروج کو پہنچے گی۔

یہ ہے اس پوری کائنات کے بارے میں اور اس کے ایک جزء انسانی وجود کے بارے میں اسلامی تصوّر کی بنیاد۔ یہ تصوّر اپنی فطرت و اصلیت کے لحاظ سے اُن تمام تصوّرات سے بنیادی اختلاف رکھتا ہے جو دنیا میں اب تک رائج رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تصوّر اپنے جلو میں جن ذمّہ داریوں اور فرائض کو لے کر آتا ہے وہ دنیا کے کسی دوسرے تصوّر اور نظریۂ حیات میں نہیں ملتے۔ اس تصوّر کی رُو سے شریعت الٰہی کا اتّباع دراصل اس ضرورت کا اقتضاء ہے کہ حیات انسانی اور حیات کائنات کے درمیان اور اُس قانون کے درمیان جو انسانی فطرت اور کائنات میں کارفرما ہے کامل ارتباط ہونا چاہیئے۔ اسی ضرورت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ کائنات کے مرکزی قانون کے درمیان اور حیات انسانی کی تنظیم کرنے والی شریعت کے درمیان بھی پوری مطابقت ہو۔ نیز شریعت الٰہی کے اتباع ہی سے انسان کما حقہٗ اللہ کی بندگی کا فریضہ انجام دے سکتا ہے جس طرح یہ کائنات صرف اللہ کی بندگی کر رہی ہے اور کوئی انسان اپنے لیے اس کی بندگی کا مدّعی نہیں ہے۔

جس توافق اور مطابقت کی ضرورت کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اُسی کا اشارہ اُس گفتگو میں بھی موجود ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السّلام امّتِ مسلمہ کے باپ ——— اور نمرود کے درمیان ہوئی۔ یہ شخص ایک جابر فرمانروا تھا

اور ملک کے اندر بندگانِ خدا پر اپنی خدائی کا دعویدار تھا، مگر اس کے باوجود افلاک اور سیّاروں اور ستاروں کی دنیا اس کے دعوئ خدائی سے خارج رہی۔ اس کے سامنے جب حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے یہ دلیل پیش کی کہ "جو ذات اس پوری کائنات کے اقتدار کی مالک ہے صرف اُسی ذات کو انسانی زندگی پر بھی اقتدار (Sovereignty) حاصل ہونا چاہیئے"، تو وہ مبہوت ہو کر رہ گیا، اس دلیل کا اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا، قرآن نے اس قصّے کو یُوں نقل کیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ
اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ
یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ قَالَ
اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ
فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ
لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (بقرہ ۲: ۲۵۸)

کیا تم نے اُس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا تھا، اس بات پر کہ ابراہیم کا رب کون ہے۔ اور اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے،

تو اُس نے جواب دیا زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔
ابراہیم نے کہا: اچھا، اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اُسے مغرب سے نکال لا۔ یہ سُن کر وہ منکرِ حق ششدر رہ گیا۔ مگر اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھایا کرتا۔

بے شک اللہ نے سچ فرمایا:

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا وَّ اِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ۔ (آل عمران: ۸۳)

اب کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دین اللہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں، حالانکہ زمین و آسمان کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کی تابع فرمان ہیں، اور اُسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔

ساتواں باب

اِسلام ہی اصل تہذیب ہے

اِسلامی معاشرے اور جاہلی معاشرے کا بُنیادی فرق۔

اِسلام صرف دو قسم کے معاشروں کو جانتا ہے۔ ایک اسلامی معاشرہ اور دوسرا جاہلی معاشرہ۔ اسلامی معاشرہ وہ ہے جس میں انسانی زندگی کی زمامِ قیادت اسلام کے ہاتھ میں ہو۔ انسانوں کے عقائد و عبادات پر، ملکی قانون اور نظام ریاست پر، اخلاق و معاملات پر غرضیکہ زندگی کے ہر پہلو پر اسلام کی عملداری ہو۔ جاہلی معاشرہ وہ ہے جس میں اسلام عملی زندگی سے خارج ہو۔ نہ اسلام کے عقائد و تصورات اُس پر حکمرانی کرتے ہوں، نہ اسلامی اقدار اور ردّ و قبول کے اسلامی پیمانوں کو وہاں

برتری حاصل ہو، نہ اسلامی قوانین وضوابط کا سکہ رواں ہو اور نہ اسلامی اخلاق و معاملات کسی درجہ فوقیت رکھتے ہوں۔

اسلامی معاشرہ وہ نہیں ہے جو "مسلمان" نام کے انسانوں پر مشتمل ہو، مگر اسلامی شریعت کو وہاں کوئی قانونی پوزیشن حاصل نہ ہو۔ ایسے معاشرے میں اگر نماز روزے اور حج کا اہتمام بھی موجود ہو، تو بھی وہ اسلامی معاشرہ نہیں ہوگا، بلکہ وہ ایک ایسا معاشرہ ہے جو خدا اور رسول کے احکام اور فیصلوں سے آزاد ہو کر اپنے مطالبۂ نفس کے تحت اسلام کا ایک جدید ایڈیشن تیار کر لیتا ہے، اور اُسے ——— برسبیلِ مثال ——— "ترقی پسند اسلام" کے نام سے موسوم کرتا ہے!

جاہلی معاشرہ مختلف بھیس بدلتا رہتا ہے، جو تمام کے تمام جاہلیت ہی سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ کبھی وہ ایک ایسے اجتماع کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے، جس میں اللہ کے وجود کا سرے سے انکار کیا جاتا ہے اور انسانی تاریخ کی مادی اور جدلی تعبیر (Dialectal Interpretation) کی جاتی ہے اور "سائنٹفک سوشلزم" کو نظامِ زندگی کی حیثیت سے عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ کبھی وہ ایک ایسی جمعیت کے رنگ میں نمودار ہوتا ہے جو خدا کے وجود کی تو منکر نہیں ہوتی، لیکن اُس کی فرماں روائی اور اقتدار کو صرف آسمانوں تک محدود رکھتی ہے۔ رہی زمین کی فرماں روائی تو اُس سے خدا کو بے دخل رکھتی

ہے۔ نہ خدا کی شریعت کو نظامِ زندگی میں نافذ کرتی ہے، اور نہ خدا کی تجویز کردہ اقدارِ حیات کو جسے خدا نے انسانی زندگی کے لیے ابدی اور غیر متغیر اقدار ٹھیرایا ہے فرماں روائی کا منصب دیتی ہے۔ وہ لوگوں کو یہ تو اجازت دیتی ہے کہ وہ مسجدوں، کلیساؤں اور عبادت گاہوں کی چار دیواری کے اندر خدا کی پوجا پاٹ کر لیں، لیکن یہ گوارا نہیں کرتی کہ لوگ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے اندر بھی شریعتِ الٰہی کو حاکم بنائیں۔ اس لحاظ سے وہ جمعیت تختۂ زمین پر خدا کی الوہیت کی باغی ہوتی ہے کیونکہ وہ اُسے عملی زندگی میں معطل کر کے رکھ دیتی ہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ کا صریح فرمان ہے: وھو الذی فی السماء الٰہ و فی الارض الٰہ (وہی خدا ہے جو آسمان میں بھی الٰہ ہے اور زمین میں بھی)۔ اس طرزِ عمل کی وجہ سے یہ معاشرہ اللہ کے اس پاکیزہ نظام کی تعریف میں نہیں آتا جسے اللہ تعالیٰ نے آیت ذیل میں "دینِ قیّم" سے تعبیر فرمایا ہے:

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ، أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ - (یوسف: ۴۰)

حکم صرف اللہ کا ہے۔ اُسی کا فرمان ہے کہ اُس کے سوا کسی کی بندگی نہ کی جائے۔ یہی دینِ قیّم (ٹھیٹھ سیدھا طریقِ زندگی) ہے۔

یہی وہ اجتماعی طرزِ عمل ہے جس کی وجہ سے یہ معاشرہ بھی جاہلی معاشروں

کی صف میں شمار ہوتا ہے۔ چاہے وہ لاکھ اللہ کے وجود کا اقرار کرے اور لوگوں کو مسجدوں اور کلیساؤں اور صوامع کے اندر اللہ کے آگے مذہبی مراسم کی ادائیگی سے نہ روکے۔

صرف اسلامی معاشرہ ہی مہذّب معاشرہ ہوتا ہے۔

آغاز میں ہم اسلامی معاشرہ کی جو تعریف کر آئے ہیں اُس کی بنا پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صرف اسلامی معاشرہ ہی درحقیقت "مہذب معاشرہ" ہے۔ جاہلی معاشرے خواہ جس رنگ اور رُوپ میں ہوں بنیادی طور پر پسماندہ اور غیر مہذّب معاشرے ہوتے ہیں۔ اس اجمال کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ میں نے اپنی ایک زیرِ طبع کتاب کا اعلان کیا اور اُس کا نام رکھا: "نحو مجتمع اسلامی متحضر" (مہذب اسلامی معاشرہ)۔ لیکن اگلے اعلان میں مَیں نے "مہذب" کا لفظ حذف کر دیا اور اس کا نام صرف "اسلامی معاشرہ" رہنے دیا۔ اس ترمیم پر ایک الجزائری مصنف کی جو فرانسیسی زبان میں لکھتے ہیں نظر پڑی اور انہوں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اِس تبدیلی کا محرّک وہ نفسیاتی عمل ہے جو اسلام کی مدافعت کے وقت ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے۔ موصوف نے افسوس کیا کہ یہ عمل جو ناپختگی کی علامت ہے مجھے اصل مشکل کا حقیقت پسندانہ سامنا کرنے سے روک رہا ہے۔ میں اِس الجزائری مصنّف کو

معذور سمجھتا ہوں۔ میں خود بھی پہلے اُنہی کا ہم خیال تھا۔ اور جب میں نے پہلی مرتبہ اس موضوع پر قلم اٹھایا تو اُس وقت میں بھی اُسی انداز پر سوچ رہا تھا جس انداز پر وہ آج سوچ رہے ہیں۔ اور جو مشکل آج انہیں درپیش ہے وہی مشکل اس وقت خود مجھے درپیش تھی۔ یعنی یہ کہ "تہذیب کسے کہتے ہیں ؟" اُس وقت تک میں نے اپنی اُن علمی اور فکری کمزوریوں سے نجات نہیں پائی تھی جو میری ذہنی اور نفسیاتی تعمیر میں رچ بس چکی تھیں۔ ان کمزوریوں کا ماخذ مغربی لٹریچر اور مغربی افکار و تصوّرات تھے جو بلاشبہ میرے اسلامی جذبہ و شعور کے لیے اجنبی تھے، اور اُس دَور میں بھی وہ میرے واضح اسلامی رجحان اور ذوق کے خلاف تھے تاہم ان بنیادی کمزوریوں نے میری فکر کو غبار آلود اور اُس کے پاکیزہ نقوش کو مسخ کر رکھا تھا۔ تہذیب کا وہ تصوّر جو یورپی فکر میں پایا جاتا ہے میری آنکھوں میں سمایا رہتا تھا، اس نے میرے ذہن پر پردہ ڈال رکھا تھا اور مجھے نکھری ہوئی اور حقیقت رس نظر سے محروم کر رکھا تھا۔ مگر بعد میں اصل تصویر نکھر کر سامنے آگئی اور مجھ پر یہ راز کُھلا کہ اسلامی معاشرہ ہی دراصل مہذّب معاشرہ ہوتا ہے۔ میں نے اپنی کتاب کے نام پر غور کیا تو معلوم ہُوا کہ اس میں لفظ "مہذّب" زائد ہے۔ اور اس سے مفہوم میں کسی نئی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ لفظ الٹا قاری کے احساسات پر اُس اجنبی فکر کی پرچھائیاں ڈال دے گا جو میرے ذہن پر بھی چھائی رہی ہیں اور جنھوں نے مجھے صحت مندانہ نگاہ سے محروم کر رکھا تھا۔

اب موضوع زیرِ بحث یہ ہے کہ "تہذیب کسے کہتے ہیں"۔ اس حقیقت کی وضاحت ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔

جب کسی معاشرے میں حاکمیت صرف اللہ کے لیے مخصوص ہو، اور اس کا عملی ثبوت یہ ہو کہ اللہ کی شریعت کو معاشرے میں بالاتری حاصل ہو تو صرف ایسے معاشرے میں انسان اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے کامل اور حقیقی آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی کامل اور حقیقی آزادی کا نام "انسانی تہذیب" ہے۔ اس لیے کہ انسان کی تہذیب ایک ایسا بنیادی ادارہ چاہتی ہے جس کی حدود میں انسان مکمل اور حقیقی آزادی سے سرشار ہو اور معاشرے کا ہر فرد غیر مشروط طور پر انسانی شرف و فضیلت سے متمتع ہو۔ اور جس معاشرے کا یہ حال ہو کہ اُس میں کچھ لوگ رب اور شارع بنے ہوں اور باقی اُن کے اطاعت کیش غلام ہوں، تو ایسے معاشرے میں انسان کو بحیثیت انسان کوئی آزادی نصیب نہیں ہوتی اور نہ وہ اُس شرف و فضیلت سے ہمکنار ہو سکتا ہے جو لازمۂ انسانیت ہے۔

یہاں ضمناً یہ نکتہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ قانون کا دائرہ صرف قانونی احکام تک ہی محدود نہیں ہوتا، جیسا کہ آج کل لفظ شریعت کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں محدود اور تنگ مفہوم پایا جاتا ہے۔ بلکہ تصوّرات، طریقۂ زندگی، اقدارِ حیات، ردّ و قبول کے پیمانے، عادات و روایات یہ سب بھی قانون کے دائرے میں آتے ہیں۔ اور افراد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر انسانوں کا ایک مخصوص گروہ یہ سب بیڑیاں یا دباؤ کے اسالیب ہدایتِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر تراش لے اور معاشرے کے دوسرے افراد کو ان میں مقیّد کر کے رکھ دے تو ایسے معاشرے کو کیوں کر آزاد معاشرہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو ایسا معاشرہ ہے

جس میں بعض افراد کو مقام ربوبیت حاصل ہے اور باقی لوگ ان ارباب کی عبودیت میں گرفتار ہیں۔ اس وجہ سے یہ معاشرہ پسماندہ معاشرہ شمار ہو گا یا اسلامی اصطلاح میں اُسے جاہلی معاشرہ کہیں گے۔

صرف اسلامی معاشرہ ہی وہ منفرد اور یکتا معاشرہ ہے جس میں اقتدار کی زمام صرف ایک الٰہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور انسان اپنے ہم جنسوں کی غلامی کی بیڑیاں کاٹ کر صرف اللہ کی غلامی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور یوں وہ کامل اور حقیقی آزادی سے جو انسان کی تہذیب کا نقطۂ ماسکہ ہے، بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اس معاشرے میں انسانی فضیلت و شرف اُسی حقیقی صورت میں نور افگن ہوتی ہے جو اللہ تعالےٰ نے اس کے لیے تجویز فرمائی ہے۔ اس معاشرے میں انسان ایک طرف زمین پر اللہ کی نیابت کے منصب پر سرفراز ہوتا ہے، اور دوسری طرف ملاء اعلیٰ میں اُس کے لیے غیر معمولی اعزاز اور مرتبہ بلند کا اعلان بھی ہو جاتا ہے۔

اسلامی معاشرہ اور جاہلی معاشرہ کی جوہری خصوصیات

جب کسی معاشرے میں انسانی اجتماع اور مدنیت کے بنیادی رشتے عقیدہ، تصوّر، نظریہ اور طریقِ حیات سے عبارت ہوں اور اُن کا ماخذ و منبع صرف ایک الٰہ ہو اور انسان نیابت کے درجہ پر سرفراز ہو۔ اور یہ صورت نہ ہو کہ فرمانروائی کا سرچشمہ زمینی ارباب ہوں اور انسان کے گلے میں انسان کی غلامی کا طوق پڑا ہو ——— بلکہ اس کے برعکس انسان صرف ایک خدا کے بندے ہوں، تو تبھی ایک ایسا پاکیزہ انسانی اجتماع وجود میں آ سکتا ہے، جو ان

تمام اعلیٰ انسانی خصائص کی جلوہ گاہ ہوتا ہے جو انسان کی روح اور فکر میں ودیعت ہیں۔ لیکن اس کے برعکس اگر معاشرے کے اندر انسانی تعلقات کی بنیاد رنگ و نسل، اور قوم و ملک اور اسی نوعیت کے دوسرے رشتوں پر رکھی گئی ہو تو ظاہر ہے کہ یہ رشتے زنجیریں ثابت ہوتے ہیں اور انسان کے اعلیٰ خصائص کو اُبھرنے کا موقع نہیں دیتے۔ انسان رنگ و نسل اور قوم و وطن کی حد بندیوں سے آزاد رہ کر بھی انسان ہی رہے گا مگر روح اور عقل کے بغیر وہ انسان نہیں رہ سکتا۔ مزید برآں یہ کہ وہ اپنے عقیدہ و تصوّر اور نظریۂ حیات کو اپنے آزاد ارادہ سے بدلنے کا بھی اختیار رکھتا ہے، مگر اپنے رنگ اور اپنی نسل میں تبدیلی پر قادر نہیں ہے، اور نہ اس بات کی اُسے قدرت حاصل ہے کہ وہ کسی مخصوص قوم یا مخصوص وطن میں اپنی پیدائش کا فیصلہ کرے۔ لہذا یہ ثابت ہوا کہ وہ معاشرہ جس میں انسانوں کا اجتماع ایک ایسی بات پر ہو جس کا تعلق اُن کی آزاد مرضی اور اُن کی ذاتی پسند سے ہو وہی معاشرہ نورِ تہذیب سے منوّر ہے۔ اس کے برعکس وہ معاشرہ جس کے افراد اپنے انسانی ارادے سے ہٹ کر کسی اور بنیاد پر مجتمع ہوں، وہ پسماندہ معاشرہ ہے۔ یا اسلامی اصطلاح میں وہ جاہلی معاشرہ ہے۔

اسلامی معاشرے ہی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس میں اجتماع کا بنیادی رشتہ عقیدہ پر استوار ہوتا ہے، اور اُسی میں عقیدہ ہی وہ قومی سند ہوتا ہے جو کالے اور گورے اور احمر و زرد، عربی اور رومی، فارسی اور حبشی اور ان تمام اقوام کو جو روئے زمین پر آباد ہیں ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا

ہے اور ایک ہی امت میں انہیں جمع کر دیتا ہے، جس کا پروردگار صرف اللہ ہوتا ہے اور وہ صرف اُسی کے آگے سر عجز و نیاز جھکاتی ہے، اُس میں معزز وہ ہے جو زیادہ متقی اور خدا ترس ہو گا، اس کے تمام افراد یکساں حیثیت رکھتے ہیں اور وہ سب ایسے قانون پر متفق ہوتے ہیں جو کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں بلکہ اللہ نے اُن کے لیے وضع فرمایا ہے۔

جب معاشرے کے اندر انسان کی انسانیت ہی اعلیٰ قدر سمجھی جاتی ہو، اور انسانی خصوصیات ہی مستحق تکریم اور لائق قدر ہوں تو یہ معاشرہ مہذب معاشرہ ہوتا ہے۔ اور اگر مادیت ——— خواہ وہ کسی شکل وصورت میں ہو ——— قدر اعلیٰ کا درجہ رکھتی ہو، قطع نظر اس کے کہ وہ نظریہ کی صورت میں ہو جیسے تاریخ کی مارکسی تعبیر میں قدر اعلیٰ مادہ پر مبنی ہے، یا مادی پیداوار کے رنگ میں ہو جیسا امریکہ، یورپ اور اُن تمام معاشروں کا حال ہے جو مادی پیداوار کو ہی اعلیٰ قدر قرار دیتے ہیں اور اس کی قربان گاہ پر تمام دوسری اقدار اور انسانی خصوصیات کو بھینٹ چڑھا دیتے ہیں ——— تو یہ معاشرہ پسماندہ معاشرہ کہلائے گا یا اسلامی اصطلاح میں اُسے جاہلی معاشرہ کہیں گے۔

مہذب معاشرہ ——— یعنی اسلامی معاشرہ ——— مادہ کو حقارت سے نہیں دیکھتا۔ نہ نظری طور پر اُسے خارج اعتبار ٹھیراتا ہے، اور نہ مادی پیداوار میں ہی اُسے نظر انداز کرتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ یہ کائنات جس میں ہم جی رہے ہیں اور جس پر ہم اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور جس سے

اثر پذیر بھی، مادّہ ہی سے بنی ہے۔ مادّی پیداوار کو وہ دنیا میں خلافت الٰہیہ کا پشتیبان سمجھتا ہے۔ پس فرق یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ مادّہ کو قدر اعلیٰ کا لباس پہنا کر اُسے ایک ایسا معبود قرار نہیں دیتا جس کے آستانہ تقدس پر انسان کی تمام روحانی و عقلی خصوصیات اور لوازم انسانیت کو نچھاور کر دیا جائے، فرد کی آزادی اور شرف اس پر قربان کر دیا جائے، خاندانی نظام کی بنیاد و اساس کو اس کی خاطر منہدم کر دیا جائے، معاشرتی اخلاق اور معاشرے کے مقدس رشتوں کو پامال کر دیا جائے، الغرض تمام بلند تر اقدار فضائل و مکارم اور عزّو شرف کو خاک میں ملا دیا جائے۔ جیسا کہ تمام جاہلی معاشرے مادی پیداوار کی فراوانی کے لیے یہ سب کچھ کر ڈالتے ہیں۔

اگر اعلیٰ انسانی اقدار اور ان پر تعمیر ہونے والے انسانی اخلاق کے ہاتھ میں معاشرے کی زمامِ کار ہو تو لاریب ایسا معاشرہ ہی صحیح معنوں میں گہوارۂ تہذیب ہوگا۔ انسانی اقدار اور انسانی اخلاق کوئی ڈھکی چھپی چیز یا ایسی چیز نہیں جو گرفت میں نہ آسکتی ہو، اور نہ یہ تاریخ کی مادی تعبیر اور سائنٹفک سوشلزم کے دعوے کے مطابق زمانے کے ساتھ ساتھ "ترقی" کرنے والی اور یوں ہر آن آمادۂ تغیر رہنے والی ہیں کہ کسی حال پر انہیں ٹھیراؤ نہ ہو اور کسی اصل و مرکز کے ساتھ ان کے قلابے ملے ہوئے نہ ہوں۔ بلکہ یہ وہ اقدار و اخلاق ہیں جو انسان کے اندر اُن انسانی خصائص کی آبیاری کرتی ہیں جو اُسے حیوان سے ممیز کرتی ہیں، اور جو انسان کے اندر اُس جوہر کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرتی ہیں جو اُسے حیوانوں کی صف سے نکال کر انسانوں کی صف میں لاتا ہے۔ یہ اقدار و اخلاق ایسے نہیں ہیں کہ

یہ انسان کے اندر اُن صفات کی پرورش کریں اور اُن پہلوؤں کو اُبھاریں جن میں انسان اور حیوان یکساں طور پر شریک ہیں۔

تہذیب کا اصل پیمانہ

مسئلہ تہذیب کو جب اس پیمانے سے ناپا جاتے تو ایک ایسا قطعی، اٹل اور ناقابل تغیر" خط فاصل اُبھر کر سامنے آجاتا ہے جو ان تمام کوششوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے جو ترقی پسندوں اور سائنٹفک سوشلزم کے علمبرداروں کی طرف سے تہذیبی اقدار و اخلاق کو مادۂ سیال بنانے کے لیے متواتر صرف کی جا رہی ہیں۔ مسئلہ تہذیب کی تشریح بالا سے یہ بھی عیاں ہو گیا کہ "ماحول" اور "عُرف" کی اصطلاحیں دراصل اخلاقی اقدار کا تعیّن نہیں کرتی ہیں بلکہ بدلتے ہوتے ماحول اور عُرف کے پس پردہ ایک ایسی ٹھوس اور تغیر" ناآشنا میزان ہوتی ہے جو ان کا تعیّن کرتی ہے، اور اس میزان کے اندر اس امر کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ کچھ اخلاق اور اقدار "زرعی" کہلائیں اور کچھ "صنعتی"، یا کچھ اخلاق و اقدار "سرمایہ دارانہ" ہوں اور کچھ "سوشلسٹ" یا "بورژوا اخلاق" اور "پرولتاری اخلاق"۔ اور پھر اُن اخلاقیات کا وجود بھی ختم ہو جاتا ہے جو ماحول، معیارِ زیست، عبوری دَور اور ایسے ہی دیگر سطحی اور متغیر" پیمانوں کی پیداوار ہوں۔ بلکہ اس سطحی تقسیم اور تعبیر کے برعکس یہاں "انسانی" اخلاق و اقدار ہوتی ہیں یا ان کے برعکس "حیوانی" اخلاق و اقدار۔ اسلامی اصطلاح میں اسی بات کو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اخلاقیات کی صرف دو ہی اصناف ہیں: اسلامی اخلاق و اقدار اور جاہلی اخلاق و اقدار!

یہ انسانی اخلاق واقدار انسان کے نفس میں اُن پہلوؤں کو جِلا دیتے ہیں جو انسان کو حیوان سے جُدا اور ممتاز کرتے ہیں، اسلام ان تمام معاشروں کے اندر جن پر اُسے غلبہ وسیادت نصیب ہوتی ہے ان اخلاق واقدار کی تخم ریزی کرتا ہے اور پھر انہیں سینچتا ہے، پروان چڑھاتا ہے، ان کی دیکھ بھال کرتا ہے، اور ان کی جڑوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا ہے۔ خواہ یہ معاشرے زرعی دَور سے گزر رہے ہوں یا صنعتی دَور سے۔ اور خواہ بدویانہ اور چرواہوں کے معاشرے ہوں اور جانوروں اور مویشیوں پر ان کی گزر بسر ہو، خواہ متمدّن اور قراریافتہ ہوں، خواہ نادار اور مفلس ہوں اور خواہ توانگر اور سرمایہ دار۔ اسلام ہر حالت میں انسانی خصائص کو ترقی دیتا رہتا ہے اور حیوانیت کی طرف جانے سے انہیں بچائے رکھتا ہے۔ دراصل اخلاق واقدار کی دنیا میں وہ خطِ فاصل جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں اُس کا اُبھار نیچے سے اُوپر کی طرف ہے۔ حیوانیت کی پست سطح سے انسانیت کی سطحِ مرتفع کی طرف جاتا ہے اور اگر یہ خط معکوس شکل اختیار کرے تو مادی ترقی (تہذیب) کے ہوتے ہوئے بھی اس کو تہذیب کا نام نہ دیا جا سکے گا، بلکہ یہ تنزّل وپسماندگی ہوگی یا جاہلیّت۔

تہذیب کے فروغ میں خاندانی نظام کی اہمیّت۔

اگر خاندان معاشرے کی اکائی ہو، اور خاندان کی بنیاد اس اصول پر ہو کہ زوجین کے درمیان تقسیم کار ہو اور جو جس کام کی خصوصی صلاحیّت اور فطری اہلیّت لے کر دنیا میں آیا ہے اُسی کے مطابق اپنی ذمّہ داریاں ادا کرے، اور نئی پود

کی تربیت و نگہداشت خاندان کا اصل وظیفہ ہو تو ایسا معاشرہ بلاشبہ مہذب معاشرہ ہوتا ہے۔ اس طرز کا خاندانی نظام اسلامی اصول حیات کے تحت وہ ماحول مہیا کر دیتا ہے جس میں اعلیٰ انسانی قدروں اور انسانی اخلاق کے شگوفے کھلتے ہیں اور نمو پذیر ہوتے ہیں اور نژادِ نو کو اپنی تازگی اور نکہت سے نوازتے ہیں۔ یہ قدریں اور اخلاق خاندانی اکائی کے علاوہ کسی اور اکائی کے اندر شرمندۂ وجود نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر جنسی تعلّقات، جنہیں "آزاد جنسی تعلّقات" کا نام دیا جاتا ہے، اور ناجائز نسل معاشرے کی بنیادی اینٹ ہوں، اور مرد و عورت کا باہمی رشتہ نفسانی خواہش، جنسی بھوک اور حیوانی اکساہٹ پر قائم ہو اور خاندانی ذمّہ داریوں اور قدرتی صلاحیتوں کے مطابق تقسیم کار کے اصول پر استوار نہ ہو۔ عورت کا کام صرف زینت و آرائش، دلرُبائی اور ناوک اندازی ہو، اور وہ نئی پود کی تربیّت و نگہداشت کے منصب اساسی سے دست بردار ہو جائے، اور خود یا معاشرے کی طلب پر کسی ہوٹل، یا بحری جہاز یا ہوائی جہاز میں "مہمان نواز" بننے کو ترجیح دے، اور اس طرح وہ اپنی تمام صلاحیتیں اور قوتیں انسان سازی کے بجائے مادّی پیداوار اور سامان سازی پر صرف کر دے۔ کیوں کہ "انسانی پیداوار" کی نسبت اُس کے لیے مادّی پیداوار زیادہ نفع بخش، زیادہ عزّت افزا اور زیادہ باعثِ نمود و ستائش ہے پس جب نوبت یہ آجائے تو اسے انسانیّت کے لیے تہذیبی پس ماندگی اور تہذیبی افلاس کا پیغام سمجھنا چاہیئے۔ اسی حالت کو اسلامی اصطلاح میں جاہلیّت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خاندانی نظام اور زوجین کے باہمی تعلّقات کی بنیاد یہ ایک ایسا اہم مسئلہ ہے جو معاشرے کی حیثیّت

متعین کرنے میں فیصلہ کن اور حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے ہم جان سکتے ہیں کہ کوئی معاشرہ پسماندہ ہے یا مہذّب، جاہلی ہے یا اسلامی۔ جن معاشروں پر حیوانی اقدار و اخلاق اور حیوانی جذبات و رجحانات کی سیادت ہوتی ہے وہ کبھی مہذّب معاشرے نہیں ہو سکتے۔ چاہے صنعتی، اقتصادی اور سائنسی ترقی میں وہ کتنے ہی عروج پر ہوں۔ یہ وہ پیمانہ ہے جو "انسانی ترقی" کی مقدار معلوم کرنے میں کبھی غلطی نہیں کرتا۔

تہذیب مغرب کا حال

عہدِ حاضر کے جاہلی معاشروں میں اخلاق کا مفہوم اس حد تک محدود ہو کر رہ گیا ہے کہ اس کے دائرے سے ہر وہ پہلو خارج ہو چکا ہے جو انسانی صفات اور حیوانی صفات میں خطِ فاصل کا کام دے سکتا ہے۔ ان معاشروں کی نگاہ میں ناجائز جنسی تعلّقات بلکہ افعالِ ہم جنسی تک بھی اخلاقی رذالت اور عیب شمار نہیں ہوتے۔ اخلاق کا مفہوم قریب قریب اقتصادی معاملات کے اندر محصور ہو کر رہ گیا ہے۔ اور کبھی کبھار سیاست کے اندر بھی اس کا چرچا ہوتا ہے مگر ریاست کے مفادات کی حد تک۔ چنانچہ مثال کے طور پر کرسٹین کیلر اور برطانوی وزیر پروفیمو کا اسکنڈل جنسی پہلو سے برطانوی معاشرے کے اندر کوئی گھناؤنا واقعہ نہیں تھا۔ یہ اگر "شرمناک" تھا تو صرف اس پہلو سے کہ کرسٹین کیلر بیک وقت پروفیمو کی معشوقہ بھی تھی اور روسی سفارت خانے کے ایک بحری اتاشی سے بھی اُس کا معاشقہ تھا۔ اس وجہ سے نو عمر حسینہ کے ساتھ ایک وزیر کا تعلقات قائم کرنا ریاست کے رازوں کے لیے باعث خطرہ تھا۔ اس

پر اضافہ یہ ہوا کہ اس وزیر نے دروغ گوئی سے کام لیا اور برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے اُس کے جھُوٹ کا پول کھُل گیا۔ اسی واقعہ سے ملتے جلتے وہ اسکنڈل ہیں جو امریکی سینٹ کے اندر افشا ہوتے رہتے ہیں، اور ان انگریز اور امریکی جاسوسوں اور سرکاری ملازمین کی حیا سوز داستانیں ہیں جو فرار ہو کر رُوس پناہ لے چکے ہیں مگر یہ سب واقعات اس پہلو سے کوئی اخلاقی حادثہ نہیں سمجھے گئے کہ ان کے پیچھے فعل ہم جنسی کا گھناؤنا پس منظر ہے بلکہ انہیں صرف اس وجہ سے اہمیت حاصل ہو گئی ہے کہ ریاست کے راز ان کی لپیٹ میں آتے تھے۔

دُور و نزدیک کے تمام جاہلی معاشروں میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ارباب نگارش، اہل صحافت اور ادباء و افسانہ نویس نوخیز دوشیزاؤں اور شادی شدہ جوڑوں کو برملا یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ آزاد جنسی تعلقات قطعاً اخلاقی عیب نہیں ہیں۔ ہاں اگر کوئی لڑکا اپنی فرینڈ گرل یا کوئی لڑکی اپنے فرینڈ بوائے سے سچی محبت کے بجائے جھوٹا پیار کرے تو یہ بلاشبہ عیب کی بات ہے۔ بُرائی یہ ہے کہ بیوی ایسی صورت میں بھی اپنی عفت و ناموس کی حفاظت کرتی رہے جب کہ اُس کے سینے میں اپنے خاوند کی محبت کی آگ بجھ چکی ہو۔ اور خوبی یہ ہے کہ وہ کوئی دوست تلاش کرے اور فراخ دلی کے ساتھ اپنا جسم اُسے پیش کر دے۔ بیسیوں ایسی تحریریں ملتی ہیں جن میں اسی آوارگی اور آزاد خیالی کی دعوت دی جا رہی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اخبارات کے اداریے، فیچر، کارٹون، سنجیدہ اور مزاحیہ کالم اِسی طرزِ حیات کا مشورہ دے رہے ہیں۔

خاندانی نظام کا اصل رول

انسانیت کے نقطۂ نگاہ کی رو سے اور ارتقائے انسانیت کے پیمانے کے مطابق ایسے معاشرے پسماندہ اور بیگانۂ تہذیب معاشرے ہیں۔ انسانیت کے ارتقاء کا خط جس سمت کو جاتا ہے اُس میں ہم دیکھتے ہیں کہ حیوانی جذبات کو لگام دی جاتی ہے، اور اُن کی تسکین کا دائرہ محدود کیا جاتا ہے۔ اس غرض کے لیے ایک خاندان کی بنیاد ڈالی جاتی ہے، اور اس میں کام اور فرائض کی تقسیم فطری صلاحیتوں اور ذمہ داریوں کے مطابق کی جاتی ہے، اس خاندانی نظام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ جذبات وہ اصل انسانی وظیفہ سرانجام دیں جس کی غرض و غایت محض لذت پسندی نہیں ہے بلکہ ایسی انسانی نسل کی فراہمی ہے جو نہ صرف موجودہ نسل کی جانشین ہو بلکہ اُس ممتاز اور بے نظیر انسانی تہذیب کی سچی وارث بن کر اُٹھے جس میں انسانی خصوصیات و اوصاف کے گلہائے رنگ رنگ عطر بیز رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی انسانی نسل جو حیوانی خصائص و جذبات کو پابجولاں رکھے اور انسانی خصائص کو زیادہ سے زیادہ ترقی و کمال تک پہنچائے صرف اُسی گہوارہ سے نکل سکتی ہے۔ جس کے چاروں طرف تحفظات کی ایسی باڑھ کھڑی کر دی گئی ہو جس کے اندر ذہنوں کو پورا سکون نصیب ہو اور جذبات کسی ہیجان خیزی کا نشانہ نہ بننے پائیں اور جس گہوارہ کی داغ بیل ایک ایسے اہم فرض کو ادا کرنے کے لیے ڈالی گئی ہو جو وقتی جذبات اور ہنگامی تاثرات سے متاثر نہیں ہوتا۔ مگر جس معاشرے کی آبیاری ناپاک تعلیمات اور زہر آلود مشوروں سے کر رہے ہوں اور جس میں اخلاقی تصورات کا دائرہ اِس

حدتک بگڑ جائے کہ وہ معاشرہ تمام جنسی آداب سے عاری ہو جائے تو ایسے معاشرے میں انسانیت ساز گہوارہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اسلامی اقدار و اخلاق اور اسلامی تعلیمات و تحفظات ہی انسان کے لیے مفید اور مناسب ہو سکتے ہیں اور ترقی کے ٹھوس اور غیر متغیر پیمانے کی رُو سے اسلام ہی اصل تہذیب ہے اور اسلامی معاشرہ ہی تہذیب کی اصل جلوہ گاہ ہے۔

خدا پرست تہذیب اور مادّی ترقی

خلاصہ یہ کہ جب انسان دنیا کے اندر اللہ کی خلافت کو ہمہ پہلو قائم کرتا ہے، اور اس کے تقاضے میں وہ صرف اللہ کی بندگی کے لیے وقف ہو جاتا ہے، غیر اللہ کی ہر نوعیت کی عبودیت سے کاملتہً چھٹکارا پا لیتا ہے، صرف اللہ کے پسندیدہ نظامِ زندگی کو قائم کرتا ہے اور دوسرے تمام غیر الٰہی نظام ہائے حیات کے جواز کو مسترد کر دیتا ہے، اپنی زندگی کے ہر زاویے پر اللہ کی شریعت کو فرماں روا بناتا ہے اور دوسرے ہر قانون اور شریعت سے دستبردار ہو جاتا ہے، ان اقدار و اخلاق کو آویزۂ گوش بناتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائے ہیں اور نام نہاد اخلاق و اقدار کو دیوار پر دے مارتا ہے۔ ایک طرف وہ یہ رویّہ اختیار کرتا ہے اور دوسری طرف اُن کائناتی قوانین کا کھوج لگاتا ہے جو اللہ تعالےٰ نے مادی اسباب کے اندر ودیعت کر رکھے ہیں، اور زندگی کو ترقی سے ہمکنار کرنے کے لیے ان قوانین سے استفادہ کرتا ہے، انہیں زمین کے خام خزانوں اور خوراک کے اُن لامتناہی ذخیروں کی دریافت کے لیے استعمال کرتا ہے جو

اللہ تعالیٰ نے سینۂ کائنات کے اندر چھپا رکھے ہیں اور اپنے نوامیس سے انہیں سر بمہر کر رکھا ہے اور انسان کو یہ قدرت دے دی ہے کہ وہ ان مہروں کو اس حد تک توڑ سکتا ہے جس حد تک ایسا کرنا اس کے لیے نیابت الٰہی کا فرض سرانجام دینے کے لیے ضروری اور ناگزیر ہو۔ الغرض جب انسان دنیا کے اندر اللہ کے عہد و میثاق کے مطابق خلافت الٰہیہ کا بول بالا کرتا ہے اور اس خلافت کے زیر سایہ وہ رزق کے خزانوں کا انکشاف کرتا ہے، مادۂ خام کو صنعت میں تبدیل کرتا ہے اور گوناگوں صنعتیں وجود میں لاتا ہے اور اُن سارے فنی تجربوں اور علمی معلومات کو کام میں لاتا ہے جو انسانی تاریخ کا حاصل ہیں۔ وہ ان تمام امور کو ایک خدا پرست انسان، اللہ کا خلیفۂ برحق اور سچا عبادت گزار ہونے کی حیثیت سے انجام دیتا ہے جب انسان زندگی کے مادی اور اخلاقی پہلوؤں میں یہ رویہ اختیار کرتا ہے تو بلاشبہ اُس وقت انسان تہذیبی لحاظ سے درجۂ کمال کو پہنچتا ہے اور ایسا انسانی معاشرہ تہذیب کے بامِ عروج پر متمکن ہوتا ہے۔ رہی محض مادی ایجادات تو اسلام کی نگاہ میں اُنہیں تہذیب نہیں کہا جا سکتا۔ مادی ترقی اور جاہلیت ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ عین ممکن ہے کہ معاشرے کے اندر مادی ترقی عروج پر ہو مگر اس کے باوجود اس میں جاہلیت کا دور دورہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر جاہلیت کا ذکر کرتے وقت جاہلی معاشرے کی مادی ترقی کو بھی بیان کیا ہے۔ ذیل کی آیات میں اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں:

أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ۝ وَتَتَّخِذُونَ

مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ○ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ○ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○ وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ○ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ○ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ (الشعراء: ۱۲۸ تا ۱۳۵)

یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو، اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے۔ اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو جبّار بن کر ڈالتے ہو۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ڈرو اُس سے جس نے وہ کچھ تمہیں دیا ہے جو تم جانتے ہو۔ تمہیں جانور دیے، اولادیں دیں، باغ دیے اور چشمے دیے۔ مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ○ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ○ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ○ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ○ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ

(الشعراء: ۱۴۶ تا ۱۵۲)

کیا تم اُن سب چیزوں کے درمیان، جو یہاں ہیں، بس یونہی

اطمینان سے رہنے دیے جاؤ گے؟ اِن باغوں اور چشموں میں؟ اِن کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں؟ تم پہاڑ کھود کھود کر فخریہ ان میں عمارتیں بناتے ہو۔ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اُن بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (انعام : ۴۴، ۴۵)

پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو، جو انہیں کی گئی تھی، بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے، یہاں تک کہ جب وہ اُن بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔ اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا اور تعریف ہے اللہ رب العالمین کے لیے (کہ اس نے ان کی جڑ کاٹ دی)۔

حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا

وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ اَتٰهَآ
اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ
تَغْنَ بِالْاَمْسِ ط (یونس : ۲۴)

پھر عین اس وقت جب کہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں، یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آگیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔

لیکن، جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں اسلام مادّی ترقی اور مادّی وسائل کے خلاف نہیں ہے اور ان کی اہمیت کو کم نہیں کرتا بلکہ نظام الٰہی کے زیر سایہ ہونے والی مادّی ترقی کو اللہ تعالےٰ ایک نعمت کی حیثیت دیتا ہے۔ اور اطاعت و فرمانبرداری کے صلہ میں انسانوں کو اس نعمت کی بشارت بھی دیتا ہے۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝
يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ
وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝

(نوح : ۱۰ تا ۱۲)

(حضرت نوحؑ کہتے ہیں کہ) میں نے قوم سے کہا کہ تم اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کرو۔ بیشک وہ مغفرت قبول کرنے والا ہے۔ وہ تم پر مُوسلا دھار بارشیں برسائے گا اور اموال

اور اولادوں سے تمہیں قوت بخشے گا اور تمہارے لیے باغ بنائے گا اور ان میں تمہارے لیے نہریں جاری کرے گا۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ٥

(الاعراف : ۹۶)

اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم اُن پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے، مگر اُنہوں نے تو جھٹلایا، لہٰذا ہم نے اُس بُری کمائی کے حساب میں اُنہیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔

مادّی ترقی اصل چیز نہیں ہے بلکہ اصل چیز وہ بنیادی تصور ہے جس پر مادّی اور صنعتی ترقی کی عمارت قائم ہوتی ہے اور وہ اقدارِ حیات ہیں جن کو معاشرے میں قدر و منزلت حاصل ہوتی ہے اور جن کے مجموعی عمل سے انسانی تہذیب کے خصائص و نقوش تیار ہوتے ہیں۔

اسلامی معاشرے کے آغاز اور ارتقاء کا فطری نظام

اسلامی معاشرہ کا ایک تحریکی بنیاد پر قائم ہونا اور اس کا ایک نمو پذیر نظام کی حیثیت اختیار کرنا یہ دونوں خوبیاں مل کر اسلامی معاشرے کو اپنی طرز کا منفرد اور لاثانی معاشرہ بنا دیتی ہیں جس پر وہ نظریات و رجحانات منطبق نہیں ہو سکتے جو جاہلی معاشروں کے قیام اور ان کی نمو پذیر فطرت

کے لیے مناسب ہوتے ہیں۔ اسلامی معاشرے کی ولادت ایک تحریک کی جدّوجہد کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ یہ تحریکی نظام اس کے اندر برابر برسرِ عمل رہتا ہے، یہ تحریک ہی معاشرے کے ہر ہر فرد کی قیمت اور اس کا مرتبہ و مقام متعین کرتی ہے، اور پھر اسی اصلی قیمت کی روشنی میں معاشرے کے اندر اُس کی اصل ڈیوٹی اور اجتماعی حیثیت طے کرتی ہے۔ جس تحریک کے بطن سے یہ معاشرہ جنم لیتا ہے اس تحریک کا فکری و عملی ماخذ عالمِ آب و گِل سے ماوراء اور بشری دائرہ سے خارج ہوتا ہے۔ یہ تحریک درحقیقت اُس عقیدہ کی متحرک تصویر ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر نازل کیا گیا ہے اور جو انسان کو کائنات اور زندگی اور انسانی تاریخ کے بارے میں مخصوص تصوّر دیتا ہے، زندگی کے مقاصد اور اقدار کا نیا مفہوم عطا کرتا ہے اور جدوجہد کا مخصوص طریقہ سکھاتا ہے جو اس کے مزاج اجتماعی کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ چنانچہ وہ محرّک اوّلین جو آفتابِ تحریک کے طلوع کا باعث بنتا ہے اُس کی چنگاریوں کا مرکز انسانی نفوس نہیں ہوتے اور نہ مادی کائنات کا کوئی گوشہ اُس کی حرارت اور سرگرمی کا ماخذ ہوتا ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے وہ محرّک کرۂ ارضی سے ماوراء اور عالمِ بشری سے بالاتر ماخذ سے صادر ہوتا ہے۔ اور یہی وہ خاص خوبی ہے جو اسلامی معاشرے اور اُس کے اجزائے ترکیبی کو دوسرے تمام معاشروں سے ممیز کرتی ہے۔

تحریکِ اسلامی کے فطری مراحل اور اس کا مخصوص نظامِ عمل

یہ غیر مادی عنصر جو تقدیرِ الٰہی سے پردۂ غیب سے وجود میں آتا ہے

اس کے وجود میں آنے سے پہلے انسان کا ذہن بالکل خالی ہوتا ہے اور اس کے آغاز میں بھی انسان کی کسی کوشش کو دخل نہیں ہوتا۔ اِسی عنصر کے مطابق پر تحریک ایک اسلامی معاشرے کی تخم ریزی کا پہلا قدم اُٹھاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اُس کی طرف سے "انسان سازی" کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اور ایک ایسے انسان کی تیاری کی مہم شروع ہو جاتی ہے جو اس عقیدہ پر ایمان رکھتا ہو جو منبعِ غیب سے القاء ہوا ہے اور جسے خالصتاً تقدیرِ خداوندی نے جاری فرمایا ہے اگر ایک انسانی فرد بھی اس عقیدہ پر ایمان لے آتا ہے تو اصولاً اسلامی معاشرے کی داغ بیل پڑ جاتی ہے۔ یہ فردِ واحد اس نئے عقیدہ کو قبول کرنے کے بعد اُسے اپنے نہاں خانۂ دماغ کی زینت بنا کر نہیں رکھتا، بلکہ وہ اسے لے کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس عقیدے کی یہی فطرت ہے اور ایک توانا اور فعّال تحریک کی فطرت بھی یہی ہوتی ہے۔ جس بالاتر طاقت نے اس عقیدہ کا چراغ انسان کے دل میں روشن کیا ہے وہ خوب جانتی ہے کہ یہ عقیدہ وادیٔ دل سے نکل کر کائنات انسانی کے ذرّہ ذرّہ پر نقش ثبت کر کے رہے گا، اور وہ پہلا شعلۂ فروزاں جس کی بدولت دل کی دنیا نورِ عقیدہ سے منوّر ہوتی ہے وہ لازماً باہر کی دنیا میں بھی پھیل کر رہے گا۔

اس عقیدہ پر ایمان لانے والوں کی تعداد جب تین افراد تک پہنچ جاتی ہے تو یہ عقیدہ اُن کو بتاتا ہے کہ: "اب تم ایک معاشرہ بن گئے ہو، ایک جداگانہ اسلامی معاشرہ، اور اس جاہلی معاشرے سے ممتاز معاشرہ، جو اس عقیدہ کو تسلیم نہیں کرتا اور جس میں اس عقیدہ کی بنیادی اقدار کو بالاتری حاصل نہیں ہوتی (وہی بنیادی

اقدار جن کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں)"۔ اب اسلامی معاشرہ بالفعل وجود میں آ گیا ہے۔ یہی تین افراد بڑھ کر دس بن جاتے ہیں، اور دس کی جدّوجہد سے سو ——— ہزار ——— ۱۲ ہزار بن جاتے ہیں۔ اور اس طرح اسلامی معاشرے کا ڈھانچہ متشکل ہوتا جاتا ہے، اور اس کی جڑیں گہری ہوتی جاتی ہیں۔ اس تحریکی ترقی کے دَوران میں جاہلیّت سے کشمکش بھی چھڑ چکی ہوتی ہے۔ ایک طرف وہ نومولود معاشرہ ہوتا ہے جو عقیدہ و تصوّر کے لحاظ سے، اقدار حیات اور تہذیبی پیمانوں کے لحاظ سے، اپنے تنظیمی ڈھانچے اور جداگانہ وجود کے لحاظ سے جاہلی معاشرے سے الگ ہو چکا ہوتا ہے، اور دوسری طرف جاہلی معاشرہ ہوتا ہے جس کے اندر سے اسلامی معاشرہ موزوں افراد کو چھانٹ کر اپنے اندر جذب کرتا ہے۔ یہ تحریک اس درمیانی مرحلہ میں جو اس کے آغاز سے لے کر اُس کے ایک نمایاں اور قائم بالذات معاشرے کی صورت میں نمایاں ہونے تک کی مدّت پر پھیلا ہوتا ہے، اپنے معاشرے کے ہر ہر فرد کی خوب اچھی طرح آزمائش کر چکی ہوتی ہے، اور معاشرے کے اندر ہر فرد کو وہی مرتبہ و مقام اور وزن دیتی ہے جس کا وہ اسلامی میزان اور اسلامی کسوٹی کی رُو سے مستحق ہوتا ہے۔ معاشرے کی طرف سے خود بخود اُس کے اس مرتبہ و مقام کا اعتراف کیا جاتا ہے اور اُس کو اس بات کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ خود بڑھ کر اپنی اہلیّت کا ثبوت پیش کرے اور پھر اُس کا اعلان کرتا پھرے۔ بلکہ اُس کا عقیدہ اور وہ مقدّس اقدار جنہیں اُس کی ذات پر اور اُس کے معاشرے پر بالاتری حاصل ہوتی ہے اُسے مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان نگاہوں سے اپنے آپ کو چھپا کر رکھے جو اُس کے

آس پاس اُس کی جانب اُٹھ رہی ہیں اور اُسے کوئی ذمّہ دارانہ منصب سونپنا چاہتی ہیں۔ لیکن تحریک ——— جو عقیدہ اسلامی کا طبعی نتیجہ اور اس عقیدہ کی کوکھ سے جنم لینے والے معاشرے کا فطری جوہر ہے ——— اپنے کسی فرد کو گوشۂ خمول کی نذر نہیں ہونے دیتی۔ اس تحریک کے ہر فرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ سرگرمِ عمل ہو، اس کے عقیدہ میں جوش و خروش ہو، اس کے خون میں حرارت ہو، اُس کا معاشرہ سیمابی کیفیت کا حامل ہو اور اس توانا معاشرے کی تکمیل کے لیے ہر شخص دانۂ سپند کی مانند مضطرب و بے قرار ہو۔ اور اِس جاہلیت کا بھرپور مقابلہ کرے جو اُس کے ماحول پر مسلّط ہے، جس کے بچے کھچے اثرات خود اس کے اپنے نفس میں اور اس کے ساتھیوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔ پس یہ کشمکش ایک دوامی کشمکش ہے۔ یہی مفہوم ہے اس ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا جس میں فرمایا گیا ہے کہ جہاد قیامت تک کیلیے جاری و ساری رہے گا۔

اپنے سفر کے دوران میں تحریک جن نشیب و فراز سے گزرتی ہے وہی دراصل یہ طے کر دیتے ہیں کہ تحریکی معاشرے کے اندر ہر ہر رکن کی حیثیت اور اُس کا دائرہ کار کیا ہے۔ یہ بات نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیئے کہ افراد اور مناصب و فرائض کے درمیان اعلیٰ قسم کی مناسبت اور ہم آہنگی کی بدولت ہی تحریک پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہے۔ اسلامی معاشرے کا یہ طرزِ آغاز و نشو و نما اور یہ اسلوبِ تکمیل اس کی دو ایسی نمایاں خصوصیتیں ہیں جو اس کے وجود و ترکیب کو، اس کے مزاج اور شکل کو، اس کے نظام اور اس کے عملی

طریقِ کار کو دوسرے تمام معاشروں سے ممیّز کرتی ہیں اور اسے منفرد اور جداگانہ حیثیت عطا کرتی ہیں۔ اس کے بعد یہ سوال ہی خارج از بحث ہو جاتا ہے کہ دوسرے اجتماعی نظریات کے ذریعہ بھی اسلامی معاشرہ اور اس کے ان تمام اوصاف کو جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے حاصل کیا جا سکتا ہے، یا کسی ایسے نظامِ تعلیم کے ذریعہ ان کو سمجھا جا سکتا ہے جو اس کی فطرت کے خلاف ہو، یا انہیں کسی دوسرے نظامِ حیات سے مستعار طریقہ کار کے ذریعہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی تہذیب پوری انسانیت کی میراث ہے۔

عام ڈگر سے ہٹ کر ہم نے "تہذیب" کی جو تعریف کی ہے، اس کی روشنی میں اسلامی معاشرہ محض ایک تاریخی مرحلے ہی کا نام نہیں ہے جسے صرف اوراقِ ماضی میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ عہدِ حاضر کی طلب اور مستقبل کی آرزو اور تمنّا ہے۔ یہ وہ گوہرِ مقصود ہے جس سے تمام انسانیت آج بھی شرف یاب ہو سکتی ہے اور آئندہ بھی۔ اور اس کی بدولت وہ جاہلیت کے اُس قعرِ مذلت سے نکل سکتی ہے جس میں آج وہ لڑھک رہی ہے، اس قعرِ مذلت میں وہ قومیں بھی گری ہوئی ہیں جو صنعتی اور اقتصادی ترقی میں دوسروں کی امام ہیں وہ بھی جو پسماندہ اور کمزور کہلاتی ہیں۔

یہ اقدار جن کی طرف ہم مجمل اشارہ کر آئے ہیں، انسانی اقدار ہیں، انسانیت نے ان اقدار کو اب تک صرف ایک دَور میں جلوہ گر دیکھا ہے، اور وہ تھا "اسلامی تہذیب" کا دَور —— "اسلامی تہذیب" سے ہماری مراد وہ تہذیب ہے جس میں یہ اقدار بدرجہ اتم پائی جاتی ہوں۔ اور جو تہذیب ان اقدار سے

خالی ہو چاہے وہ صنعت و اقتصاد اور سائنس میں کتنی ہی بام عروج پر ہو، اسلامی تہذیب ہرگز نہ ہوگی۔

یہ اقدار محض تخیّل کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ سرتاپا عملی اقدار ہیں اور حقیقت کی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ انسان جب بھی صحیح اسلامی مفہوم کی روشنی میں ان کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے گا، ان کو پالے گا۔ ان کو ہر ماحول میں عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے، خواہ وہاں کوئی سا نظام زندگی پایا جاتا ہو اور صنعت و اقتصاد اور سائنس میں اس کی ترقی کی حد خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اقدار خلافت ارضی کے کسی بھی پہلو میں انسان کو ترقی سے نہیں روکتیں۔ کیونکہ اسلامی عقیدہ کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ ہمہ پہلو ترقی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اقدارِ حیات ان ممالک کے اندر خاموش تماشائی بن کر بیٹھنے پر بھی راضی نہیں جو اخلاقی میدان میں پسماندہ ہیں۔ یہ ایک عالم گیر تہذیب ہے اور ہر ماحول میں اور ہر خطّے میں پروان چڑھ سکتی ہے مگر انہی اقدار کے ستونوں پر جو اس کی اپنی امتیازی اقدار ہیں رہی ان اقدار کی مادّی تشکیلات اور مظاہر تو ان کی تحدید اور حصر ناممکن ہے کیونکہ مادّی تشکیلات ہر ماحول میں اُنہی صلاحیتوں اور قوتوں کو، جو بالفعل وہاں پائی جاتی ہیں، استعمال کرتی ہیں اور ان کو نشوونما دیتی ہیں۔

اس سے یہ واضح ہو گیا کہ اسلامی معاشرہ اپنی ہیئت و صورت، حجم و وسعت اور طرز زندگی کے اعتبار سے تو بلاشبہ جامد اور غیر متبدل تاریخی تصویر نہیں ہے مگر اسلامی معاشرہ کا وجود اور اس کی تہذیب لازماً ایسی اقدار سے مربوط ہوتا ہے جو حد درجہ ٹھوس، تغیر ناآشنا اور تاریخ انسانی کے اٹل حقائق

ہیں۔ زندگی کی ان اسلامی اقدار کو جب ہم "تاریخی حقائق" کہتے ہیں، تو اس سے ہماری مراد صرف اتنی ہوتی ہے کہ یہ اقدار تاریخ کے ایک مخصوص مرحلے میں جلوہ گر رہی ہیں اور انسان ان کو خوب جانتا پہچانتا ہے ان کو تاریخی اقدار قرار دینے کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ یہ تاریخ کی پیدا کردہ ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ اقدار اپنی فطرت کے لحاظ سے کسی مخصوص زمانے کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں، بلکہ ہر دَور کے لیے ہیں، اور یہ انسانوں کے پاس اُس سرچشمۂ ازل سے آئی ہیں جو ربانی منبع ہے، اور جو دائرۂ انسانیت سے بلکہ خود مادّی کائنات کے دائرہ سے ماوراء اور بالاتر ہے۔

اِسلامی تہذیب کی مادّی شکلیں زمانے اور ماحول کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

اِسلامی تہذیب اپنی مادّی اور ظاہری تنظیم کے لیے گوناگوں اور بوقلموں شکلیں اختیار کر سکتی ہے لیکن یہ تہذیب جن اصولوں اور قدروں پر استوار ہوتی ہے وہ بیشک دائمی اور جامد اقدار ہیں، اس لیے کہ وہ اس تہذیب کے حقیقی ستون اور پشتیبان ہیں، اور وہ ہیں: صرف خدا کی بندگی، عقیدۂ توحید کی بنیاد پر انسانی اجتماع، مادیّت پر انسانیت کا غلبہ، انسانی اقدار کا فروغ اور اس کے ذریعے انسان کے اندر کے حیوان کی تسخیر اور انسانیت کی نشو ونما میں اس کا استعمال، خاندانی نظام کا احترام، زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت کا قیام اللہ ہی کی ہدایت وتعلیم اور عہد وشرط کے مطابق، اور خلافت کے تمام معاملات پر صرف اللہ کی شریعت اور الٰہی طریقِ حیات کی حکمرانی!

جیساکہ ہم بتا چکے ہیں اسلامی تہذیب مادی تنظیمات کے لیے اُن صلاحیتوں کو استعمال کرتی ہے جو بالفعل کسی ماحول میں موجود ہوتی ہیں، اس لیے اسلامی تہذیب کی مادی صورتیں اور خاکے پائیدار اور ابدی اقدار پر استوار ہونے کے باوجود صنعتی، اقتصادی اور سائنٹفک ترقی کے مختلف درجوں اور مرحلوں سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے ان شکلوں اور خاکوں میں برابر تبدیلی ہوتے رہنا ناگزیر ہے۔ بلکہ یہ تبدیلی بجائے خود یہ ضمانت فراہم کرتی ہے کہ اسلام کے اندر ایسی لچک اور گنجائش موجود ہے کہ وہ ہر قسم اور ہر سطح کے ماحول میں داخل ہوکر زندگی کو اپنے حسب منشا ڈھال سکتا ہے۔ اسلامی تہذیب کی ظاہری اور خارجی صورتوں میں لچک اور تغیّر پذیری کا وجود عقیدۂ اسلام پر جو تہذیب کا ماخذ ہے، کہیں باہر سے ٹھونسا نہیں گیا ہے بلکہ یہ خود اس عقیدہ کی فطرت اور مزاج کا تقاضا ہے۔ البتہ یہ پیش نظر رہے کہ کسی چیز کے لچک دار ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اُسے مادۂ سیال میں تبدیل کر دیا جائے۔ لچک میں اور اس طرح کے سیال پن میں بہت بڑا فرق ہے۔

اسلام نے وسطی افریقہ کے اندر ننگ دھڑنگ اقوام کے اندر تہذیب کی بنیاد ڈال دی تھی، اور اس کا اثر یہ تھا کہ جہاں جہاں اور جیسے جیسے وہ اسلام سے متاثر ہوتے عریانی اور ننگے جسم ستر پوش ہوتے جاتے۔ اور برہنہ گھومنے والے انسان لباس پہن کر دائرہ تہذیب میں داخل ہو جاتے۔ یہ سب اسلامی تعلیمات ہی کا کرشمہ تھا، ان تعلیمات کا، جو فکر انسانی کو عزلت و تنہائی سے نکال کر بصیرت افروز حقائق سے روشناس کرتیں، انسانی ذہنوں کو جلا بخشتیں اور انسانوں کو اس قابل بنا دیتیں کہ وہ

کائنات کے مادی خزانوں کو اپنے تصرف میں لا سکیں۔ ان کے زیر اثر انسان قبیلہ اور برادری کے محدود دائروں سے نکل کر امت اور ملت کے دائرہ میں داخل ہو جاتے۔ اور غاروں میں بیٹھ کر سورج دیوتا کی پرستش کرنے کے بجائے پروردگار عالم کی بندگی اختیار کر لیتے ـــــــــ پس اگر اس عظیم انقلاب کا نام تہذیب نہیں ہے تو پھر تہذیب کس بلا کا نام ہے؟ یہ اس خاص ماحول کی تہذیب ہے جو اپنے اندر بالفعل پائے جانے والے وسائل و ذرائع پر اعتماد کرتا ہے۔ اگر اسلام کسی اور ماحول میں داخل ہوگا، تو وہاں وہ اپنی تہذیب کو وہ شکل دے گا جو اس ماحول کے وسائل و ذرائع اور اُس کے اندر بالفعل پائی جانے والی صلاحیتوں کو استعمال کرنے اور انہیں مزید نشو و نما دینے کے لیے ضروری ہے۔ الغرض اسلامی طریق حیات کے تحت تہذیب کا قیام و فروغ صنعتی، اقتصادی اور علمی ترقی کے کسی مخصوص معیار پر موقوف نہیں ہے، تہذیب جہاں بھی قائم ہو گی وہاں کے مادی وسائل و امکانات کا پورا پورا استعمال کرے گی اور انہیں مزید ترقی دے گی، ان کے مقاصد کو اعلیٰ و ارفع حیثیت عطا کرے گی، اور جہاں مادی وسائل و امکانات موجود نہ ہوں گے وہاں تہذیب خود ان کو مہیا کرے گی اور اُن کے نشو و نما اور ترقی کا انتظام کرے گی، لیکن قائم بہر حال وہ اپنے مستقل، پائدار اور ابدی اصولوں پر ہی ہو گی۔ اور اُس کے ذریعہ جو اسلامی معاشرہ وجود میں آئے گا اُس کا مخصوص مزاج اور مخصوص تحریکی نظام ہر حال میں باقی رہے گا، وہ مزاج اور تحریکی نظام جو اسلامی معاشرے کے وجود میں آنے کے بعد پہلے روز سے ہی اسے دوسرے تمام جاہلی معاشروں کے مقابلے میں ممتاز اور الگ

کر دیتا ہے: "صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ؟"

باب ہشتم

اسلام اور ثقافت

چھٹی فصل میں ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام کے پہلے رُکن کا پہلا جزیہ ہے کہ بندگیٔ مطلق صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے اور لا اِلٰہ الا اللہ میں اسی مفہوم اور مقتضیٰ کی شہادت ادا کی جاتی ہے۔ اِس رُکن کا دوسرا جزیہ ہے کہ اس بندگی کی تفصیل اور صحیح کیفیت جاننے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا جائے۔ "محمد رسول اللہ" کی شہادت میں اِسی امر کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ کی بندگیٔ مطلق کی عملی صورت یہ ہے کہ صرف اللہ کی ذات کو اعتقاداً، عملاً اور قانوناً معبود تسلیم کیا جائے۔ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اللہ کے سوا کسی اور کو بھی خدائی کا منصب حاصل ہے۔ اور نہ مسلمان ہوتے ہوئے کوئی شخص یہ تصور رکھ سکتا ہے کہ خدا کے سوا کسی مخلوق کی عبادت بھی کی جا سکتی ہے یا کسی کو حاکمیت کا مقام دیا جا

سکتا ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم یہ بات بھی واضح کر آئے ہیں کہ عبودیت، عقیدہ اور عبادات کا صحیح مفہوم و مدّعا کیا ہے۔ زیرِ بحث فصل میں ہم یہ بتائیں گے کہ حاکمیّت Sovereignty کا صحیح مفہوم کیا ہے اور اس مفہوم کا ثقافت (Culture) کے ساتھ کیا تعلق ہے؟۔

شریعتِ الٰہی کا دائرہ کار

اسلامی نظریہ کی رُو سے اللہ کی حاکمیّت کا مفہوم صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ قانونی احکام صرف اللہ سے اخذ کیے جائیں، اور پھر انہیں احکام کی طرف فیصلوں کے لیے رجوع کیا جائے اور انہیں کے مطابق فیصلے کیے جائیں۔ اسلام میں خود "شریعت"، کا مفہوم بھی محض قانونی احکام کے دائرے تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ حکمرانی کے اصولی ضوابط، اُس کے نظام اور اُس کی مختلف تشکیلات تک بھی محدود نہیں ہے۔ شریعت کا یہ محدود اور تنگ تصوّر اسلامی شریعت اور اسلامی نظریہ کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا۔ اسلام جس چیز کو شریعت الٰہی کہتا ہے وہ اُس پوری اسکیم پر حاوی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کی تنظیم کے لیے وضع فرمائی ہے۔ فکر و نظر کے ضابطے بھی اس میں شامل ہیں اور اصولِ حکمرانی بھی، اصولِ اخلاق و تمدّن بھی اس دائرے میں آتے ہیں اور قوانینِ معاملات اور ضوابط علم و فن بھی۔ شریعت الٰہی انسانی فکر و نظر کے ہر زاویے کا احاطہ کرتی ہے:

ذاتِ الٰہی کے بارے میں انسان کا تصوّر ہو، یا کائنات کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر، مادی دنیا ہو جو انسان کے ادراک اور مشاہدے کی زد میں ہے، یا ماورالطبیعت حقائق، جو انسانی حواس و ادراک کی گرفت سے باہر ہیں، زندگی

کا تکوینی دائرہ ہو یا تشریعی، انسان کی حقیقت و ماہیت کا سوال ہو یا اس کائنات میں خود انسان کی حیثیت کی بحث، شریعت اسلامی انسانی زندگی کے ان تمام گوشوں سے بحث کرتی ہے۔ اسی طرح زندگی کے عملی شعبوں مثلاً سیاست و معاشرت اور اقتصاد و عدالت اور ان کے اساسی اصول و قواعد سے بھی شریعت اسلامی صرف نظر نہیں کرتی، بلکہ چاہتی ہے کہ ان کے اندر بھی خدائے واحد کی عبودیت کاملہ کا سکہ رواں ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی عمل داری اُن قانونی احکام پر بھی قائم کرنا چاہتی ہے جو ان عملی شعبہ ہائے حیات کی تنظیم کرتے ہیں (یہ وہی چیز ہے، جسے بالعموم آج کل "شریعت" کا نام دیا جاتا ہے۔ حالانکہ شریعت کا یہ تنگ اور محدود مفہوم اُس وسیع تر مفہوم کو ہرگز ادا نہیں کرتا جو اسلام میں اختیار کیا گیا ہے۔) اخلاق اور معاملات کے ضابطوں میں یہ شریعت کارفرما ہوتی ہے، اور اُن اقدار اور پیمانوں کے ذریعہ اس شریعت کا اظہار ہوتا ہے جو معاشرے میں پائے جاتے ہیں اور جو اجتماعی زندگی میں اشخاص اور اشیاء اور اعمال کا وزن اور قیمت طے کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس یہ شریعت علم و فن کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوتی ہے اور تمام فکری کاوشوں اور فنی سرگرمیوں میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ ان میں بھی ہم اُسی طرح اللہ کی رہنمائی کے محتاج ہیں جس طرح جدید اور محدود مفہوم کے قانونی احکام میں ہم ہدایت الٰہی کے حاجت مند ہیں۔

چنانچہ جہاں تک حکومت اور قانون کے باب میں حاکمیتِ الٰہی کو تسلیم کرنے کا سوال ہے وہ ہماری گزشتہ بحثوں سے واضح ہو چکی ہوگی۔ اسی طرح اخلاق و معاملات اور معاشرے کی اقدار اور ردّ و قبول کے پیمانوں کے اندر

حاکمیتِ الٰہی کے نفاذ کی ضرورت بھی کسی نہ کسی حد تک امید ہے واضح ہو چکی ہوگی۔ اس لیے کہ معاشرے کے اندر جو قدریں پائی جاتی ہیں، ردّ و قبول کے جو پیمانے رائج ہوتے ہیں، اخلاق اور معاملات کے جو ضابطے جاری و ساری ہوتے ہیں وہ بلا واسطہ اُن تصوّرات سے ماخوذ ہوتے ہیں جو اُس معاشرے پر غالب ہوتے ہیں، اُن کے سوتے بھی اُسی سرچشمہ سے پھوٹتے ہیں جہاں سے ان تصوّرات کی تہ میں کارفرما عقیدہ ماخوذ ہوتا ہے۔

لیکن جو بات عام لوگوں کے لیے تو کُجا خود اسلامی لٹریچر کے قارئین کرام کے لیے بھی باعث حیرت و استعجاب ہوگی وہ یہ ہے کہ فکری اور فنّی میدانوں میں بھی اسلامی تصوّر اور ربانی ماخذ و منبع ہی کو لازماً ہمارا مرجع اور راہنما ہونا چاہیئے۔

فن (آرٹ) کے موضوع پر ایک مستقل کتاب منصۂ ظہور پر آچکی ہے جس میں اس موضوع پر اس نقطۂ نظر سے کلام کیا گیا ہے کہ تمام فنّی کاوشیں درحقیقت انسان کے تصوّرات اور اس کے وجدان و انفعال کی تعبیر ہیں۔ اور انسان کے وجدان میں ہستی اور زندگی کی جو اور جیسی کچھ تصویر پائی جاتی ہے وہ اُس کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ تمام ایسے امور ہیں جنہیں اسلامی تصوّر نہ صرف کنٹرول کرتا ہے بلکہ ایک مومن و مسلم کے وجدان میں ان کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ کیونکہ اسلامی تصوّر کائنات، انسان کی ذات اور زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہوتا ہے اور ان تمام پہلوؤں کا ان کے خالق سے جو تعلق ہے اُس کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کا خصوصی موضوع ہے: انسان کی حقیقت اور اس

کائنات کے اندر اُس کی حیثیت، اس کا مقصد وجود، اس کا فرضِ منصبی، اور اس کی زندگی کی اقدارِ حقیقی!! یہ سب اسلامی تصوّر کے ضروری اجزا ہیں کیونکہ اسلامی تصوّر محض ایک فکری اور تجریدی ڈھانچہ نہیں ہے بلکہ ایک زندہ، فعّال، اثرانگیز اور محرک حقیقت کا نام ہے جو ان تمام جذبات و تاثرات پر تصرف کرتا ہے جو انسان کے اندر پیدا ہوتے ہیں لے

الغرض فکر و فنّ کا مسئلہ اور فکر و فن کو اسلامی تصوّر اور ربّانی منبع سے وابستہ کرنے کی بحث تاکہ اس پہلو میں بھی اللہ کی بندگیٔ کامل کا اظہار ہو، ہم سے مفصّل گفتگو کا تقاضا کرتی ہے، اور جیسا کہ ہم نے ابھی عرض کیا ہے عہد حاضر کے تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے بلکہ خود ان مسلمانوں کے لیے بھی جو اللہ کی حاکمیّت اور قانون سازی کے وجوب پر ایمان رکھتے ہیں یہ بحث نرالی اور اچھوتی بحث ہوگی۔

وہ علوم جن میں انسان وحی الٰہی کا پابند ہے

مسلمان کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی ایسے معاملہ میں جس کا تعلق عقیدہ، ہستی کے عمومی تصوّر، عبادات، اخلاق و معاملات، اقدار و معیارات،

لے یہ اقتباس محمد قطب کی کتاب "منہج الفن الاسلامی" سے ماخوذ ہے۔ مصنّف نے اسی کتاب کی طرف اشارہ کیا ہے۔

سیاست و اجتماع، معیشت کے اصول و قواعد، انسانی سرگرمیوں کے محرکات کی توجیہ، یا انسانی تاریخ کی تعبیر سے ہو، اللہ کے سوا کسی اور ماخذ و منبع سے رہنمائی اور روشنی حاصل کرے۔ اسی طرح مسلمان اس امر کا بھی پابند ہے کہ وہ اس رہنمائی اور روشنی کے حصول کے لیے ایسے مسلمان کو ذریعہ بنائے جس کے دین و تقویٰ پر اُسے اعتماد ہو اور جس کے عقیدہ و عمل میں تضاد اور دو رنگی نہ ہو۔

وہ علوم جن میں انسان وحی الٰہی کا پابند نہیں ہے۔

البتہ مسلمان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ علوم مجردہ کو مسلمان اور غیر مسلم سبھی سے حاصل کر سکتا ہے۔ مثلاً کیمیا (Chemistry)، طبعیات (Physics) حیاتیات (Biology)، فلکیات (Astronomy)، طب (Medicine) صنعت (Industry)، زراعت (Agriculture)، نظم و نسق (Administration) (صرف فنی پہلو کی حد تک)، ٹیکنالوجی، فنونِ حرب (فنی پہلو سے) اور انہی جیسے دوسرے اور علوم و فنون۔ اگرچہ اصل الاصول یہ ہے کہ مسلم معاشرہ جب وجود پذیر ہو جائے تو وہ خود کوشش کرے کہ ان تمام میدانوں کے اندر یہ صلاحیتیں بافراط پیدا کرے۔ اس لیے کہ یہ تمام علوم و فنون فرض کفایہ ہیں۔ ان کے اندر کچھ لوگوں کا خصوصی مہارت اور قابلیت پیدا کرنا ضروری ہے۔ اور اگر یہ صلاحیتیں پیدا نہ کی جائیں گی اور ایسی فضا بھی مہیا نہ کی جائے گی جس میں یہ صلاحیتیں اُجاگر ہوں، پروان چڑھیں، رُوبعمل ہوں

اور مفید نتائج پیدا کریں تو پورا معاشرہ بحیثیت مجموعی گناہ گار ہو گا۔ لیکن جب تک یہ سب کچھ میسّر نہ آئے مسلمان کو اجازت ہے کہ وہ یہ علوم و فنون اور ان کی عملی تشریحات مسلم اور غیر مسلم سبھی سے حاصل کر سکتا ہے، اور مسلم اور غیر مسلم دونوں کی کاوشوں اور تجربوں سے استفادہ کر سکتا ہے، اور مسلم اور غیر مسلم کو بلا تفریق یہ خدمات سونپ سکتا ہے۔ یہ ان امور میں شامل ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "انتم اعلم بامور دنیاکم" (تم اپنے دنیاوی امور کو زیادہ بہتر سمجھتے ہو)۔ ان کا تعلق ان امور سے نہیں ہے جو حیات و کائنات کے بارے میں مسلمان کے تصوّر سے تعلق رکھتے ہیں یا انسان اور انسان کے مقصد تخلیق اور انسان کی ذمہ داری کی حقیقت اور اِرد گرد کی کائنات سے انسان کے تعلّقات کی نوعیّت اور خالق ہستی کے ساتھ اس کے تعلق سے بحث کرتے ہیں۔ ان کا تعلّق ان اصول و ضوابط اور قوانین و شرائع سے بھی نہیں ہے جو فرد اور جماعت کی زندگی کی تنظیم کرتے ہیں۔ اخلاق و آداب اور رسوم و روایات اور ان اقدار و معیارات سے بھی ان کا تعلق نہیں ہے جن کو معاشرے میں سیادت حاصل ہوتی ہے اور جو معاشرے میں اپنے نقش و نگار اُبھارتے ہیں لہذا ان علوم کے حصول میں مسلمان کو یہ خطرہ نہیں ہے کہ اُس کے عقیدہ میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے گی یا وہ جاہلیت کی طرف پلٹ جائے گا۔

لیکن جہاں تک انسانی جدّ و جہد کی توجیہ کا تعلق ہے خواہ وہ جدّ و جہد انفرادی

صورت میں ہو یا اجتماعی صورت میں ——— اور اس جد و جہد کا تعلق براہ راست انسان کی ذات اور انسانی تاریخ کے نظریات سے ہے ——— اسی طرح جہاں تک کائنات کے آغاز، زندگی کی ابتداء اور خود انسان کی ابتداء کی تعبیر و توجیہ کا تعلق ہے تو چونکہ ان سب امور کا تعلق ماوراء الطبیعات (Metaphysics) سے ہے (اور کیمسٹری، فزکس، فلکیات اور طب وغیرہ سے اس کا تعلق نہیں ہے)، اس لیے ان کی وہی حیثیت ہے جو انسان کی زندگی اور انسانی تگ و دو کو منظم کرنے والے اصول و ضوابط اور قوانین و شرائع کی ہے۔ ان کے رشتے بلا واسطہ عقیدہ و تصوّر سے ملتے ہیں۔ لہٰذا کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ان امور کو مسلمان کے سوا کسی اور سے حاصل کرے بلکہ یہ اُسے صرف اُسی مسلمان سے حاصل کرنے چاہئیں جس کے دین و تقویٰ پر اُسے کامل بھروسہ ہو، اور اُسے پختہ یقین ہو کہ وہ ان امور میں صرف اللہ سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ اصل غرض یہ ہے کہ مسلمان کے احساس و شعور میں یہ حقیقت پوری طرح جاگزیں ہو جائے کہ ان تمام امور کا تعلق عقیدہ سے ہے، اور وہ یہ اچھی طرح جان لے کہ ان امور میں وحی الٰہی سے روشنی اخذ کرنا اللہ کی بندگی کا لازمی تقاضا یا اس شہادت کا ناگزیر نتیجہ ہے جس میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔

اس میں البتہ کوئی قباحت نہیں کہ ایک مسلمان ان امور میں جاہلی تحقیقات

اور کاوشوں کے تمام نتائج و آثار کھنگال ڈالے، لیکن اس نقطۂ نظر سے نہیں کہ وہ ان امور کے بارے میں ان سے اپنے لیے تصوّر و ادراک کا مواد حاصل کرے۔ بلکہ صرف یہ جاننے کے لیے کہ جاہلیّت نے کیا کیا انحراف کی راہیں اختیار کی ہیں اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ان انسانی گمراہیوں کو ختم کیوں کر کیا جا سکتا ہے، اور کس طرح انسانی کج رویوں کو راست روی میں تبدیل کر کے انسان کو اسلامی تصوّرِ حیات اور اسلامی عقیدہ کے تحت صحیح اصولوں سے ہمکنار کیا جا سکتا ہے۔

انسانی علوم پر جاہلیت کے اثرات

فلسفہ، تاریخ انسانی کی تعبیر، علم النفس (بہ استثنا ان مشاہدات اور اختلافی آراء کے جو تعبیر و توجیہ سے بحث نہیں کرتیں)، اخلاقیات، مذہبیات اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ، سماجی اور عمرانی علوم (مشاہدات، اعداد و شمار اور براہِ راست حاصل کردہ معلومات کو چھوڑ کر صرف ان نتائج کی حد تک، جو ان معلومات اور مشاہدات سے کشید کیے گئے ہیں اور وہ اساسی نظریات جو ان کی بنیاد پر مترتب ہوتے ہیں) ان تمام علوم کا مجموعی رُخ اور نصب العین قدیم اور جدید، ہر دور میں، اپنے جاہلی عقائد اور خرافات سے براہِ راست متاثر رہا ہے۔ بلکہ جاہلی معتقدات و خرافات پر ہی اُن کی عمارت تعمیر ہوتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان علوم میں سے بیشتر علوم اپنے بنیادی اصولوں میں مذہب سے متصادم ہیں اور مذہب کے تصوّر سے بالعموم اور اسلامی تصوّر سے بالخصوص کُھلی یا چُھپی عداوت

رکھتے ہیں۔

انسانی فکر و علم کے یہ گوشے اُس اہمیت کے حامل نہیں ہیں جو کیمسٹری، فزکس، فلکیات، حیاتیات اور طب وغیرہ کو حاصل ہے، بشرطیکہ مؤخرالذکر علوم صرف عملی تجربات اور عملی نتائج کی حد تک رہیں، اور اس حد کو پھاند کر فلسفیانہ تاویلات و توجیہات (خواہ کسی صورت میں ہوں) تک تجاوز نہ کریں۔ جیسا کہ مثلاً ڈارون ازم نے حیاتیات میں مشاہدات کے اثبات و ترتیب کا کام سرانجام دیتے دیتے اپنی جائز حدود پھلانگ کر بلا کسی دلیل و حجت کے بلکہ بلا کسی ضرورت کے محض جذبات سے مغلوب ہو کر یہ نظریہ بھی پیش کر دیا کہ زندگی کے آغاز اور اُس کے ارتقاء کے لیے طبعی دنیا سے بالاتر کسی قوت کا وجود فرض کرنے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

مسلمان کے پاس ان معاملات کے بارے میں اپنے پروردگار کی طرف سے ضروری اور اٹل معلومات پہنچ چکی ہیں، اور وہ اس درجہ اعلیٰ وارفع ہیں کہ ان کے مقابلے میں انسانی معلومات اور کاوش نہایت مضحکہ خیز اور ہیچ معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے باوجود انسان اس دائرے میں دخل اندازی کا مرتکب ہوتا ہے، جس کا تعلق براہ راست عقیدہ اور بندگیٔ رب سے ہے۔

ثقافت اور صہیونیت

یہ بات کہ: ثقافت ایک انسانی میراث ہے، یہ کسی مخصوص وطن سے مقیّد

نہیں ہے، نہ اس کی کوئی مخصوص قومیت ہے اور نہ اس کا کسی معیّن مذہب سے رشتہ ہے۔ یہ بیان سائنسی اور فنّی علوم اور ان کی علمی تشریح کی حد تک تو صحیح ہے۔ بشرطیکہ ہم ان علوم کے دائرہ کار کو پھاند کر اس حد تک تجاوز نہ کر جائیں کہ ان علوم کے نتائج کی فلسفیانہ تعبیر (Metaphysical Interpretations) کرنے لگیں، اور انسان، اور انسان کی تگ و دو اور انسانی تاریخ کی فلسفیانہ تاویل میں پڑ جائیں۔ اور فن و ادب اور وجدانی تعبیر کے مظاہر تک کی فلسفیانہ توجیہ کر ڈالیں۔ لیکن ثقافت کے بارے میں یہ نظریہ جو ہم نے اُوپر بیان کیا ہے دراصل عالمی یہودیت کی مختلف چالوں میں سے ایک چال ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ تمام حدود و قیود کو —— جن میں سرِفہرست عقیدہ و مذہب کی حدود و قیود ہیں —— پامال کر دیا جائے تاکہ یہودیت کا زہر تمام دنیا کے جسم میں جب وہ بے حس، خمار آلود اور نیم جاں ہو چکی ہو، بآسانی سرایت کر جائے اور پھر یہودیوں کو دنیا کے اندر اپنی شیطانی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی پُوری آزادی حاصل ہو۔ ان سرگرمیوں میں سرِفہرست سُودی کاروبار ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ تمام انسانیت کے خون و پسینہ کا حاصل ان یہودی اداروں کے قبضہ میں چلا جائے جو سُود کی بنیاد پر چل رہے ہیں۔

اسلام کے نزدیک ان تمام سائنسی اور فنّی علوم اور ان کے عملی تجربات کے پس منظر میں دو قسم کی ثقافتیں کارفرما ہیں۔ ایک اسلامی ثقافت جو اِسلام کے

نظریۂ حیات پر قائم ہے اور دوسری جاہلی ثقافت جو بظاہر مختلف التنوّع مناہج پر قائم ہے مگر درحقیقت ان سب کی اساس و بنیاد ایک ہی ہے، اور وہ ہے فکر انسانی کو اللہ کا مقام دینے کا داعیہ اور ادعا، تاکہ اُس کی صحت وعدم صحت کو پرکھنے کے لیے اللہ کو مرجع نہ قرار دیا جائے۔ اسلامی ثقافت انسان کی تمام فکری اور عملی سرگرمیوں کو محیط ہے، اور اُس کا دامن ایسے اصول وقواعد اور مناہج وخصائص سے مالامال ہے جو نہ صرف ان سرگرمیوں کی مزید نشوونما کی ضمانت دیتے ہیں بلکہ ان کو حیاتِ ابدی اور حُسن بھی عطا کرتے ہیں۔

یورپ کے تجرباتی علوم اسلامی دَور کی پیداوار ہیں۔

اس حقیقت سے کسی کو بے خبر نہ رہنا چاہیئے کہ تجرباتی علوم (Empirical Sciences) جو عہدِ حاضر میں یورپ کی صنعتی تہذیب کی رُوح رواں ہیں، ان کی جنم بھومی یورپ نہیں ہے بلکہ اُندلس اور مشرق کے مسلم ممالک کی اسلامی یونیورسٹیاں ہیں۔ ان علوم کے بنیادی اصول اسلام کی اُن تعلیمات اور ہدایات سے اخذ کیے گئے تھے جن میں کائنات اور اس کی فطرت اور اُس کے سینے میں مدفون طرح طرح کے ذخائر وخزائن کی جانب واضح اشارے موجود ہیں۔ بعد میں اسی نہج پر یورپ کے اندر ایک مستقل علمی تحریک برپا ہوئی، اور کشاں کشاں وہ ترقی اور تکمیل کے مراحل طے کرتی رہی۔ اسی عرصہ میں عالمِ اسلامی کا یہ حال ہو گیا کہ وہ اسلام سے دُور ہوتا چلا گیا۔ جس کے نتیجے میں اسلامی دنیا میں یہ علمی تحریک پہلے جمود اور

سہل انگاری کا شکار ہوئی اور پھر بتدریج ختم ہو گئی - اس کے خاتمہ میں متعدد عوامل کو دخل تھا - کچھ عوامل اس وقت کے اسلامی معاشرے کی داخلی ساخت میں مضمر تھے - اور بعض کا تعلق اُن لگاتار حملوں سے تھا جو صلیبی اور صہیونی دنیا کی طرف سے اسلامی دنیا پر اس عرصے میں کیے گئے - یورپ نے اسلامی دنیا سے تجرباتی علوم کا جو طریقِ کار اخذ کیا تھا اس کا رشتہ اس نے اس کی اسلامی بنیادوں اور اسلامی معتقدات سے کاٹ دیا - اور بالآخر جب یورپ نے چرچ سے، جو خدائی بادشاہت (Heavenly Kingdom) کی آڑ لے کر انسانوں پر مظالم توڑ رہا تھا، قطعِ تعلق کیا تو اِسی افراتفری کے دَوران اُس نے تجرباتی علوم کے اسلامی طریقِ کار کو بھی اللہ کی ہدایت سے محروم کر دیا[1] یوں یورپ کا فکری سرمایہ مجموعی طور پر ہر دَور اور ہر جگہ کے جاہلی فکر کی طرح ایک بالکل ہی نئی چیز بن کر رہ گیا جو اپنی فطرت و بنیاد میں اسلامی تصوّر سے نہ صرف اجنبی تھا بلکہ اسلامی تصوّر کے بالکل متضاد بھی تھا، اور اس سے سر بسر متصادم تھا - بنا بریں ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ صرف اِسلامی تصوّرِ زندگی کے اصول و قواعد کو اپنا مرجع ٹھیرائے اور صرف تعلیمات خداوندی ہی سے نورِ بصیرت حاصل کرے - اگر وہ ان تعلیمات کو براہِ راست اخذ کرنے کی قدرت رکھتا ہو تو فبہا ورنہ اگر اُسے یہ قدرت حاصل نہ ہو تو کسی ایسے خدا پرست مسلمان سے انہیں

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب: "المستقبل لهذا الدين"، باب: "الفصام النكد"

حاصل کرے جس کے دین و تقویٰ پر اُسے بھروسہ ہو اور جسے وہ پُورے قلبی اطمینان کے ساتھ اپنا ذریعہ علم بنا سکتا ہو۔

علم اور ذریعہ علم میں انفصال درست نہیں ہے۔

یہ نظریہ کہ علم الگ چیز ہے اور ذریعۂ علم الگ، اسلام اس نظریہ کو ان علوم کے بارے میں تسلیم نہیں کرتا جن کا تعلق عقیدہ کی ان تفصیلات سے ہے جو ہستی و زندگی، اخلاق و اقدار، عادات و رسوم اور انسانی نفس اور انسانی جدوجہد سے متعلق گوشوں کے بارے میں انسان کے نقطۂ نظر پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ بے شبہ اسلام اس حد تک تو رواداری برتتا ہے کہ ایک مسلمان کسی غیر مسلم کو یا ناخدا ترس مسلمان کو کیمسٹری، فزکس، فلکیات، طب، صنعت و زراعت، ایڈمنسٹریشن اور ایسے ہی دوسرے فنون میں اپنا ماخذ علم بنائے، اور وہ بھی ان حالات میں جب کہ کوئی ایسا خدا پرست مسلمان نہ مل رہا ہو جو ان فنون کی تعلیم دے سکے ———— بعینہٖ یہی صورت آج ان لوگوں کو درپیش ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ یہ صورت حال اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ یہ مسلمان اپنے دین سے اور اپنے طریقِ حیات سے دُور ہو چکے ہیں، اور اسلام کے اس تصوّر کو فراموش کر چکے ہیں جو اُس نے خلافت الٰہی کے مقتضیات کو سرانجام دینے اور ان علوم و تجربات اور مختلف النّوع صلاحیتوں کے بارے میں پیش کیا ہے جو امور خلافت کو منشائے الٰہی کے تحت سرانجام دینے کے لیے ناگزیر ہیں۔

بہرحال علوم مجرّدہ کی حد تک تو اسلام مسلمان کو اجازت دیتا ہے کہ وہ کسی غیر مسلم کو اپنا ذریعہ بنالے، مگر وہ اُس کو اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے عقیدہ کے اصول، اپنے تصورِ حیات کی اساسات، قرآن کی تفسیر، حدیث اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح، تاریخ کا فلسفہ، حرکت کی فلسفیانہ تعبیر، اپنے معاشرے کی عادات و اطوار، اپنی حکومت کا نظام، اپنی سیاست کا ڈھنگ، اپنے ادب و فن کے محرکات بھی غیر اسلامی مآخذ سے حاصل کرے یا کسی ایسے مسلمان کو ان کا ذریعہ بنائے جس کا دین ناقابلِ اعتماد ہو اور جو تقویٰ اور خدا خوفی سے عاری ہو۔

یہ بات آپ سے وہ شخص کر رہا ہے جس نے پورے چالیس سال کتب بینی میں گزارے ہیں اور اس پورے عرصہ میں اُس کا کام صرف یہ رہا ہے کہ انسانی علم و تحقیق نے مختلف گوشوں میں جو نتائج مہیّا کیے ہیں اُن کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرے۔ علم و تحقیق کے کچھ شعبے وہ تھے جن میں وہ تخصّص (Specialise) کر رہا تھا اور کچھ گوشوں میں اُس نے طبعی میلان اور فطری رغبت کے تحت خاک چھانی۔ اس سرمایۂ علم و آگہی کے انبار کو لے کر جب اُس نے اپنے اصل عقیدہ اور تصوّر کے سرچشموں کی طرف رجوع کیا اور اُن کا مطالعہ کیا تو اُسے معلوم ہوا کہ جو کچھ اُس نے آج تک پڑھا ہے وہ اِن اتھاہ خزانوں کے مقابلے میں نہایت حقیر اور ہیچ میرز ہے (بلکہ اسے حقیر اور ہیچ میرز ہونا ہی چاہیئے) وہ اس بات پر نادم نہیں ہے کہ اُس نے اپنی زندگی کے چالیس سال کن چیزوں میں گزارے۔ کیوں کہ اس مدّت

میں اُس نے جاہلیت کے پوست کندہ حالات معلوم کر لیے ہیں، اُس نے جاہلیت کی گمراہیوں کو بچشمِ سر دیکھا ہے، جاہلیت کی بے مائیگی کا مشاہدہ کیا ہے، جاہلیت کی پستی کا اندازہ کیا اور تس پر اُس کے کھوکھلے ہنگاموں اور مصنوعی ہنگامۂ ہائے ہو کو دیکھا ہے، اُس کے غرور و استکبار اور دعووں کو خوب پرکھا ہے۔ اور اُسے یقین ہو گیا کہ ایک مسلمان علم کے ان دونوں (متضاد) ذریعوں (ذریعہ الٰہی اور ذریعہ جاہلیت) سے بیک وقت مستفید نہیں ہو سکتا۔

بایں ہمہ یہ میری ذاتی رائے نہیں ہے کیونکہ معاملہ اس سے کہیں بالا ہے کہ اس میں کسی شخص کی ذاتی رائے کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے، میزان الٰہی میں اس معاملے کا جو وزن ہے اُس کے مقابلے میں کسی مسلمان کی رائے پر اعتماد یا عدم اعتماد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو اللہ اور اس کے رسول کا فرمان ہے، اور اسی فرمان کو ہم اس معاملے میں حکَم ٹھیراتے ہیں ——— ہم اس معاملے میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف اُسی طرح رجوع کرتے ہیں جیسا کہ اہلِ ایمان کا شیوہ ہونا چاہیئے کہ وہ باہمی اختلافات کے فیصلہ کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کریں عامۃ المسلمین کے بارے میں یہود اور نصاریٰ جو شر انگیز عزائم رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اُن کو بے نقاب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن
بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم

مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا

حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

(بقرہ : ۱۰۹)

اہلِ کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں۔ اپنے نفس کے حسد کی بنا پر۔ اس کے بعد کہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے۔ پس تم عفو و درگزر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ خود ہی اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى

تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ

مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○

(بقرہ : ۱۲۰)

یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔ صاف کہہ دو کہ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔ اور اگر تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آ چکا ہے ان (یہود و نصاریٰ) کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے

بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ یَرُدُّوْکُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ کٰفِرِیْنَ۔ (آل عمران : ۱۰۰)

اے ایمان والو! اگر تم نے ان اہلِ کتاب میں سے کسی گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں پھر کفر کی طرف پھیرلے جائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک جسے حافظ ابویعلی نے بروایت حماد اور شعبی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، قرآن کے بیانات کی مزید تشریح کرتا ہے، آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لاتسئلوا اهل الکتاب عن شیٔ فانهم لن یهدوکم وقد ضلوا، وانکم اما أن تصدقوا بباطل، واما ان تکذبوا بحق، وانه واللّٰه لوکان موسی حیاً بین اظهرکم ماحلّ له الا أن یتبعنی۔

اہلِ کتاب سے کسی چیز کے بارے میں دریافت نہ کرو یہ تمہیں سیدھی راہ نہیں بتائیں گے، یہ تو خود راہ گم کردہ ہیں۔ اگر ان کی بات پر گئے تو یا تو تم کسی باطل کی تصدیق یا کسی صحیح بات کی تکذیب

کر دو گے۔ خدا کی قسم اگر موسیٰ بھی تمہارے درمیان زندہ ہوتے
تو ان کے لیے بھی میری اتباع کے سوا کوئی اور راستہ اختیار کرنا
جائز نہ ہوتا۔

جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے بارے میں یہود ونصاریٰ کا یہ خطرناک عزم قطعی اور واضح شکل میں بیان فرما دیا ہے تو اس کے بعد یہ انتہائی بلادت اور کم نظری کی بات ہو گی کہ لمحہ بھر کے لیے بھی یہ خوش فہمی رکھی جائے کہ یہود ونصاریٰ اسلامی عقائد یا اسلامی تاریخ کے بارے میں جو بحث کرتے ہیں یا وہ مسلم معاشرے کے نظام، یا مسلم سیاست یا مسلم معیشت کے بارے میں جو تجویزیں پیش کرتے ہیں وہ کسی نیک نیتی پر مبنی ہو سکتی ہیں، یا ان سے مسلمانوں کی بہبود ان کے مدِّنظر ہوتی ہے، یا وہ فی الواقع ہدایت اور روشنی کے طالب ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے واضح اعلان اور قطعی فیصلے کے بعد بھی ان کے بارے میں یہ حُسنِ ظن رکھتے ہیں اُن کی عقل ودانش ماتم کے قابل ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ بھی طے فرما دیا ہے کہ "قل ان هدى الله هو الهدى" (کہہ دیجیے کہ اللہ ہی کی ہدایت اصل ہدایت ہے)۔ اس ارشاد نے یہ بات بھی معیّن کر دی کہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم ہی وہ واحد مرجع وماخذ ہے جس کی طرف مسلمان کو اپنے سارے معاملات میں رجوع کرنا چاہیئے۔ ہدایت الٰہی سے اعراض کے بعد سوائے گمراہی اور بے راہ روی کے اور کچھ نہ حاصل ہو گا۔

بلکہ اللہ کے سوا کوئی اور ایسا منبع سرے سے موجود ہی نہیں ہے جس سے ہدایت اور روشنی حاصل ہو سکتی ہو۔ مذکورہ بالا آیت میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ کی ہدایت ہی دراصل سچی ہدایت ہے تو اس صیغۂ حصر سے بیان ہی یہ ثابت کرنا ہے کہ وحی الٰہی کے بعد جو کچھ ہے ضلال و زیغ، گمراہی ٹیڑھ اور بدبختی ہی ہے۔ آیت کا یہ مفہوم و مدّعا اس قدر واضح ہے کہ اس میں کسی شک اور تاویل کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

قرآن میں یہ قطعی حکم بھی وارد ہے کہ اس شخص سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے، جو اللہ کے ذکر سے رُوگردانی کرتا ہے اور صرف دنیا طلبی ہی اُس کا مطمح نظر اور مدارِ جستجو ہے۔ قرآن نے ایسے آدمی کے بارے میں یہ وضاحت بھی کر دی کہ وہ صرف ظن و تخمین کا پجاری ہے اور علم و یقین کی اُسے ہوا تک نہیں لگی ہے۔ قرآن مسلمان کو ظن و تخمین کی پیروی سے منع کرتا ہے، اور جس شخص کی نگاہ حیاتِ دنیا کی ظاہری چمک دمک پر ہی اٹک کر رہ گئی ہو، قرآن کے نزدیک وہ جوہرِ علم اور صحتِ نظر دونوں سے محروم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ
اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ؕ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ؕ
اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ
اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ۝ (النجم: ۲۹-۳۰)

جس شخص نے ہماری یاد سے منہ موڑ رکھا ہے اور وہ دنیا کی زندگی
کے سوا کوئی اور خواہش نہیں رکھتا تو اُس پر دھیان نہ کر۔ ان کے علم
کی انتہا صرف یہاں تک ہی ہے۔ تیرا پروردگار خوب جانتا ہے
اُس شخص کو جو اللہ کی راہ سے بھٹک چکا ہے اور اُس شخص کو جو
راہِ راست پر چلا۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ
عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ۔ (روم : ۷)

وہ صرف دنیا کی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت
سے غافل ہیں۔

یہ سطح بین، ظاہر پرست اور علم حقیقی سے بے خبر وہی شخص ہو سکتا ہے جو اللہ کے ذکر سے غافل، اور صرف ناپائیدار حیاتِ دنیا کا طلب گار ہو۔ عہدِ حاضر کے تمام سائنس دان اور ماہرین فن کا یہی حال ہے۔ یہ لوگ جس علم کے علمبردار ہیں یہ وہ علم نہیں ہے جس کے بارے میں ایک مسلمان اس کے حامل پر یکسوئی سے اعتماد کر سکتا ہو۔ اور بے چون وچرا اُس سے اخذ و استفادہ کرتا چلا جائے۔ بلکہ اس علم کے معاملے میں مسلمان صرف اس قدر مجاز ہے کہ خالص علمی حد تک اُس سے استفادہ کرے۔ لیکن اُسے زندگی کے بارے میں اور نفسِ انسانی اور اس کے تصوراتی متعلقات کے بارے میں اُس کی پیش کردہ تعبیر و توجیہ پر دھیان نہ دینا چاہیئے۔ یہ وہ علم بھی نہیں ہے جس کی قرآن نے بار بار تعریف و توصیف کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:
"ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون" (کیا اہل علم اور علم

سے خالی لوگ برابر ہو سکتے ہیں)۔ جو لوگ ایسی آیات کو سیاق و سباق سے الگ کر کے بے محل ان سے استدلال کرتے ہیں وہ یکسر غلطی پر ہیں۔ علم کے بارے میں یہ فیصلہ کن اور خطِ امتیاز قائم کرنے والا بیان جس آیت میں وارد ہوا ہے وہ آیت یہ ہے:

أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةَ رَبِّهِ ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝ (زمر: ۹)

کیا وہ جو اللہ کی بندگی کرتا ہے رات کے اوقات سجود و قیام میں، اور آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا ہے بتا دیں کہ کیا برابر ہیں وہ لوگ جو سمجھ رکھتے ہیں اور وہ جو بے سمجھ ہیں۔ بے شک عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں۔

یہ بندۂ حق جو رات کی تنہائیوں میں خدا کے آگے سرافگندہ ہوتا ہے، قیام و سجود میں اپنے خالق سے محوِ سرگوشی و مناجات ہوتا ہے، آخرت کے خوف سے لرزاں و ترساں رہتا ہے۔ اپنے رب سے رحمت کی اُمید سے تلب و نظر کو فروزاں رکھتا ہے، یہی وہ خوش بخت انسان ہے جو صحیح معنوں میں دولتِ علم سے بہرہ یاب ہے اور یہی وہ علم ہے جس کی طرف آیت بالا نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی ایسا علم جو اللہ کی طرف انسان کی رہنمائی کرتا ہے، تقویٰ و راستبازی کی نعمت سے اُسے ہمکنار کرتا ہے۔ یہ وہ علم نہیں جو انسانی فطرت کو مسخ کر دیتا ہے اور اُسے الحاد اور انکارِ خدا کی راہ کج پر ڈال دیتا ہے۔

علم کا دائرہ صرف عقائد، دینی فرائض و واجبات اور احکام و شرائع کے علم تک ہی محدود نہیں ہے، علم کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ اس کا تعلق جتنا عقائد و فرائض اور شرائع سے ہے اتنا ہی قوانین فطرت اور خلافت الٰہی کی مصلحت و مفاد کے تحت ان قوانین کی تسخیر سے بھی ہے۔ البتہ جس علم کی بنیاد ایمان پر نہیں ہوتی وہ اُس علم کی تعریف سے خارج ہے جس کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے اور جس کے حاملین کی وہ مدح و ستائش کرتا ہے۔ اساس ایمان کے درمیان اور اُن تمام علوم کے درمیان جن کا تعلق نوامیس کائنات اور قوانین فطرت سے ہے۔ (مثلاً فلکیات، حیاتیات، طبیعات، کیمیا اور طبقات الارض) ایک مضبوط رشتہ پایا جاتا ہے۔ یہ سارے کے سارے وہ علوم ہیں جو اللہ کی ہستی کا کھلا کھلا ثبوت پیش کرتے ہیں بشرطیکہ بھٹکی ہوئی انسانی خواہشات کے تصرف میں نہ آجائیں اور انہیں اللہ کے تصوّر سے عاری نہ کردیں۔ جیسا کہ فی الواقع یورپ میں علمی ترقی کے دَور میں یہ افسوس ناک صورتِ حال پیش آچکی ہے۔ دراصل یورپ کی تاریخ میں ایک ایسا دَور آیا جب علماء اور ظالم و جفاکار چرچ کے درمیان انتہائی تکلیف دہ اور نفرت آگیں اختلافات پیدا ہوگئے، جن کے نتیجے میں یورپ کی تمام تر علمی تحریک خدا بیزاری کی راہ پر چل پڑی۔ اس تحریک نے یورپ میں زندگی کے ہر پہلو پر اپنے دُور رس اثرات ڈالے۔ بلکہ یورپ کے پُورے نظام فکر کا مزاج ہی بدل کر رکھ دیا۔ ان زہر آگیں اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف چرچ اور چرچ کے نظریات و معتقدات کے خلاف ہی آتش غیظ و عداوت نہ بھڑکی، بلکہ مجموعی طور پر خود مذہب کا تصوّر بھی نفرت و عناد کی لپیٹ میں آگیا یہاں تک کہ

یورپ نے علم و دانش کے تمام میدانوں میں جو کچھ فکری سرمایہ مہیا کیا وہ سارے کا سارا مذہب کی عداوت سے لبریز ہو گیا۔ خواہ وہ ماوراء الطبیعی فلسفہ ہو یا مجرّد علمی اور فنّی تحقیقات ہوں جن کا بظاہر دین سے کوئی سروکار نہیں ہوتا[1]

یہ تو آپ نے جان لیا کہ مغرب کا اندازِ فکر، اور پھر علم کے ہر میدان میں اس کی فکر کا تمام تر سرمایہ آغاز کار ہی میں جس اساس و بنیاد پر استوار ہوا ہے اُس کی تہ میں وہ مسموم اثرات کارفرما تھے جو مذہب کی عداوت اور مذہب بیزاری کے پیدا کردہ تھے، اس کے بعد یہ جان لینا دشوار نہیں رہتا کہ مغرب کا فکری سرمایہ اور اس کے انداز میں بحیثیت مجموعی اسلام کے خلاف شدید عداوت و نفرت کے جذبات کیوں پائے جاتے ہیں۔ اسلام کے خلاف اس نفرت کا مظاہرہ خاص طور پر دیدہ دانستہ کیا جاتا ہے۔ اور اکثر حالات میں سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے تحت بھرپور کوشش کی جاتی ہے کہ اوّلاً اسلامی عقائد و تصوّرات کی پاکیزہ عمارت کو متزلزل کیا جائے اور پھر رفتہ رفتہ اُن اساسات ہی کو مسمار کر دیا جائے جو مسلم معاشرے کو دوسرے معاشروں سے ممیّز کرتی ہیں۔ اس ناپاک سازش کا علم ہونے کے بعد بھی اگر ہم اسلامی علوم کی تدریس میں مغربی انداز فکر اور مغربی سرمایۂ فکر پر تکیہ کریں گے تو اس سے بڑھ کر شرمناک تساہل اور ناقابل معافی کوتاہی کوئی نہ ہوگی۔ بلکہ ہمارے لیے یہ بھی لازم ہے کہ خالص سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کرتے وقت بھی، جسے ہم حالات حاضرہ میں مغربی مآخذ

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب: "المستقبل لهذا الدين" باب: "الفصام النكد"

سے لینے پر مجبور رہیں، محتاط رہیں، اور ان علوم کو فلسفہ کی پرچھائیوں سے دُور رکھیں۔ اس لیے کہ یہی وہ فلسفیانہ پرچھائیاں ہیں جو بنیادی طور پر مذہب کی بالعموم اور اسلام کی بالخصوص ضد اور نقیض واقع ہوئی ہیں۔ اور ان کا معمولی سا اثر بھی اسلام کے پاکیزہ و شفاف چشمہ کو مکدر کرنے کے لیے کافی ہے۔

بابِ نہم

مُسلمان کی قومیّت

مسلمانوں کی اجتماعی تنظیم کی بنیاد

جس ساعتِ سعیدہ میں اسلام نے نوعِ انسانی کو اخلاق و اقدار کا نیا تصوّر دیا، اور ان اخلاق و اقدار کے حصول کا نیا آستانہ بتایا، اُسی ساعتِ سعیدہ میں اس نے انسان کے باہمی تعلّقات و روابط کا ایک نیا تصوّر بھی عطا کیا۔ اسلام کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ انسان اور اس کے رب کے درمیان تعلقات کو درست کرے، اور انسان کو یہ بتائے کہ پروردگارِ عالم ہی وہ واحد با اختیار ہستی ہے جس کی بارگاہِ عزّت سے اُسے اپنی زندگی کی اقدار اور ردّ و قبول کے پیمانے حاصل کرنے چاہیئں۔ کیوں کہ اُسی نے اُسے خلعتِ ہستی اور سرمایۂ حیات ارزاں فرمایا ہے۔ اپنے روابط اور رشتوں کے بارے میں بھی اُسی ذات کو مرکز و مرجع سمجھے جس کے ارادۂ کُن فکاں

سے وہ عدم سے وجود میں آیا ہے اور جس کی طرف اُسے آخرکار لوٹ کر جانا ہے۔
اسلام نے آکر پوری قوت و صراحت کے ساتھ انسان کو یہ بتایا کہ اللہ کی نظر میں انسانوں کو باہم جوڑنے والا صرف ایک ہی رشتہ ہے۔ اگر یہ رشتہ پوری طرح استوار ہو گیا تو اس کے مقابلے میں خون اور مودّت والفت کے دوسرے رشتے مٹ جاتے ہیں:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ

(مجادلہ: ۲۲)

جو لوگ اللہ اور آخرت کے روز پر ایمان بھی رکھتے ہیں ان کو تم نہ دیکھو گے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی رکھتے ہیں گو وہ اُن کے باپ اور بیٹے اور بھائی اور اہلِ قبیلہ ہی کیوں نہ ہو۔

دنیا کے اندر اللہ کی پارٹی صرف ایک ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسری تمام پارٹیاں شیطان اور طاغوت کی پارٹیاں ہیں۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝

(النساء: ۷۶)

جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں نہایت کمزور ہیں۔

اللہ تک پہنچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے، اس کے ماسوا جو راستہ ہے وہ اللہ سے دور لے جانے والا ہے:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ۔

(الانعام: ۱۵۳)

یہی میرا سیدھا راستہ ہے، لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے۔

انسانی زندگی کے لیے صرف ایک ہی نظامِ حق ہے، اور وہ ہے اسلامی نظام۔ اس کے علاوہ جتنے نظام ہیں وہ عینِ جاہلیت ہیں:

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِیَّةِ یَبْغُوْنَ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ۔ (المائدہ: ۵۰)

تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالاں کہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

صرف ایک ہی شریعت واجب الاتباع ہے اور وہ ہے اللہ کی شریعت۔

اس کے سوا جتنی شریعتیں ہیں، ہوائے نفس ہی ہیں:

ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَۃٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْھَا وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ۔

(جاثیہ: ۱۸)

اے نبی ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے۔ لہذا تم اُس پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔

دنیا میں حق صرف ایک ہے جس میں تعدّد و تنوّع محال ہے۔ حق کے سوا جو کچھ ہے وہ ضلالت اور تاریکی ہے:

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ۔

(یونس: ۳۲)

پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ آخر یہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو۔

دنیا میں صرف ایک ہی ایسی سرزمین ہے جسے دارالاسلام کہا جا سکتا ہے۔ اور وہ ملک ہے جہاں اسلامی ریاست قائم ہو، شریعتِ الٰہی کی فرماں روائی ہو، حدود اللہ کی پاسداری ہو، اور جہاں مسلمان باہم مل کر امورِ مملکت سرانجام دیتے ہوں۔ اس کے علاوہ جو بھی سرزمین ہو گی وہ دارالحرب کے حکم میں داخل ہے۔ دارالحرب کے ساتھ ایک مسلمان دو ہی طرح کا رویّہ اختیار کر سکتا ہے: جنگ یا معاہدۂ امان کے تحت صُلح، معاہد ملک دارالاسلام کے حکم میں ہرگز نہیں ہو گا۔

اس کے اور دارالاسلام کے مابین ولایت کا
رشتہ قائم نہیں ہو سکتا:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا مِن بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنكُمْ ۚ (انفال: ۷۲ تا ۷۵)

جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے، اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایکدوسرے

کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام) آنہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں۔ ہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُسے دیکھتا ہے۔ جو لوگ منکرِ حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں، اگر تم (اہلِ ایمان ایک دوسرے کی حمایت) نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جہاد کیا اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچّے مومن ہیں۔ ان کے لیے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے۔ اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کر کے آگئے اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد کرنے لگے وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں۔

اس روشن اور مکمل ہدایت اور اس قطعی اور فیصلہ کن تعلیم کو لے کر اسلام دنیا میں رونق افروز ہوا۔ اور اس نے انسان کو خاک اور مٹّی کے رشتوں اور خون و گوشت کے رابطوں سے نجات دے کر اُسے اعلیٰ وارفع مقام بخشا۔ اسلام کی نظر میں مسلمان کا کوئی وطن نہیں ہے۔ اگر اس کا کوئی وطن ہے تو صرف وہ خطّۂ زمین جہاں شریعتِ الٰہی کا علم لہرا رہا ہو، اور باشندوں کے باہمی روابط تعلق باللہ کی بنیاد پر قائم ہوں۔ اسلام کی نظر میں مسلمان کی کوئی

قومیت نہیں ہے۔ اگر اس کی کوئی قومیت ہے تو صرف وہ عقیدہ ہے جس کے تحت وہ دارالاسلام کے اندر بسنے والی جماعت مسلمہ کا ایک رکن بنتا ہے۔ مسلمان کی کوئی رشتہ داری اور قرابت نہیں ہے، سوائے اس کے جو ایمان اور عقیدہ کے تقاضے میں وجود میں آتی ہے اور جس کے بعد اُس کے اور اس کے دوسرے دینی ساتھیوں کے درمیان ایک نہایت مضبوط و مستحکم ناطہ وجود میں آجاتا ہے۔ مسلمان کی اپنے ماں، باپ، بھائی، بیوی اور خاندان کے ساتھ اُس وقت تک کوئی رشتہ داری استوار نہیں ہو سکتی جب تک وہ بنیادی اور اوّلین رشتہ قائم نہ ہو جو سب کو اپنے خالق سے جوڑتا ہے، اور پھر اُسی ربانی رشتہ کی بنیاد پر اُن کے درمیان خونی اور نسلی قرابتیں بھی استوار نہ ہو جاتی ہیں:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۔ (نساء: ۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی جان سے اُس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔

لیکن ربانی رشتہ اس امر میں مانع نہیں ہے کہ ایک مسلمان اختلافِ عقیدہ کے باوجود والدین کے ساتھ معروف کی حد تک اس وقت تک حُسنِ سلوک اور

حسنِ معاشرت رکھے جب تک وہ اسلامی محاذ کے دشمنوں کی صفوں میں شامل نہ ہوں - اگر وہ کفار کی کھلم کھلا حمایت پر اُتر آئیں تو ایسی صورت میں مسلمان کی اپنے والدین کے ساتھ کوئی رشتہ داری اور صلہ رحمی کا تعلق باقی نہیں رہتا۔ اور حسنِ معاشرت اور نیک برتاؤ کی تمام پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں - عبداللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا اُس کے صاحبزادے حضرت عبداللہ نے اس معاملے میں ہمارے لیے نہایت درخشاں مثال پیش کی ہے :

ابن جریر نے ابن زیاد کی سند سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کے صاحبزادے حضرت عبداللہ کو بلا کر فرمایا : آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا باپ کیا کہہ رہا ہے ؟ عبداللہ نے عرض کیا : میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں اُس نے کیا کہا ہے ؟ آنجناب صلعم نے فرمایا ، وہ کہتا ہے کہ اگر ہم مدینہ لوٹ گئے تو وہاں عزت والا ذلت والے کو نکال باہر کرے گا ! حضرت عبداللہ نے کہا : اے اللہ کے رسول خدا کی قسم اُس نے درست کہا ہے ، بخدا آپ عزت والے ہیں اور وہی ذلیل ہے - یا رسول اللہ ! خدائے برتر کی قسم ، آپ کی مدینہ میں تشریف آوری کے وقت اہلِ یثرب کو معلوم ہے کہ اس شہر میں مجھ سے زیادہ اپنے والد کا فرمانبردار کوئی شخص نہیں تھا - اور اب اگر اللہ اور اُس کے رسول کی خوشنودی اس میں ہے کہ میں والد کا سر اُن کی خدمت میں پیش کر دوں تو میں اُس کا سر لائے دیتا ہوں - جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : " ایسا نہ کرو " چنانچہ جب مسلمان مدینہ پہنچے تو عبداللہ بن ابی کے لڑکے حضرت عبداللہ مدینہ کے باہر اپنے باپ کے

سامنے تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے۔ اور اس سے کہنے لگے کہ کیا تو نے یہ کہا ہے کہ اگر ہم مدینہ لوٹے تو وہاں کا عزّت والا ذلیل لوگوں کو نکال دے گا، خدائے بزرگ کی قسم تجھے ابھی معلوم ہو جائے گا کہ تو عزّت والا ہے یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ خدا کی قسم جب تک اللہ اور اس کے رسول اجازت نہ دیں، تجھے مدینہ کا سایہ نصیب نہیں ہو سکتا اور تو مدینہ میں ہرگز پناہ نہیں لے سکتا۔ عبداللہ بن ابیّ نے چلّا کر دو مرتبہ کہا: اے خزرج کے لوگو! دیکھو یہ میرا ہی بیٹا مجھے گھر میں داخل ہونے سے روک رہا ہے۔ حضرت عبداللہ اُس کے شور و ہنگامہ کے باوجود یہی کہتے رہے کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اذن نہ ہو خدا کی قسم تجھے ہرگز مدینہ میں قدم نہ رکھنے دُوں گا۔ یہ شور سُن کر کچھ لوگ حضرت عبداللہ کے پاس جمع ہو گئے اور انہیں سمجھایا بجھایا۔ مگر وہ اس بات پر مُصر رہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے اذن کے بغیر میں اسے مدینہ میں گھسنے نہیں دُونگا۔ چنانچہ چند لوگ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آپ کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ آپؐ نے سُن کر فرمایا، عبداللہ کے پاس جاؤ اور اُسے کہو: "اپنے باپ کو گھر آنے سے نہ روکے"! چنانچہ وہ لوگ عبداللہ کے پاس آئے اور انہیں آنحضورؐ کے ارشاد سے آگاہ کیا۔ حضرت عبداللہ کہنے لگے: اگر اللہ کے نبی کا حکم ہے تو اب یہ داخل ہو سکتا ہے۔

جب عقیدہ و ایمان کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے تو اس کے بعد نسب و رحم کے رشتے نہ بھی ہوں تو بھی تمام اہلِ ایمان باہم بھائی بھائی بن جاتے ہیں۔ اور ان میں وہ مضبوط تر رابطہ وجود میں آ جاتا ہے جو انہیں یک قالب و یک

جان بنا دیتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : انما المومنون اخوۃ (تمام اہل ایمان بھائی بھائی ہیں) ۔ اس مختصر ارشاد میں حصر بھی ہے اور تاکید بھی ۔ نیز فرمایا :

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِکَ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ۔ (انفال : ۷۲)

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑا اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں ۔

اس آیت میں جس ولایت کا ذکر کیا گیا ہے وہ صرف ایک ہی وقت میں پائی جانے والی اور ایک ہی نسل تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ آئندہ آنے والی نسلوں تک بھی منتقل ہوتی رہتی ہے ، اور اُمتِ مسلمہ کے اگلوں کو پچھلوں سے اور پچھلوں کو اگلوں کے ساتھ محبت و مودت اور وفاداری و غمگساری اور رحم دلی و شفقت کی ایک مقدس و لازوال لڑی میں پرو دیتی ہے :

وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِھِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ ھَاجَرَ اِلَیْھِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِھِمْ حَاجَۃً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ وَمَنْ یُّوْقَ

شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ

جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ

لِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ

فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ

رَّحِیْمٌ ۝ (حشر : ۱۰)

اور جو لوگ مہاجرین کی ہجرت سے پہلے مدینے میں رہتے تھے اور ایمان لا چکے تھے (یعنی انصار) وہ ہجرت کرنے والوں سے محبّت کرتے ہیں اور مالِ غنیمت میں سے مہاجرین کو جو کچھ بھی دے دیا جائے اُس کی وجہ سے یہ اپنے دل میں اُس کی کوئی طلب نہیں پاتے اور خواہ انہیں تنگی ہی کیوں نہ ہو مگر وہ (اپنے مہاجرین بھائیوں کو) ترجیح دیتے ہیں۔ اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا گیا تو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو اُن کے بعد آئے وہ یہ دُعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو معاف فرما جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں۔ ——— اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کے لیے کوئی کینہ نہ رہنے دے، اے ہمارے پروردگار بے شک تو بڑا شفقت رکھنے والا اور مہربان ہے۔

ہر دور میں عقیدہ ہی بنائے جمع وتفریق تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب حکیم میں مومنین کے سامنے انبیائے سابقین کی برگزیدہ جماعت کی متعدد مثالیں اور قصے بیان فرمائے ہیں۔ ان انبیاء علیہم السّلام نے مختلف ادوار میں ایمان کی قندیلیں فروزاں کیں، اور ایمان و عقیدہ کے نورانی قافلوں کی قیادت فرمائی۔ ان مثالوں میں اللہ تعالیٰ نے واضح کیا ہے کہ ہر نبی کی نگاہ میں اصل رشتہ اسلام اور عقیدہ کا رشتہ تھا۔ ان کے مقابلے میں کوئی اور رشتہ اور قرابت داری کسی لحاظ سے بھی نافع ثابت نہیں ہو سکتی۔

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ
اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ٥
قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ
صَالِحٍ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّيْۤ اَعِظُكَ
اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ٥ قَالَ رَبِّ اِنِّيْۤ اَعُوْذُ بِكَ
اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ
وَتَرْحَمْنِيْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ٥

(هود: ۴۵ تا ۴۷)

اور نوح نے اپنے رب کو پکارا۔ کہا اے رب میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں

سے بڑا اور بہتر حاکم ہے۔ جواب میں ارشاد ہوا اے نوح! وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے۔ لہٰذا تو اس بات کی مجھ سے درخواست نہ کر جس کی حقیقت تو نہیں جانتا میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنا لے نوح نے فوراً عرض کیا: اے میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ۝ (بقرہ: ۱۲۴)

اور یاد کرو جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ اُن سب میں پورا اترگیا۔ تو اس نے کہا: "میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔" ابراہیم نے عرض کیا: اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟ اس نے جواب دیا: میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۔

(بقرہ : ١٢٦)

اور جب ابراہیم نے دُعا کی : اے میرے رب، اس شہر کو امن کا شہر بنا دے، اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں، انہیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے، اللہ نے فرمایا : اور جو نہ مانے گا، دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اُسے بھی دُوں گا، مگر آخرِ کار اُسے عذابِ جہنّم کی طرف گھسیٹوں گا اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔

حضرت ابراہیم ؑ نے جب اپنے باپ کو اور اپنے اہلِ خاندان کو گمراہی پر مُصِر دیکھا تو وہ اُن سے کنارہ کش ہو گئے اور فرمایا :

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَاۗءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ○

(مریم : ۴۸)

میں آپ لوگوں کو چھوڑتا ہوں اور اُن ہستیوں کو بھی جنہیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا، امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کے نامراد نہ رہوں گا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور ان کی قوم کا ذکر کرتے ہوئے اُن پہلوؤں کو مومنین کے سامنے خاص طور پر پیش کیا ہے جن میں مومنین کو ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے۔ فرمایا:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ۔ (ممتحنہ: ۴)

بے شک تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھی بہترین نمونہ ہیں جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے دوٹوک کہہ دیا کہ ہم کو تم سے اور جن کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو اُن سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم تمہارے (معبودوں اور عقیدوں کو) کو بالکل نہیں مانتے اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لیے کُھلم کُھلا عداوت اور دشمنی قائم ہو گئی ہے یہاں تک کہ تم صرف اللہ پر ایمان لے آؤ۔

وہ جواں ہمت اور جواں سال رفقاء جو اصحاب کہف کے لقب سے مشہور ہیں جب انہوں نے دیکھا کہ دین و عقیدہ کی متاعِ گراں بہا کے لیے ان کے وطن، ان کے اہل و عیال اور ان کے خاندان و قبیلہ میں کوئی گنجائش نہیں رہی

ہے تو وہ اپنے اہل وعیال کو خیرباد کہہ کر اپنی قوم سے کنارہ کش ہو گئے، وہ اپنے وطن سے ہجرت کر گئے اور متاعِ ایمان کو لے کر اپنے پروردگار کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تاکہ وہ دین وایمان کی بنیاد پر صرف ایک اللہ کے بندے بن کر رہ سکیں:—

إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى ۝
وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَدْعُوَ مِنْ دُونِهِ إِلَٰهًا لَقَدْ
قُلْنَا إِذًا شَطَطًا ۝ هَٰؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ
آلِهَةً لَوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ ۝ فَمَنْ
أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۝ وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ
وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ
رَبُّكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِنْ أَمْرِكُمْ مِرْفَقًا ۝

(الکہف: ۱۳ تا ۱۶)

وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔ ہم نے اُن کے دل اُس وقت مضبوط کر دیے جب وہ اُٹھے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اُسے

چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بے جابات کریں گے۔ (پھر انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا) یہ ہماری قوم تو ربِّ کائنات کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا بیٹھی ہے۔ یہ لوگ اپنے اس عقیدے پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ آخر اُس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟ اب جب کہ تم ان سے اور ان کے معبودانِ غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو۔ تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمہارے کام کے لیے سروسامان مہیا کرے گا۔

حضرت نوح علیہ السّلام اور حضرت لوط علیہ السّلام کی بیویوں کا ذکر قرآن میں آتا ہے۔ ان برگزیدہ پیغمبروں اور ان کی بیویوں کے درمیان صرف اس بنا پر تفریق ہو جاتی ہے کہ ان کی بیویوں کا عقیدہ خاوندوں کے عقیدہ سے جُدا تھا۔ اور وہ آلودۂ شرک تھیں:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝ (تحریم: ۱۰)

کافروں کی عبرت کے لیے اللہ نوح ؑ کی عورت اور لوط ؑ کی عورت کی مثال دیتا ہے۔ یہ دونوں عورتیں ہمارے بندوں میں سے دو بندوں کے نکاح میں تھیں۔ ان دونوں نے ان سے خیانت کی مگر اللہ کی گرفت سے دونوں کے شوہر ان کو نہ بچا سکے اور دونوں عورتوں کو حکم دیا گیا کہ جاؤ دوسرے لوگوں کے ساتھ تم بھی جہنم میں داخل ہو جاؤ۔

ساتھ ہی جابر و سرکش فرمانروا فرعون مصر کی بیوی کی مثال بیان کی گئی ہے اور اہلِ ایمان کے لیے اُسوہ کے طور پر اُس کا ذکر کیا گیا ہے:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ وَنَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (تحریم: ۱۱)

اور اہلِ ایمان کی نصیحت کے لیے اللہ فرعون کی بیوی کی مثال بیان کرتا ہے جب کہ اُس نے دُعا کی: اے میرے پروردگار! میرے لیے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا اور مجھ کو فرعون اور اُس کے کردارِ بد سے نجات دے اور مجھے ظالم لوگوں سے بھی نجات دے۔

علیٰ ہذا القیاس قرآن نے ہر نوعیت کے رشتوں اور قرابتوں کے بارے میں مختلف مثالیں بیان کی ہیں۔ نوح علیہ السّلام کے قصّہ میں رشتۂ پدری کی مثال ملے گی، حضرت ابراہیم ؑ کے قصّے میں بیٹے اور وطن کے رشتے کی مثال بیان کی گئی ہے، اصحابِ کہف کے قصّے میں اعزّہ واقارب قبیلہ وبرادری اور وطن وقوم کے رشتہ کی جامع مثال پیش کی گئی ہے، حضرت نوح اور لوط علیہما السّلام کے قصّے اور فرعون کے تذکرے میں ازدواجی تعلّق کی مثال دی گئی ہے۔ قرآن کی نظر میں یہ تمام رشتے عقیدہ وایمان کے ابدی رشتہ اور سرمدی رابطہ کے انقطاع کے بعد ناقابلِ لحاظ قرار پاتے ہیں۔

قومِ رسولِ ہاشمی کی بنائے ترکیب

جب انبیاء کی برگزیدہ جماعت روابط وتعلقات اور رشتوں اور برادریوں کا حقیقی پیمانہ اور پاکیزہ تصوّر پیش کر چکتی ہے تو امّت وسط کی باری آتی ہے۔ چنانچہ امت وسط کے اندر بھی اس نوعیّت کی مثالوں اور نمونوں اور تجربوں کا وسیع اور ایمان افروز ذخیرہ ملتا ہے۔ یہ امّت بھی اُسی ربّانی راستے پر گامزن نظر آتی ہے جو ازل سے اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے گروہ کے لیے منتخب وپسند فرمایا ہے۔ اس امّت کے اندر بھی آپ دیکھیں گے کہ جب رشتۂ ایمان ٹوٹ جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب انسان اور انسان کے درمیان اوّلین رشتہ منقطع ہو جاتا ہے تو ایک ہی خاندان اور قبیلے کے لوگ جُدا جُدا گروہوں میں

بٹ جاتے ہیں، بلکہ ایک ہی گھر کے مختلف افراد میں جُدائی واقع ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ مومنین کی صفت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (مجادلہ: ۲۲)

جو لوگ اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں تُو انہیں ان لوگوں سے دوستی کرتے نہ پائے گا جو اللہ اور اُس کے رسول کے دشمن ہیں گو وہ اُن کے باپ، یا بیٹے یا بھائی یا اہلِ قبیلہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ (اہل ایمان) وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کے اندر اللہ نے ایمان نقش کر دیا ہے اور فیضانِ غیبی سے اُن کی تائید کی ہے۔ اور وہ ان کو ایسے باغوں میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔

خدا اُن سے خوش اور وہ خدا سے خوش ۔ یہ خدائی گروہ ہے ۔ اور آگاہ رہو کہ خدائی گروہ ہی فلاح پانے والا ہے ۔

ایک طرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے چچا ابو لہب اور آپ کے چچا زاد بھائی عمرو بن ہشام (ابو جہل) کے درمیان تمام خونی اور نسلی رشتے ٹوٹ جاتے ہیں ، مہاجرینِ مکہ اپنے اہل و اقربا کے خلاف برسرِ جنگ نظر آتے ہیں اور معرکۂ بدر میں ان کے خلاف صف آرا ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف مکہ کے ان مہاجرین کے درمیان اور یثرب کے انصار کے درمیان عقیدہ کا سرمدی رشتہ استوار ہو جاتا ہے ۔ اور وہ سگے بھائی بن جاتے ہیں اور خونی اور نسلی رشتے سے بھی زیادہ قریب ہو جاتے ہیں ۔ یہ رشتہ مسلمانوں کی ایک نئی برادری کو جنم دیتا ہے اس برادری میں عرب بھی شامل ہیں اور غیر عرب بھی ۔ روم کے صہیب بھی اس کے رکن ہیں اور حبش کے بلال اور فارس کے سلمان بھی ۔ ان کے درمیان قبائلی عصبیت مٹ جاتی ہے ، نسلی تعصب و تفاخر ختم ہو جاتا ہے ، وطن و قوم کے نعرے تحلیل ہو جاتے ہیں اور اللہ کا پیغمبر اُن سب سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے :-

۱ ۔ دعوھا فانھا منتنۃ (ان عصبیتوں سے دست بردار ہو جاؤ یہ متعفن لاشیں ہیں)

۲ : لیس منّا من دعا الی عصبیۃ ، ولیس منّا من قاتل علی

عصبیۃ، ولیس منا من مات علی عصبیۃ (جو کسی جاہلی عصبیت کی طرف دعوت دیتا ہے وہ ہم میں سے نہیں، جو عصبیت کے لیے جنگ کرتا ہے وہ ہم میں سے نہیں ہیں جو عصبیت پر مرتا ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے)

دارالاسلام اور دارالحرب

الغرض ان مردار و متعفن عصبیتوں کا چلن ختم ہو گیا۔ نسبی تعصّب کا مردار لاشہ دفن کر دیا گیا، نسلی برتری کا جاہلی نعرہ پاؤں تلے روند ڈالا گیا، قومی گھمنڈ کی گندگی زائل کر دی گئی اور اُس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ اور انسان نے گوشت اور خون کے تعفّن اور زمین و وطن کے لوث سے آزاد رہ کر آفاقِ عالم کے عطر بیز چمنستان میں مشامِ جان کو معطّر کیا۔ اس دن سے مسلمان کا وطن جغرافی حدود اربعہ میں محدود نہیں رہا بلکہ پورا دارالاسلام اس کا وطن ٹھیرا۔ وہ وطن جہاں عقیدہ و ایمان کی حکمرانی ہوتی ہے، اور صرف شریعتِ الٰہی کا سکّہ رواں ہوتا ہے۔ یہی وطن مسلمان کی پناہ گاہ بنا، اسی کی مدافعت کے لیے وہ کمر بستہ رہا اور اسی کے تحفظ و استحکام میں اُس نے جان کا نذرانہ پیش کیا اور اُس کی توسیع و اضافہ میں اُس نے جامِ شہادت نوش کیا۔ یہ دارالاسلام ہر اُس شخص کی مامَن ہے جو عقیدۂ اسلام کا قلادہ گلے میں ڈال لیتا ہے، اور شریعت اسلامی کو قانونِ زندگی کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے، وہ شخص بھی اس پناہ گاہ سے استفادہ کر سکتا ہے جو مسلمان تو نہیں ہے مگر اسلامی شریعت کو نظامِ ریاست کی حیثیت سے قبول

کرتا ہے۔ جیسا کہ ان اہلِ کتاب کا معاملہ ہے جو دارالاسلام کے اندر بود و باش رکھتے ہیں۔ مگر وہ سرزمین جس پر اسلام کی حکمرانی کا پھریرا نہ لہراتا ہو اور شریعتِ الٰہی کو نافذ نہ کیا جاتا ہو وہ مسلمان کے لیے بھی اور دارالاسلام کے معاہد ذمّی کے لیے بھی دارالحرب ہے۔ مسلمان اس کے خلاف شمشیر بکف رہے گا خواہ وہ اُس کی جنم بھومی ہو، اُس سے اُس کے نسبی اور سسرالی رشتے وابستہ ہوں، اس کے اموال و املاک اُس میں موجود ہوں اور اُس کے مادّی مفادات اُس سے وابستہ ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مکّہ کے خلاف تلوار اٹھائی حالانکہ مکّہ آپؐ کا پیدائشی اور آبائی وطن تھا۔ وہیں آپؐ کے اعزّہ و اقارب اور خاندان کے لوگ رہتے تھے، آپؐ کے اور آپؐ کے صحابہ کے مکانات اور جائدادیں بھی وہیں تھیں۔ جنہیں آپؐ ہجرت کے وقت وہاں چھوڑ آئے تھے۔ مگر مکّہ کی سرزمین پیغمبر خدا کے لیے اور ان کی امّت کے لیے اُس وقت تک دارالاسلام نہ بن سکی جب تک وہ اسلام کے آگے سرنگوں نہیں ہو گئی اور شریعت غرّا کے ہاتھ اقتدار کی مسند نہیں آگئی۔

اسی کا نام اِسلام ہے، یہی نرالا تصوّر زندگی اسلام کہلاتا ہے، اسلام چند اشلوکوں کا نام نہیں ہے کہ بس انہیں زبان سے دُہرا دینا ہی کافی ہو، اور نہ کسی مخصوص سرزمین کے اندر جس پر اسلام کا بورڈ چسپاں ہو یا جو اسلامی نام سے پکاری جاتی ہو پیدا ہو جانے سے کسی آدمی کو خود بخود اسلام کا سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے،

اور نہ یہ مسلمان والدین کے گھر میں پیدا ہونے سے وراثت میں مل جاتا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا
شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (نساء : ۶۵)

نہیں اے محمد، تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔

صرف اسی کا نام اسلام ہے، اور صرف وہی سرزمین دارالاسلام ہے جہاں اسی کی حکومت ہو۔ یہ وطن و نسل، نسب و خون اور قبیلہ و برادری کی حدبندیوں سے بالا و برتر ہے۔

اسلامی وطن اور اس کے دفاع کا اصل محرک۔

اسلام نے آکر انسان کو ان تمام زنجیروں سے رہا کیا جنہوں نے اسے زمین کی پستی سے باندھ رکھا تھا، تاکہ انسان آسمان کی پہنائیوں میں پرواز کے قابل ہو سکے۔ خون و نسب کے تمام سفلی طوق و سلاسل پاش پاش کر دے تاکہ انسان آزاد ہو کر بلند ترین فضاؤں میں پرواز کر سکے۔ اسلام نے بتایا کہ مسلمان کا وطن زمین کا کوئی مخصوص خطہ نہیں ہے جس کی محبت میں اسے تڑپنا چاہیئے اور جس کے دفاع میں

اُسے جان کی بازی لگانی چاہیئے، مسلمان کی قومیت جس سے وہ متعارف ہوتا ہے کسی حکومت کی عطا کردہ نیشنلٹی نہیں ہے، مسلمان کی برادری جس کی وہ پناہ لیتا ہے اور جس کی خاطر لڑتا اور مرتا ہے وہ خون کے رشتہ سے ترکیب نہیں پاتی۔ مسلمان کا پرچم جس پر وہ ناز کرتا ہے اور جس کو اونچا رکھنے کے لیے وہ جان تک کی بازی لگا دیتا ہے وہ کسی قوم کا پرچم نہیں ہے، مسلمان کی فتح یابی جس کے لیے وہ بے تاب رہتا ہے اور جس سے ہمکنار ہونے پر وہ خدا کے سامنے سجدہ شکر ادا کرتا ہے، وہ محض فوجی غلبہ نہیں ہے بلکہ وہ فتح حق ہے جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ
يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ
رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝

(سورۃ النصر)

جب آگئی اللہ کی مدد اور فتح۔ اور تو نے دیکھ لیا لوگوں کو اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے۔ سو تُو اپنے رب کی حمد کی تسبیح کر اور اُس سے استغفار کر، بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

یہ فتح یابی صرف پرچمِ ایمان کے تحت حاصل ہوتی ہے دوسرے کسی جھنڈے

کی عصبیت اس میں شامل نہیں ہوتی ، یہ جہاد دین خدا کی نصرت اور شریعتِ حقّہ کی سر بلندی کے لیے کیا جاتا ہے ، کسی اور مقصد اور مفاد کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ یہ اُس دارالاسلام کا دفاع ہے جس کی شرائط و خصائص ہم اُوپر بیان کر آئے ہیں ، اس دفاع میں کسی اور وطنی اور قومی تصوّر کی آمیزش نہیں کی جا سکتی۔ فتح یابی کے بعد فاتح فوج کی تمام تر توجہ ، دلچسپی اور انہماک کا مرکز مالِ غنیمت کا حصول نہیں ہوتا ، اور نہ یہ جنگ کسی دنیاوی شہرت یا ناموری کے لیے لڑی جاتی ہے ، بلکہ اس کا مقصد خالصتہً اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتا ہے اور اللہ کی رضاجوئی اور اس کی تسبیح اور استغفار اس کا اصل مقصود ہے۔ یہ جنگ وطنی حمیّت اور قومی عصبیت کی بنیاد پر بھی نہیں لڑی جاتی نہ اہل و عیال کا تحفظ اس کی اصل غرض اور محرک ہوتا ہے۔ البتّہ ان کے تحفظ اور حمایت کا جذبہ اگر اس بنا پر شامل ہو کہ ان کے دین و ایمان کو فتنہ و آزمائش سے بچایا جائے ، تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص بہادری دکھانے کے لیے لڑتا ہے ، دوسرا حمیّت کی خاطر لڑتا ہے اور تیسرا دِکھاوے کے لیے لڑتا ہے ان میں سے کونسا اللہ کی راہ میں لڑتا ہے ؟ آپ نے جواب دیا : جو اس لیے لڑتا ہے کہ صرف اللہ کا کلمہ بلند ہو صرف وہ اللہ کی راہ میں لڑتا ہے۔

شہادت کا مرتبہ صرف اس جنگ کے نتیجے میں نصیب ہو سکتا ہے جو صرف اللہ کی خاطر ہو۔ دوسرے مقاصد کی خاطر جو قتال آرائی ہو گی اُس میں یہ مرتبہ بلند حاصل نہ ہو گا۔

ہر ملک مسلمان کے عقیدہ و ایمان سے برسرِ پیکار ہو، دینی امور کو سرانجام دینے میں اُسے مانع ہو اور اتباعِ شریعت کو معطّل کر رکھا ہو وہ دارالحرب شمار ہو گا، چاہے اُس میں اُس کے اعزّہ و اقارب اور خاندان اور قبیلہ کے لوگ بستے ہوں، اس میں اُس کا سرمایہ لگا ہو، اور اس کی تجارت و خوش حالی اُس سے وابستہ ہو۔ اس کے مقابلے میں ہر وہ خطّہ ارض جس میں مسلمان کے عقیدہ کو فروغ و غلبہ حاصل ہو، اللہ کی شریعت کی عملداری ہو وہ دارالاسلام کہلائے گا خواہ اُس میں مسلمان کے اہل و عیال کی بود و باش نہ ہو، اُس کے خاندان اور قبیلہ کے لوگ وہاں نہ رہتے بستے ہوں اور اُس کی کوئی تجارت اور مادّی منفعت اُس سے وابستہ نہ ہو ——— "وطن" اسلامی اصطلاح میں اُس دیار کا نام ہے جس میں اسلام کے عقیدہ کی حکمرانی ہو، اسلامی نظامِ حیات قائم اور برپا ہو اور شریعتِ الٰہی کو برتری حاصل ہو۔ وطن کا یہی مفہوم انسانیّت کے مرتبہ و مذاق کے مطابق ہے۔ اسی طرح قومیت اسلام کی رُو سے عقیدہ اور نظریۂ حیات سے عبارت ہے، اور آدمیت کے شرف و فضل کے ساتھ جو رابطہ اور رشتہ مناسبت رکھتا ہے وہ یہی تصوّرِ قومیّت ہو سکتا ہے۔

قومی اور نسلی نعرے جاہلیت کی سڑاند ہیں

رہی قبیلہ و برادری اور قوم و نسل اور رنگ و وطن کی عصبیت اور دعوت تو نہ صرف یہ دعوت تنگ نظری، تنگ دامانی اور محدود الاثر ہے بلکہ انسانی پس ماندگی اور دورِ وحشت کی یادگار ہے۔ یہ جاہلی عصبیت ان ادوار میں انسان پر مسلط ہوتی تھی جب اُس کی روح انحطاط اور پستی کا شکار تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے "سڑاند" سے تعبیر فرمایا ہے، یعنی ایسا مردار جس سے عفونت کی لپٹیں اُٹھ رہی ہوں۔ اور انسان کا ذوقِ نفیس کرب و کراہت محسوس کر رہا ہو۔

جب یہود نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ نسلی اور قومی بنیاد پر اللہ کی محبوب اور چہیتی قوم ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اُن کا یہ دعوےٰ اُن کے منہ پر دے مارا اور ہر دور میں ہر نسل اور ہر قوم کے لیے اور ہر جگہ کے لوگوں کے لیے بزرگی اور تقربِ الٰہی اور شرف و فضیلت کا صرف ایک ہی معیار بتایا اور وہ ہے ایمان باللہ۔ ارشاد ہوا۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ط
قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ط وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝
قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى
اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ

وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ
رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ
فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ
وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ
وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ
مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ؕ

(البقرہ : ۱۳۵ تا ۱۳۷)

یہودی کہتے ہیں: یہودی ہو جاؤ تو راہِ راست پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں: عیسائی ہو جاؤ تو ہدایت ملے گی۔ ان سے کہو: نہیں بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیم کا طریقہ اختیار کرو اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا۔ مسلمانو! کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوب کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے تمام پیغمبروں کو اُن کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔ پھر اگر وہ اُسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم لائے ہو، تو ہدایت پر ہیں، اور اگر اس سے مُنہ پھیریں، تو کھُلی بات ہے کہ

وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں۔ لہٰذا اطمینان رکھو کہ اُن کے مقابلے میں اللہ تمہاری حمایت کے لیے کافی ہے۔ وہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔ اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا؟ اور ہم اُسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں۔

اللہ کی محبوب اور برگزیدہ اور پسندیدہ قوم درحقیقت وہ امّت مسلمہ ہے جو نسلی اور قومی اختلاف، رنگ و روپ کی بوقلمونی اور وطن و ملک کی مغایرت کے باوجود صرف اللہ کے پرچم کے نیچے مجتمع اور متّحد ہوتی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ۔

(آلِ عمران: ۱۱۰)

تم وہ بہترین گروہ ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

یہ وہ خدا پرست اُمت ہے جس کے ہر اوّل دستہ کی شان یہ تھی کہ اس میں عرب کے معزز خاندان کے چشم و چراغ ابو بکرؓ شامل تھے تو حبش کے بلالؓ اور روم کے صہیبؓ اور فارس کے سلمانؓ بھی موجود تھے۔ بعد کی نسلیں بھی ہر دَور میں اسی دل نشین انداز اور حیرت زا نظام کے جلو میں یکے بعد دیگرے منصۂ شہود

پر اُبھرتی رہیں۔ عقیدۂ توحید اس امّت کی قومیّت رہی ہے، دارالاسلام اس کا وطن رہا ہے، اور اللہ کی حاکمیّت اس کا امتیازی شعار رہا ہے اور قرآن اس کا دستورِ حیات رہا ہے۔

وطن و قوم کی عصبیتیں منافیٔ توحید ہیں

وطن و قومیّت اور قرابت کا یہ پاکیزہ وارفع تصوّر آج داعیانِ حق کے دلوں پر پوری طرح نقش ہو جانا چاہیئے۔ اور اس وضاحت اور درخشندگی کے ساتھ اُن کے دل و دماغ کے ریشے ریشے میں اُتر جانا چاہیئے کہ اس میں جاہلیّت کے بیرونی تصوّرات کا شائبہ تک موجود نہ ہو اور شرکِ خفی کی کوئی قسم اُس میں راہ نہ پا سکے۔ ہر قسم کے شرک سے خواہ وہ وطن پرستی ہو، یا نسل پرستی، قوم پرستی، دنیا کے گھٹیا مفادات اور منفعتوں کی پرستش ہو، ان سب سے یہ تصوّر پاک و شفاف ہے۔ شرک کی یہ سب قسمیں اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں جمع کر دی ہیں اور ایک پلڑے میں ان سب کو رکھا ہے اور دوسرے میں ایمان اور اُس کے تقاضوں کو رکھ دیا ہے اور پھر انسان کو اس بات کی چھٹی دے دی ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کس پلڑے کو ترجیح دیتا ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ

وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ن

اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ
مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ
بِاَمْرِهٖ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ٥

(التوبہ : ۲۴)

اے نبی! کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اُس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔

اسی طرح داعیانِ حق اور اسلامی تحریک کے علمبرداروں کے دلوں میں جاہلیت اور اسلام کی حقیقت اور دارالحرب اور دارالاسلام کی تعریف کے بارے میں سطحی قسم کے شکوک و شبہات پیدا نہیں ہونے چاہئیں درحقیقت ایسے شکوک و شبہات کے راستے ہی سے درحقیقت ان میں سے اکثر کے اسلامی تصوّر اور یقین و اذعان پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے ——— ورنہ یہ بات کسی وضاحت کی

محتاج نہیں ہے کہ جس ملک پر اسلامی نظام کی حکمرانی نہ ہو اور اسلامی شریعت قائم نہ ہو اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات بھی محتاج تشریح نہیں کہ کوئی ایسا ملک دار الاسلام نہیں ہو سکتا جس میں اسلام کے لائے ہوئے طرز زندگی اور قانون حیات کو اقتدار حاصل نہ ہو۔ ایمان کو چھوڑ کر انسان کفر ہی کے نرغے میں جاتا ہے۔ جہاں اسلام نہ ہوگا وہاں لازماً جاہلیت کا چلن ہوگا اور حق سے روگردانی کے بعد اُسے گمراہی اور ضلالت کے سوا کچھ نہ نصیب ہوگا۔

بابِ دہم

دُور رس تبدیلی کی ضرورت

ہم اسلام کو کیسے پیش کریں

جب ہم لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کریں تو چاہے ہمارے مخاطب مسلمان ہوں یا غیر مسلم بہرحال ایک بدیہی حقیقت سے ہمیں پوری طرح باخبر رہنا چاہیئے، اور یہ وہ حقیقت ہے جو خود اسلام کے مزاج اور فطرت کا نتیجہ ہے، اور اسلام کی تاریخ اس کا ثبوت فراہم کر رہی ہے۔ مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

اسلام اس زندگی اور کائنات کا جو تصوّر پیش کرتا ہے وہ ایک نہایت درجہ جامع اور منفرد تصوّر ہے، اور امتیازی اوصاف کا حامل ہے۔ اس تصوّر سے انسانی زندگی کا جو نظام ماخوذ ہوتا ہے وہ بھی اپنے تمام اجزائے ترکیبی سمیت اپنی ذات

ہیں ایک مستقل اور کامل نظام ہے اور مخصوص امتیازات سے بہرہ مند ہے ۔ یہ تصوّر بنیادی طور پر اُن تمام جاہلی تصوّرات سے متصادم ہے جو قدیم زمانے میں رائج رہے ہیں یا دَورِ حاضر میں پائے جاتے ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تصوّر بعض سطحی اور ضمنی جزئیات اور تفصیلات میں جاہلی تصوّرات سے کبھی کبھار اتفاق کرے لیکن جہاں تک ان اصولوں اور ضابطوں کا سوال ہے جن سے یہ جزوی اور ضمنی پہلو برآمد ہوتے ہیں تو وہ ان تمام نظریات و تصوّرات سے مختلف اور بالکل جُدا ہیں جو انسانی تاریخ کے اندر اب تک رائج اور فروغ پذیر رہے ہیں ۔ چنانچہ اسلام کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ ایک ایسی انسانی زندگی کی تشکیل کرتا ہے جو اُس کے تصوّر کی صحیح نمائندہ اور اس کی عملی تفسیر ہو ۔ وہ دنیا کے اندر ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ طریقہ حیات کی تصویر ہوتا ہے ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے امّتِ مسلمہ کو دنیا کے اندر اٹھایا ہی اس غرض کے لیے ہے کہ وہ الٰہی طریقۂ زندگی کی ترجمان بن کر رہے اور اُسے دنیا کے سامنے عمل کی زبان سے پیش کرے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۔

(آل عمران : ۱۱۰)

تم وہ بہترین گروہ ہو جسے انسانوں کے لیے اٹھایا گیا ہے ۔ تم

نیکی کا حکم دیتے ہو اور بُرائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔
اس امّت کی وہ یہ صفت بیان کرتا ہے کہ:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ
وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ

(الحج: ۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دیں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بُرائی سے روکیں گے۔

اسلام کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ دنیا کے اندر قائم شدہ جاہلی تصوّرات کے ساتھ مصالحانہ رویہ اختیار کرے یا جاہلی نظاموں اور جاہلی قوانین سے بقائے باہم کے اصول پر معاملہ کرے۔ یہ مؤقف اسلام نے اُس روز بھی نہیں اختیار کیا تھا جس روز اُس نے دنیا میں قدم رکھا تھا، اور نہ آج یہ اُس کا موقف ہو سکتا ہے اور نہ آئندہ کبھی یہ اُمید ہے کہ اس موقف کو وہ اپنائے گا۔ جاہلیت خواہ کسی دَور سے تعلق رکھتی ہو وہ جاہلیت ہی ہے۔ اور وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی بندگی سے انحراف اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظامِ زندگی سے بغاوت ہے۔ وہ ناخدا شناس ماخذ سے زندگی کے قوانین و شرائع، قواعد و اصول، عادات و روایات اور اقدار و معیارات اخذ کرنے کا نام ہے۔ اس کے برعکس اسلام اللہ کے سامنے

سرافگندگی کا نام ہے۔ اسلام کسی دور اور کسی حالت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ہر دور کے لیے ہے اور ہر حالت کے لیے نافع ہے۔ اس کا مشن انسانوں کو جاہلیت کی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانا ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں جاہلیت یہ ہے کہ انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کی بندگی کریں۔ یعنی کچھ انسان غالب و برتر بن کر دوسرے انسانوں کے لیے منشائے خداوندی سے ہٹ کر قانون سازی کریں اور انہیں اس سے بحث نہ ہو کہ قانون سازی کے اختیارات کس شکل میں استعمال کیے گئے ہیں۔ اور اسلام یہ ہے کہ تمام انسان صرف خدائے واحد کی بندگی کریں۔ اپنے تمام تصوّرات وعقائد، قوانین وشرائع اور اقدار حیات اور ردّ وقبول کے معیار اللہ سے حاصل کریں اور مخلوق کی عبودیت سے آزاد ہو کر ہمہ تن خالق کی بندگی کے لیے یکسو ہو جائیں۔

یہ حقیقت خود اسلام کی فطرت کا تقاضا ہے اور اسلام کے اُس کردار سے عیاں ہوتی ہے جو دنیا کے اندر اُس نے انجام دیا ہے یا انجام دینا چاہتا ہے۔ یہی حقیقت ہمیں ان تمام انسانوں کے سامنے جنہیں ہم اسلام کی دعوت پیش کریں، وہ خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم یکساں طور پر واضح کر دینی چاہیئے۔

اسلام اور جاہلیّت میں ہرگز مصالحت نہیں ہو سکتی

اسلام جاہلیّت کے ساتھ نیمے دروں نیمے بروں نوعیّت کی کوئی مصالحت قبول نہیں کرتا۔ معاملہ خواہ اس کے تصوّر اور نظریہ کا ہو اور خواہ اس تصوّر اور

نظریہ پر مرتّب ہونے والے قوانین حیات کا، اسلام رہے گا، یا جاہلیّت رہے گی۔ تیسری ایسی کوئی شکل جس میں آدھا اسلام ہو اور آدھی جاہلیت اسلام کو قبول یا پسند نہیں ہے۔ اس معاملے میں اسلام کا نقطۂ نگاہ بالکل واضح اور روشن ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ حق ایک ایسی اکائی ہے جس کا تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ حق نہ ہوگا، تو لازمًا باطل ہوگا۔ حق اور باطل دونوں میں اختلاط و امتزاج اور بقائے باہم محال ہے۔ حکم یا اللہ کا چلے گا، یا جاہلیّت کا۔ اللہ کی شریعت کا سکہ رواں ہوگا یا پھر ہوائے نفس کی عملداری ہوگی۔ اس حقیقت کو قرآن نے بکثرت آیات میں بیان کیا ہے:

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ۔ (المائدہ: ۴۹)

(پس اے محمد!) آپ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کریں۔ اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔ ان سے ہوشیار رہیں کہ کہیں یہ لوگ آپ کو فتنہ میں ڈال کر اُس ہدایت کے کچھ حصّے سے منحرف نہ کر دیں جو خدا نے آپ کی طرف نازل کی ہے۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ۔ (شوریٰ: ۱۵)

پس اس طرف دعوت دیں۔ اور اس پر جمے رہیں جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (القصص: ۵۰)

اور اگر آپ کے مطالبے کا جواب نہ دیں تو جان لو کہ یہ لوگ اپنی خواہشات کے پیروکار ہیں۔ اور اس شخص سے بڑھ کر گمراہ کون ہو سکتا ہے جس نے اپنی خواہش کی پیروی کی اور اللہ کی ہدایت کی پرواہ نہ کی۔ بے شک اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

(الجاثیہ: ۱۸)

اے نبی ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک صاف شاہراہ

(شریعت) پر قائم کیا ہے۔ لہذا تم اُسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔ یہ اللہ کے سامنے تمہارے کچھ کام نہ آئیں گے۔ اور بے شک ظالم ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور اللہ پرہیزگاروں کا دوست ہے۔

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ (المائدہ: ۵۰)

پس کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں حالاں کہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

ان آیات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ صرف دو ہی راہیں ہیں، تیسری کوئی راہ نہیں ہے۔ یا تو اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر سر تسلیم خم کرنا ہو گا۔ اور یا بصورت دیگر خواہش نفس کی پیروی ہو گی، اللہ کا فیصلہ تسلیم کرنا ہو گا یا جاہلیت کے سامنے سر افگندگی۔ اگر اللہ کے نازل کردہ قانون کو بنائے فیصلہ نہ ٹھیرایا جائے گا تو طبعی طور پر یہ احکام الٰہی سے اعراض و انکار ہو گا۔ کتاب اللہ کے مذکورہ بالا واضح بیانات کے بعد کسی بحث و مجادلہ اور حیلہ جوئی کی گنجائش نہیں ہے۔

اسلام کا اصل مشن

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دنیا کے اندر اسلام کا فرض اوّلین یہ ہے کہ جاہلیت کو انسانی قیادت کے منصب سے ہٹا کر زمام قیادت خود اپنے ہاتھ میں لے اور اپنے مخصوص طریقِ حیات کو جو مستقل اور جداگانہ اوصاف و خصائص کا حامل ہے نافذ کرے۔ اس صالح قیادت سے اُس کا مقصد انسانیت کی فلاح و بہبود ہے جو صرف انسان کے اپنے خالق کے سامنے جُھک جانے اور انسان اور کائنات کی حرکت میں توافق و ہم آہنگی قائم ہو جانے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کو اُس مقامِ رفیع پر متمکن کرے جو اللہ تعالیٰ نے اُس کے لیے تجویز کیا ہے اور خواہشاتِ نفس کے غلبہ و استیلاء سے اُسے نجات دے۔ یہ وہی مقصد ہے جسے حضرت ربیع بن عامر نے فارسی فوج کے قائد رستم کے جواب میں بیان کیا تھا۔ رستم نے پوچھا تھا کہ "تم لوگ یہاں کس غرض کے لیے آئے ہو؟ ربعی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس لیے بھیجا ہے کہ ہم انسانوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر خدائے واحد کی بندگی میں داخل کریں۔ دُنیا پرستی کی تنگنائیوں سے نکال کر دنیا اور آخرت دونوں کی وسعتوں سے ہمکنار کریں، انسانی ادیان کے ظلم و ستم سے نجات دے کر انہیں اسلام کے عدل میں لائیں۔"

اسلام انسان کی ان نفسانی خواہشات کی تائید و توثیق کے لیے نہیں آیا جن کا انسان مختلف نظریات و تخیّلات کے رُوپ میں اور گوناگوں رسم و رواج

کے پردے میں اظہار کرتا رہا ہے۔ اسلام کی ابتدا کے وقت بھی ایسے نظریات و رسوم پائے گئے تھے اور آج بھی مشرق و مغرب میں انسانیت پر خواہشات نفس کا غلبہ و حکمرانی ہے۔ اسلام خواہشات کی اس حکمرانی کو مضبوط بنانے نہیں آیا، بلکہ اس لیے آیا ہے کہ وہ ایسے تمام تصوّرات و قوانین اور رسوم و روایات کی بساط لپیٹ دے۔ اور ان کی جگہ اپنی مخصوص بنیادوں پر انسانی زندگی کی تعمیرِ نو کرے، ایک نئی دنیا کی تخلیق کرے، زندگی کی نئی طرح ڈالے جس کا مرکز و محور اسلام ہو۔

جاہلیت کیساتھ اسلام کی جزوی مشابہت؟

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اسلام کے بعض جزوی پہلو اُس جاہلیت کی زندگی کے بعض پہلوؤں کے مماثل و مشابہ نظر آتے ہیں جن میں لوگ عملاً گھرے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جاہلیت کے کچھ اجزاء اسلام میں پائے جاتے ہیں بلکہ یہ محض اتفاق ہے کہ بعض سطحی اور فروعی امور میں اسلام اور جاہلیت میں مشابہت پیدا ہو گئی ہے۔ ورنہ دونوں الگ الگ درخت کی مانند ہیں اور دونوں کی جڑیں اور تنے اور شاخیں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ بلکہ اُن میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک وہ درخت ہے جسے حکمتِ الٰہی نے کاشت کیا اور سینچا ہے اور دوسرا وہ (شجرِ خبیث) ہے جو انسانی خواہشات کی زمین سے بر آمد ہوا ہے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ

وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ (اعراف: ۵۸)

جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے ربّ کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار

کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

جاہلیت خبیث اور فاسد مادّہ ہے۔ خواہ وہ قدیم جاہلیت ہو یا جدید۔ جاہلیت کے خبث اور فساد کا ظاہری ہیولیٰ تو مختلف زمانوں میں مختلف رُوپ دھارتا رہا ہے۔ مگر اس کی جڑ اور اصل ایک ہی رہی ہے اور یہ جڑ کوتاہ نظر اور جاہل انسانوں کی خواہشات میں پیوست ہوتی ہے جو اپنی نادانی اور خود بینی کے جال سے نکلنے کی سکت نہیں رکھتے، یا پھر چند افراد یا چند طبقات یا چند قوموں یا چند نسلوں کی مفاد پرستی اس کا ماخذ ہوتی ہے اور یہ مفاد پرستی عدل و انصاف، حق و صداقت اور خیر و صلاح کے تقاضوں پر غالب آجاتی ہے۔ مگر اللہ کی بے لاگ شریعت ایسے تمام مفاسد و عوامل کی جڑ کاٹ دیتی ہے، اور انسانوں کے لیے ایک ایسا قانون مہیا کر دیتی ہے جو انسان کی دخل اندازی سے پاک ہوتا ہے۔ اور اُس کے بارے میں یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں انسانی جہل کی آمیزش ہو گی یا انسانی اہواء و اغراض کی ناپاکی اُس میں شامل ہو گی یا وہ کسی انسانی گروہ کی مفاد پرستی کی نذر ہو کر بے اعتدالی کا شکار ہو گا۔

اللہ کے بھیجے ہوئے نظریۂ حیات اور انسانوں کے اختراع کردہ نظریہ میں یہی بُنیادی اور جوہری فرق ہے۔ اور اس بنا پر دونوں کا ایک نظام کے تحت جمع ہونا محال اور دونوں میں کبھی توافق پیدا ہونا ناممکن ہے۔ اور اسی بنا پر کسی ایسے نظامِ حیات کا ایجاد کرنا بھی سعیٔ لاحاصل ہے جو آدھا تیتر ہو اور آدھا بٹیر۔ اس کا نصف اسلام سے ماخوذ ہو اور نصف جاہلیت سے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کرتا اسی طرح وہ اپنے نازل کردہ نظریۂ زندگی کے ساتھ کسی اور

نظریہ کی شرکت کو بھی قبول نہیں کرتا۔ یہ دونوں جرم اللہ کے نزدیک ایک ہی درجہ رکھتے ہیں۔ اور دونوں دراصل ایک ہی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔

خالص اِسلام کی دعوت

ہم جب لوگوں کو اسلام کی طرف بُلائیں اور دعوت و تبلیغ کا کام سرانجام دیں تو اِسلام کے بارے میں یہ مذکورہ حقیقت ہمارے ذہنوں میں اس قدر مضبوطی کے ساتھ جاگزیں اور پیوست اور واضح ہونی چاہیئے کہ اس کے اظہار و اعلان میں کبھی ہماری زبان نہ لڑکھڑائے اور کسی موقع پر ہم شرم محسوس نہ کریں، اور لوگوں کو اس بارے میں کسی شک و اشتباہ میں نہ رہنے دیں، اور ان کو اس بات کا پُوری طرح قائل کر کے چھوڑیں کہ اگر وہ دامنِ اسلام میں آئیں گے تو ان کی زندگیوں کی کایا پلٹ جائے گی۔ اُن کے اعمال و کردار اور اُن کے اصول و ضوابط بھی بدلیں گے اور اُن کے تصوّرات اور اندازِ فکر بھی تبدیل ہو گا۔ اس تبدیلی کی بدولت اسلام اُنہیں وہ خیر کثیر عطا کرے گا جس کی وسعتیں انسانی قیاس میں نہیں سما سکتیں وہ ان کے افکار و نظریات میں رفعت پیدا کرے گا، اُن کے حالات و معاملات کا معیار بلند کرے گا اور انہیں اُس مقام عزّت و مرتبۂ شرف سے قریب تر کرے گا جو سزاوار انسانیت ہے۔ جس پست جاہلی زندگی سے وہ اب تک آلودہ رہے ہیں اُس کی کوئی آلائش باقی نہ چھوڑے گا، اِلاّ یہ کہ جاہلی دَور کی کوئی ایسی جزئیات پائی جائیں جو اتفاق سے نظامِ اسلامی کی بعض جزئیات سے ہمرنگ اور ہم آہنگ ہوں، لیکن وہ بھی اپنی اصلی حالت میں نہ رہیں گی بلکہ اسلام کی اس اصل عظیم سے مربوط ہو جائیں گی جو جاہلیت کی اس خبیث اور غیر بارآور اصل سے بنیادی طور پر مختلف ہے

جن کے ساتھ وہ آج تک وابستہ تھے۔ اسلام یہ انقلاب عظیم برپا کرنے کے بعد انسانوں کو علم و تحقیق کے ان شعبوں سے محروم نہیں کرے گا جو مشاہدہ و استقراء پر مبنی ہیں بلکہ وہ ان شعبوں کو مزید ترقی دے گا۔ الغرض داعیانِ اسلام کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اس وہم میں نہ رہنے دیں کہ اسلام بھی انسان کے وضع کردہ اجتماعی نظریات میں سے ایک نظریہ اور خود ساختہ نظاموں میں سے ایک نظام ہے جو مختلف ناموں اور مختلف جھنڈوں کے ساتھ رُوئے زمین میں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ وہ خالص اور بے لاگ نظام ہے۔ وہ مستقل بالذات انفرادیت کا مالک ہے، جداگانہ تصوّرِ زندگی رکھتا ہے اور جُداگانہ طرزِ حیات لے کر آیا ہے۔ وہ انسانیت کو جو کچھ دینا چاہتا ہے وہ وضعی نظاموں کی خیالی جنتوں سے ہزار درجہ بہتر و سُود مند ہے۔ وہ ایک اعلیٰ و ارفع نظام ہے پاکیزہ و اُجلا نظریۂ حیات ہے، وہ جمال جہاں افروز ہے، وہ معتدل و متوازن راہ ہے، اُس کے سوتے براہ راست خدائے برتر و عظیم کے ازلی و ابدی چشموں سے پھُوٹے ہیں۔

جب ہم اس انداز پر اسلام کا شعور حاصل کرلیں گے تو یہ شعور ہمارے اندر یہ فطری صلاحیّت بھی پیدا کر دے گا کہ ہم اسلام کی دعوت پیش کرتے وقت پُوری خود اعتمادی اور قوّت کے ساتھ، بلکہ پُوری ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ لوگوں سے مخاطب ہوں، اس شخص کی سی خود اعتمادی جسے یہ بھرپُور یقین ہو کہ وہ جس دعوت کا حامل ہے وہ سراسر حق ہے اور اس کے برخلاف دوسرے لوگ جس راہ پر چل رہے ہیں وہ باطل کی راہ ہے، اس شخص کی سی ہمدردی جو انسانوں کو

شقاوت اور بدنصیبی میں گھرا ہوا پا رہا ہو اور یہ جانتا ہو کہ انہیں آغوش سعادت میں کیونکر لایا جا سکتا ہے۔ اس شخص کی سی دِل سوزی جو لوگوں کو تاریکی میں ٹامک ٹوئیے مارتا ہوا دیکھ رہا ہو، اور جانتا ہو کہ انہیں وہ روشنی کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے جس کے بغیر وہ راہ حق نہیں پا سکتے۔ الغرض اسلام کا سچا شعور حاصل ہو جانے کے بعد ہمیں یہ حاجت نہیں ہو گی کہ ہم چور دروازوں سے لوگوں کے ذہنوں میں اسلام کو اُتاریں اور ان کی نفسانی خواہشات اور باطل اور گمراہانہ نظریات کو تھپکی دیں۔ بلکہ ہم ڈھکی چھپی رکھے بغیر صاف صاف اسلام کی دعوت ان کے سامنے رکھیں گے اور ان کو توجہ دلائیں گے کہ یہ جاہلیت جس میں تم گھرے ہوئے ہو یہ ناپاک اور نجس ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس نجاست اور گندگی سے پاک کرنا چاہتا ہے، یہ صورتِ حال جس میں تم سانس لے رہے ہو سراسر خبث اور فساد ہے اور اللہ تمہارے لیے پاکیزہ و طیّب نظام پسند کرتا ہے، یہ طرز زیست جسے تم نے اختیار کر رکھا ہے انتہائی پستی اور گراوٹ سے عبارت ہے اور اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارا مقام بلند عطا کرنا چاہتا ہے، تمہارے یہ لیل و نہار شقاوت اور ذلّت اور پس ماندگی و پژمردگی سے کہر آلود ہو چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے آسانی پیدا کرے، تمہیں اپنی آغوش رحمت میں لے اور تمہیں سعادت مندی کا تاج پہنائے۔ اسلام تمہارے نظریات و افکار کو بدل ڈالے گا، تمہارے حالات کا پانسہ پلٹ دے گا، تمہیں نئی قدروں سے متعارف کرائے گا، تمہیں ایسی بالا و برتر زندگی سے سرفراز کرے گا کہ اس کے مقابلے میں تم اپنی موجودہ زندگی کو خود بخود ہیچ سمجھنے لگو گے۔ تمہارے لیل و نہار میں وہ ایک ایسا انقلاب برپا

کر دے گا کہ تم خود اپنی موجودہ عالم گیر صورتِ حال سے نفرت کرنے لگو گے وہ تمہیں ایسے تہذیبی سانچوں سے بہرہ یاب کرے گا کہ ان کو پا کر تم اپنے موجودہ تہذیبی سانچوں کو جو روئے زمین میں رائج ہیں حقیر سمجھنے لگو گے۔ اگر تم اپنی حرماں نصیبی کی وجہ سے اِسلامی زندگی کی عملی صورت نہیں دیکھ سکے ہو کیونکہ تمہارے دشمن اس بات پر متحد اور صف آراء ہیں کہ زندگی کا یہ نظام دنیا میں کبھی برپا نہ ہو سکے اور جامۂ عمل نہ پہنے، تو آؤ ہم تمہیں اس کی حلاوت سے آشنا کرتے ہیں کیونکہ بتوفیقِ ایزدی اس زندگی کا ہم اپنے قلب وضمیر کی دنیا میں مشاہدہ کر چکے ہیں، ہم اپنے قرآن، اپنی شریعت اور اپنی تاریخ کے جھروکوں سے اُس کا نظارہ کر چکے ہیں، اپنے مستقبل کے خوشنما تخیل میں جس کے آنے میں ہمیں شمہ بھر شک نہیں ہے اُسے جھانک چکے ہیں۔

ہمیں چاہیئے کہ اسی طرز پر اور اسی انداز سے ہم لوگوں کے سامنے اسلام پیش کریں، اسلام کی طبیعت وفطرت بھی یہی ہے اور یہی وہ اصل شکل ہے جس میں اسلام پہلی مرتبہ انسانوں سے مخاطب ہوا تھا۔ جزیرۃ العرب میں، فارس میں، روم میں اور ہر اُس خطے میں جہاں اسلام نے لوگوں کو پکارا اسی انداز اور اسی ڈھنگ سے پکارا۔ اُس نے انسانیت کو اُونچی فضا سے جھانکا اس لیے کہ یہی اُس کا حقیقی مقام تھا، اُس نے انسانیت سے دردبھری زبان میں گفتگو کی کیوں کہ یہی اُس کی فطرت تھی، اُس نے انسانیت کو کسی ابہام و تردد کے بغیر دوٹوک الفاظ میں چیلنج کیا کیونکہ یہی اُس کا طریقہ تھا، اُس نے کبھی لوگوں کو اس خوش فہمی میں نہیں رہنے دیا کہ وہ اُن کی عملی زندگی کو،

ان کے تصوّرات و افکار کو اور ان کی اقدار و اخلاق کو مس نہیں کرے گا اور اگر کیا بھی تو محض اِکّا دُکّا تبدیلیوں کے لیے!!، اسی طرح اُس نے کبھی انسانوں کے من بھاتے اصول و ضوابط اور نظریات و افکار سے اپنے آپ کو وابستہ نہیں کیا، نہ ان سے اپنے آپ کو تشبیہ دی، جیسا کہ آج کل ہمارے بعض مفکّرین اسلام کا شیوہ بن چکا ہے۔ کبھی وہ "اسلامی ڈیموکریسی" کی اصطلاح وضع کرتے ہیں اور کبھی "اسلامی سوشلزم" کی۔ اور کبھی کہتے ہیں کہ دنیا کے موجودہ اقتصادی، سیاسی اور قانونی نظاموں میں اسلام کو بس چند معمولی سی تبدیلیاں کرنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح کی چکنی چپڑی باتیں صرف اس لیے کی جاتی ہیں کہ لوگوں کی خواہشات کو تھپکی دی جائے۔

لیکن یہ اسلام ہے، خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ یہ اسلام اُس اسلام سے بالکل مختلف ہے جو بعض مفکّرین اسلام پیش کرتے ہیں۔ یہ جاہلیّت کا طوفان جو روئے زمین کا احاطہ کیے ہوئے ہے، انسانیّت کو اس سے نکال کر اسلام کے پُرامن گہوارے میں داخل کرنے کے لیے دُور رَس اور وسیع تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اِسلام کا نقشۂ حیات جاہلیّت کے اُن تمام نقشوں سے یک قلم مختلف و متضاد ہے جو دورِ قدیم میں پائے گئے تھے یا عہدِ حاضر میں پائے جاتے ہیں، موجودہ انسانیت شقاوت و زَبُوں حالی کے جن تودوں کے نیچے کراہ رہی ہے وہ چند معمولی تبدیلیوں سے نہیں ہٹائے جا سکتے۔ انسانیت اس شقاوت و زَبُوں حالی کی زندگی سے اگر نجات پا سکتی تو وہ صرف اسی صورت میں کہ ایک ہمہ گیر، دُور رَس اور جوہری انقلاب برپا کیا جائے ——— مخلوق کے وضع کردہ نظاموں

کو ہٹا کر خالق کے نازل کردہ نظام کو جاری کیا جائے ، انسانی قوانین کو فارغخطی دے کر انسانوں کے پروردگار کے قانون کو اختیار کیا جائے ، بندوں کی حکمرانی سے نجات پا کر بندوں کے رب کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالا جائے - یہ ہے وہ صحیح اور حقیقت پسندانہ طریق کار - اس طریقِ کار کا اظہار ہمیں برملا اور دوٹوک کر دینا چاہیئے اور اس معاملے میں لوگوں کو کسی شک و التباس میں نہ رہنے دینا چاہیئے -

ہو سکتا ہے کہ لوگ شروع شروع میں اس طرزِ دعوت سے بدکیں ، اس سے دُور بھاگیں اور خوف کھائیں - لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ، لوگ اُس وقت بھی اسلام کی دعوت سے ایسے ہی دُور بھاگتے رہے تھے اور خوف زدہ اور متنفر تھے جب پہلی مرتبہ ان کے سامنے یہ دعوت پیش کی گئی تھی ، انہیں یہ شدید ناگوار گزرتا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُن کے افکار و اوہام کی تحقیر کرتے ہیں ، ان کے دیوتاؤں پر نکتہ چینی کرتے ہیں ، ان کے قوانینِ حیات پر نکیر کرتے ہیں ، ان کے رسوم و رواج اور عادات سے بیزار ہیں ، اور اپنے لیے اور اپنے چند ماننے والوں کے لیے ان کے رسوم و روایات اور قوانین و ضوابط کے برخلاف نئے اصول و ضوابط اور اقدار و اخلاق اختیار کر رکھے ہیں ——— لیکن آخر کار ہوا کیا ؟ یہی لوگ جنہیں پہلی مرتبہ حق اچھا نہیں لگا اُسی حق کے دامن رحمت میں انہوں نے پناہ لی ، جس حق سے وہ اس طرح بدکتے تھے کہ کانھم حمر مستنفرۃ فرّت من قسورۃ (گویا وہ جنگلی گدھے ہیں اور شیر دیکھ کر بھاگ اُٹھے ہیں) جس کے خلاف انہوں نے اپنی پوری طاقت اور ساری تدبیریں صرف کر دیں ، جس کے ماننے والوں کو انہوں نے مکہ کی بے بس زندگی کے دوران طرح

طرح کے اذیت ناک اور زہرہ گداز عذاب دیے اور پھر ہجرت کے بعد مدینہ کی زندگی میں بھی جب انہیں طاقت پکڑتے دیکھا تو اُن کے خلاف تند و تیز جنگیں برپا کر دیں اُسی کے بالآخر وہ غلام بے دام بن کے رہے۔

دعوت اسلامی کی کامیابی کی کلید

دعوتِ اسلامی کو آغاز میں جن حالات سے گزرنا پڑا تھا وہ آج کے حالات کی بہ نسبت زیادہ حوصلہ افزا، امید بخش اور سازگار نہ تھے۔ اس وقت بھی وہ ایک انجانی دعوت تھی جاہلیت اُسے جھٹلاتی تھی، وہ مکّہ کی گھاٹیوں کے اندر محصور رہی، ارباب جاہ و شوکت پنجے جھاڑ کر اُس کے پیچھے پڑے رہے، اپنے دَور میں وہ تمام دنیا کے لیے ایک اجنبی چیز تھی، اُسے اطراف کی ایسی عظیم اور جابر و سرکش سلطنتوں نے گھیر رکھا تھا جو اُس کے تمام بنیادی اصولوں اور مقاصد کی دشمن تھیں۔ بایں ہمہ یہ دعوت ان شدید تر حالات میں بھی اپنے پاس قوت کا غیر معمولی سرمایہ رکھتی تھی اسی طرح آج بھی یہ اُسی قوت سے بہرہ ور ہے، اور آئندہ بھی اس کی یہ قوت قائم و دائم رہے گی۔ اس کی قوت کا راز خود اس کے عقیدہ کی فطرت میں پنہاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بُرے سے بُرے حالات اور کٹھن سے کٹھن ماحول میں بھی اس کا کام جاری رہا ہے۔ اس کی طاقت کا منبع وہ سیدھا سادا اور روشن "حق" ہے جس پر یہ دعوت قائم ہے، اس کی قوت کی کلید اس کی فطرت انسانی کے ساتھ ہم آہنگی ہے۔ اس کی قوت کا سرچشمہ اسکی اس حیرت انگیز صلاحیت میں پوشیدہ ہے کہ یہ ہر مرحلہ میں انسانیت کی قیادت کی اہل ہے اور اُسے ترقی و عروج پر گامزن کر سکتی ہے، خواہ انسانیت

اقتصادی اور اجتماعی لحاظ سے اور علمی اور عقلی پہلو سے دورِ انحطاط میں ہو یا ترقی بکنار، نیز اس کی قوّت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ یہ واشگاف انداز میں جاہلیّت اور اس کی تمام مادّی طاقتوں کو چیلنج کرتی ہے، اور اس اعتماد اور جزم کے ساتھ اُس کے سامنے خم ٹھونک کر آتی ہے کہ اپنے کسی اصول میں اُسے کسی ایک شوشے کی تحریف بھی گوارا نہیں، وہ جاہلیّت کی خواہشوں سے قطعًا مصالحت نہیں کرتی، اور نہ جاہلیّت کے اندر سرایت کرنے کے لیے وہ چور دروازوں اور حیلے بہانوں کا سہارا ڈھونڈتی ہے، وہ حق کا بہ بانگِ دہل اعلان کر دیتی ہے اور لوگوں کو پوری طرح آگاہ کر دیتی ہے کہ وہ سراسر خیر، سراسر رحمت اور سراسر برکت ہے۔ اللہ تعالیٰ جو انسانوں کا خالق ہے وہ خوب جانتا ہے کہ ان کی فطرت کیا ہے، اور ان کے دلوں کے روزن کہاں کہاں ہیں۔ اُسے خوب معلوم ہے کہ اگر حق کو صراحت اور قوّت کے ساتھ علانیہ پیش کر دیا جائے اور اسے پیش کرنے میں کسی رازداری، نقاب پوشی اور گو مگو کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے تو وہ دلوں کے اندر اُتر کر رہتی ہے۔

جزوی اسلام کی دعوت مضر ہے۔

انسانی نفوس ایک طرزِ زندگی کو چھوڑ کر دوسرا طرزِ زندگی اپنانے کی پوری صلاحیّت اور استعداد رکھتے ہیں۔ بلکہ مکمّل تبدیلی ان کے لیے بسا اوقات جزوی تبدیلیوں کی نسبت زیادہ آسان ہوتی ہے۔ ایک ایسے نظامِ حیات کی طرف منتقل ہونا جو پہلے سے زیادہ برتر، زیادہ کامل اور زیادہ پاکیزہ ہو خود انسانی فطرت بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ اس کے برعکس اگر اسلامی نظام

خود ہی اِدھر اُدھر کی چند سطحی تبدیلیوں پر اکتفا کرے۔ تو پھر پُورے جاہلی نظام کو چھوڑ کر پُورے اسلامی نظام کی طرف آنے کی وجہ جواز کیا ہوگی؟ ظاہر ہے کہ ایک مانوس نظام پر جما رہنا زیادہ قرینِ عقل ہے، اس لیے کہ کم از کم وہ جما جمایا نظام تو ہے۔ اُسی کے اندر اصلاحات اور تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔ پھر ایسے نظام کی طرف جس کی اکثر و بیشتر خصوصیات نئے نظام سے ملتی جُلتی ہوں اُسے اُٹھا کر پھینک دینے اور اُس کے بجائے ایک غیر قائم شدہ نظام کی طرف رجوع کرنے کی آخر ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے؟

اسلام کو اپنی صفائی کی کوئی ضرورت نہیں

اسی طرح بعض ایسے متکلّمین اسلام بھی پائے جاتے ہیں جو لوگوں کے سامنے اسلام کو اس حیثیّت سے پیش کرتے ہیں کہ گویا اسلام ایک ملزم ہے اور وہ اس کے وکیل صفائی ہیں۔ وہ اسلام کی صفائی اور دفاع جس طریقہ سے کرتے ہیں وہ کچھ اس طرح کا ہے کہ "نظامِ حاضر نے فلاں اور فلاں کام کیے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اسلام نے یہ کام کر کے نہیں دکھائے، مگر صاحبو! اسلام تو ان کاموں کو پہلے کر چکا ہے جنہیں موجودہ تہذیب ۱۴سو سال بعد کر رہی ہے"۔ کیا گھٹیا دفاع ہے اور کیا بھونڈی صفائی ہے!! —— اسلام جاہلی نظاموں اور اُن کے بُرے اور تباہ کُن تصرّفات کو اپنے کسی عمل کے جواز کی دلیل ہرگز نہیں بناتا۔ یہ تہذیبیں جنہوں نے اکثر لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رکھا ہے اور ان کے دل و دماغ ماؤف کر رکھے ہیں یہ خالصتہً جاہلی نظام کے شاخسانے ہیں۔ اور اسلام کے مقابلے میں ہر لحاظ سے ناقص، کھوکھلی اور ہیچ اور پوچ ہیں۔ یہ دلیل قابلِ

اعتبار نہیں ہے کہ ان تہذیبوں کے سائے میں بسنے والے لوگ ان لوگوں سے زیادہ خوش حال ہیں جو نام نہاد عالمِ اسلامی میں رہتے ہیں۔ ان علاقوں کے باشندے اپنی موجودہ زبوں حالی کو اس لیے نہیں پہنچے کہ یہ مسلمان ہیں بلکہ اس لیے کہ انہوں نے اسلام سے منہ موڑ رکھا ہے۔ اسلام تو لوگوں کے سامنے اپنی صداقت کی یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ: وہ ناقابلِ قیاس حد تک جاہلیّت سے اولیٰ اور افضل ہے، وہ جاہلیت کو برقرار رکھنے کے لیے نہیں بلکہ اُسے بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکنے کے لیے آیا ہے، وہ انسانیّت کو اس آلودگی پر جسے تہذیب کا نام دیا جاتا ہے اشیرباد دینے کے لیے نہیں آیا بلکہ وہ انسانیت کو اس درک اسفل سے نکالنے کے لیے آیا ہے۔

ہمیں اس حد تک تو شکست خوردہ نہیں ہو جانا چاہیئے کہ ہم رائج الوقت نظریات و افکار کے اندر اسلام کی شبیہیں ڈھونڈنے لگیں، ہمیں ان تمام نظریات و افکار کو خواہ مشرق ان کا علمبردار ہو اور خواہ مغرب پسِ پُشت ڈالنا چاہیئے اس لیے کہ یہ نظریات ان اعلیٰ و ارفع مقاصد کے مقابلہ میں نہایت پست، حقیر اور غیر ترقی یافتہ ہیں جن کو اسلام اپنا مطمح نظر قرار دیتا ہے اور انسانیت کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جب ہم لوگوں کو صحیح اسلام کی بنیاد پر دعوت دیں گے اور ان کے سامنے اسلام کے جامع تصوّر کا اساسی عقیدہ پیش کریں گے تو خود ان کی فطرت کی گہرائیوں سے اس کے حق میں آواز اُٹھے گی جو ایک تصوّر سے دوسرے تصوّر کی طرف اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہو جانے کا انہیں جواز بلکہ وجوب بھی فراہم کرے گی۔ لیکن یہ دلیل انہیں

ہرگز متاثر نہیں کرسکتی کہ ہم اُن سے کہیں کہ رائج نظام کو چھوڑ کر ایک غیر رائج نظام کی طرف آؤ یا یہ تمہارے رائج نظام کے اندر صرف ضروری تبدیلیاں کرے گا اور تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیئے اس لیے کہ موجودہ نظام کے اندر بھی تم جو کچھ کر رہے ہو وہی کچھ تم نئے نظام میں بھی کرسکو گے - بس تمہیں اپنی عادات اور خواہشات اور رکھ رکھاؤ میں بعض خفیف تبدیلیاں کرنی پڑیں گی - اور ان کے بعد تم جس عادت اور خواہش کے بھی رسیا ہو وہ علی حالہ باقی رہے گی - اُس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا یا کیا بھی گیا تو یُونہی سرسری سا -

یہ طریقہ بظاہر بڑا آسان اور مرنجان مرنج ہے مگر اپنی سرشت کے لحاظ سے کسی قسم کی کشش نہیں رکھتا - مزید برآں یہ حقیقت سے بھی بعید ہے - کیوں کہ حقیقت تو یہ پکار رہی ہے کہ اسلام محض زندگی کے اصول ونظریات ہی تبدیل نہیں کرتا، محض حیاتِ اجتماعیہ کے قوانین وشرائع ہی دگرگوں کر کے نہیں رکھ دیتا بلکہ احساسات اور جذبات تک کی دنیا کو بھی اس طرح بنیاد و اساس کے لحاظ سے بدل کر رکھ دیتا ہے کہ جاہلی زندگی کے کسی اصول کے ساتھ اس کا رشتہ باقی نہیں رہتا - مختصر طور پر یُوں بیان کر دینا کافی ہوگا کہ اسلام زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملہ سے لے کر بڑے سے بڑے تک میں انسانوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر خدائے واحد کی بندگی کی طرف منتقل کر دیتا ہے - اس کے بعد:

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ وَمَنْ
كَفَرَ فَإِنَّ اللهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ -

جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کا راستہ اختیار کرے اور جو کفر کرتا ہے تو بے شک اللہ تعالیٰ تمام اہلِ جہان سے بے نیاز ہے۔

یہ مسئلہ درحقیقت کفر و ایمان کا مسئلہ ہے۔ شرک و توحید کا مسئلہ ہے، جاہلیت اور اسلام کا مسئلہ ہے۔ اسی بنیادی حقیقت کو اظہر من الشمس ہونا چاہیئے۔ جن لوگوں کی زندگی جاہلیت کی زندگی ہے، وہ لاکھ اسلام کا دعوٰے کریں مگر وہ مسلمان نہیں ہیں۔ ان میں اگر کچھ خود فریبی میں مبتلا ہیں یا دوسروں کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور اس خیالِ خام میں مبتلا ہیں کہ اسلام ان کی جاہلیت کا ہمنوا ہو سکتا ہے تو انہیں کون روک سکتا ہے مگر انکی خود فریبی یا جہاں فریبی سے حقیقت تو نہیں بدل سکتی۔ ان لوگوں کا اسلام نہ اسلام ہے اور نہ یہ مسلمان ہیں۔ آج اگر دعوتِ اسلامی برپا ہو تو پہلے انہی کشتگانِ جاہلیت کو اسلام کی طرف لانا اور انہیں از سرِ نو حقیقی مسلمان بنانا ہوگا۔

ہم لوگوں کو اسلام کی طرف اس لیے نہیں بُلا رہے ہیں کہ ان سے کسی اجر کے طالب ہیں اور نہ ہم ملک میں اقتدار حاصل کرنے یا فساد برپا کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اپنی ذات کے لیے ہم سرے سے کسی منفعت کا لالچ نہیں رکھتے۔ ہمارا اجر اور ہمارا حساب لوگوں کے ذمہ نہیں ہے اللہ کے ذمّہ ہے۔ لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے پر جو چیز ہمیں مجبور کرتی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ہم ان کے سچے ہمدرد اور حقیقی بہی خواہ ہیں۔ خواہ وہ ہم پر کتنے ہی مصائب کے پہاڑ توڑیں۔ داعیٔ حق کی یہی فطری شاہراہ ہے اور یہی حالات اُسے

مہمیز کا کام دیتے ہیں - لہذا لوگوں کو ہماری زندگیوں کے اندر اسلام کی صحیح تصویر نظر آنی چاہیئے - اور انہیں اُس بارگراں کا بھی صحیح اندازہ ہو جانا چاہیئے جس کے اُٹھانے کا اسلام اُن سے مطالبہ کرتا ہے اور جس کے عوض انہیں وہ لامتناہی خیر عطا کرتا ہے جس کا اسلام علمبردار ہے - اس طرح لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو جانا چاہیئے کہ جس جاہلیت میں وہ غرق ہیں اُس کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ یہ نری جاہلیت ہے " اسلام کا اس سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے - اس کا ماخذ چونکہ شریعت نہیں ہے اس لیے وہ سرتاپا ہوائے نفس ہے " اور چونکہ وہ حق ناآشنا ہے اس لیے وہ بلاشبہ باطل ہے —— فماذا بعد الحق الا الضلال -

ہم جس اسلام کے علمبردار ہیں اس میں کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جو ہمارے لیے کسی شرمندگی یا احساسِ کہتری کا موجب ہو یا جس کی صفائی کی ہمیں ضرورت ہو، اور نہ اس کے اندر کوئی ایسا نقص ہے جس کی وجہ سے ہم اُسے لوگوں تک پہنچانے کے لیے کسی طرح کی ریشہ دوانی کرنے کی ضرورت محسوس کریں - یا اُس کی اصلیت کے تقاضا کے تحت ڈنکے کی چوٹ اُس کا اعلان کرنے کے بجائے طرح طرح کی نقابیں ڈال کر اُسے پیش کریں - دراصل یہ روگ مغرب اور مشرق میں پھیلے ہوئے جاہلی نظاموں سے رُوحانی اور نفسیاتی شکست کھا جانے کی وجہ سے بعض " مسلمانوں " کو لاحق ہو گیا ہے اور وہ انسانی قوانین کے اندر ایسے پہلو تلاش کرنے میں لگے رہتے ہیں جن سے وہ اسلام کی موافقت اور تائید کر سکیں، یا وہ جاہلیت کے کارناموں کے اندر ان باتوں کی ٹوہ کرتے رہتے ہیں جن سے

یہ دلیل فراہم کر سکیں کہ اسلام نے بھی یہ کام کر دکھائے ہیں۔

جو شخص اسلام اور اس کی تعلیمات کی صفائی کی ضرورت محسوس کرتا ہے یا معذرت خواہانہ ذہنیت رکھتا ہے تو ایسا شخص ہرگز اسلام کی صحیح نمائندگی نہیں کر سکتا، بلکہ یہ وہ بیوقوف دوست ہے جو خود تو اس بودی اور کھوکھلی جاہلیت سے مرعوب و مغلوب ہو چکا ہے، جو تضاد سے بھری ہوئی ہے اور نقائص سے جس کا جسم داغ داغ ہے مگر وہ کم کوشش بایں ہمہ اُلٹا جاہلیت کے لیے جواز فراہم کرتا ہے۔ یہ حضرات اسلام کے دشمن ہیں اور اسلام کی خدمت کے بجائے اُسے ضعف پہنچاتے ہیں۔ بلکہ دوسروں کو بھی مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کی ژاژخائیوں کا سدّباب کریں۔ ان کی باتیں سُن کر یُوں محسوس ہوتا ہے کہ اسلام مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہے اور اپنا دفاع کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے!

مغرب زدہ ذہن کی واماندگیاں

جس زمانے میں میرا قیام امریکہ میں تھا اُنہی دنوں کی بات ہے کہ اسلام کے ایسے ہی نادان دوست ہمارے ساتھ اُلجھتے رہتے تھے۔ ہم لوگ جو اسلام کی طرف منسوب تھے تعداد میں کم تھے۔ مخالفین اسلام کے مقابلے میں ہمارے بعض دوست مدافعانہ موقف اختیار کرتے تھے مگر میں ان سب کے برعکس مغربی جاہلیت کے بارے میں جارحانہ مسلک پر قائم تھا اور احساسِ کہتری میں مبتلا ہوئے بغیر مغربی جاہلیت کے بودے اور متزلزل مذہبی عقائد پر تلخ تنقید کرتا، مغربی جاہلیت کے انسانیت سوز معاشرتی اور اقتصادی اور

اخلاقی حالات کو بے جھجک ننگا کرتا اور بتاتا کہ مسیحیت کے یہ اقانیم ثلاثہ، اور گناہ اور کفارہ کے نظریات عقل سلیم اور ضمیر پاکیزہ کے لیے قابلِ قبول نہیں ہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام اور اجارہ داری اور سُود خوری اور دوسرے ظالمانہ اور انسانیت کش حربے، اور یہ خود سر انفرادی آزادی جس میں اجتماعی کفالت اور باہمی ہمدردی کے لیے اس وقت تک کوئی گنجائش نہیں جب تک قانون کا ڈنڈا حرکت میں نہ آئے، زندگی کا یہ مادہ پرستانہ سطحی اور بے جان تصوّر، یہ چوپائیوں کی سی بے لگامی جسے آزادی اختلاط کا نام دیا جاتا ہے، یہ بردہ فروشی جسے آزادی نسواں سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ نظام و طلاق کے رکاکت آمیز، تکلیف دہ، اور عملی زندگی کے منافی قوانین و ضوابط، یہ ناپاک اور مجنونانہ نسلی امتیاز یہ سب کچھ عقلِ سلیم کے خلاف اور انسانیّت کے لیے باعثِ عار ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں ان کو یہ بھی بتاتا تھا کہ اسلام کس قدر عقلی و علمی نظریہ ہے، کس قدر بلند نگاہ، انسانیّت نواز اور شاداب و زرخیز نظام ہے، یہ اُن اُفقوں تک اپنی کمندیں پھینکتا ہے جن تک انسان پرواز کرنا چاہتا ہے مگر آج پہنچنے سے عاجز ہے۔ اسلام عملی زندگی کا نظام ہے اور یہ زندگی کی تمام گتھیوں کو انسان کی فطرت سلیم کے تقاضوں کی روشنی میں سُلجھاتا ہے۔

مغرب کی زندگی کے یہ عملی حقائق تھے جن سے ہم سب کو پالا پڑا تھا۔ اور جب اسلام کی روشنی میں ان حقائق کا جائزہ لیا جاتا تھا تو ان کے متوالوں کے سر بھی مارے شرم کے جُھک جاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اسلام کے ایسے دعویدار بھی موجود ہیں جو اس نجاست سے مرعوب ہو چکے ہیں جس میں جاہلیت

لت پت ہے اور وہ مغرب کے اس کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں کے اندر اور مشرق کی شرمناک اور کریہہ المنظر مادّہ پرستی کے اندر وہ چیزیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں جن کی اسلام سے مشابہت ثابت کر سکیں یا اسلام کو ان کے مشابہ و مماثل قرار دے سکیں !!

داعیانِ حق کے لیے صحیح طرزِ عمل

اس کے بعد مجھے یہ کہنے کی حاجت محسوس نہیں ہوتی کہ ہمیں یعنی دعوتِ اسلامی کے علمبرداروں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم جاہلیّت کا کس پہلو سے ساتھ دیں، جاہلیّت کے کسی نظریہ کے ساتھ یا جاہلیّت کے کسی نظام کے ساتھ یا جاہلیّت کی کسی روایت کے ساتھ کسی نوعیت کی سودا بازی کریں، چاہے ہم پر کوہ غم ہی ٹوٹ پڑے۔ اور جبر و تشدّد کا نظام ہمارے خلاف آزمائشوں کا طوفان برپا کر دے۔

ہمارا اوّلین کام یہ ہے کہ ہم جاہلیّت کو مٹا کر اُس کی جگہ اسلامی نظریات اور اسلامی اقدار و روایات کو براجمان کریں۔ یہ منشا جاہلیّت کی ہمنوائی سے اور آغازِ سفر میں چند قدم اُس کا ساتھ دینے سے پُورا نہیں ہو سکے گا۔ ہمارے بعض دوست اس طرح کی باتیں بالفعل سوچ رہے ہیں مگر اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے اوّل قدم ہی پر اپنی شکست کا اعلان کر دیا۔

بے شک رائج الوقت اجتماعی تصوّرات اور فروغ پذیر معاشرتی روایات کا دباؤ نہایت شدید اور کمر شکن ہے، بالخصوص عورت کے معاملے میں یہ دباؤ اور بھی زیادہ ہے۔ بے چاری مسلمان عورت اس جاہلیّت کے طوفان میں

بڑے سنگدلانہ دباؤ اور بھیانک مخالفت سے دوچار ہے۔ لیکن امرِ محتوم سے کوئی مفر نہیں ہے۔ لازماً ہمیں پہلے ثابت قدمی اور جگرداری کا ثبوت دینا ہوگا اور پھر حالات پر غلبہ حاصل کرنا ہوگا۔ اسی طرح ہمیں جاہلیت کے اُس گہرے کھڈ کے حدودِ اربعہ کا مشاہدہ بھی کرانا ہوگا جس میں وہ اب گِری پڑی ہے اور مقابلۃً دنیا کو اُس اسلامی زندگی کے وہ نور افگن اور بلند و بالا افق دکھانے ہوں گے جس کے ہم داعی ہیں۔

اتنا عظیم کام یوں نہیں سرانجام پا سکتا کہ ہم چند قدم جاہلیّت کے دوش بدوش چلیں اور نہ اس طرح سے انجام پا سکتا ہے کہ ہم ابھی سے جاہلیّت کا یکسر مقاطعہ کر دیں اور اس سے الگ تھلگ ہو کر گوشۂ عزلت میں جا بیٹھیں۔ یہ دونوں فیصلے غلط ہیں۔ ہم جاہلیّت کے ساتھ ہم آمیز تو ہوں مگر اپنا تشخّص باقی رکھ کر، جاہلیّت کے ساتھ لین دین کریں مگر دامن بچا کر، حق کا واشگاف اعلان کریں مگر سوز و محبّت کے ساتھ، ایمان و عقیدہ کے بل پر اُونچے رہیں مگر انکساری اور تواضع کے جلو میں، اور آخر میں یہ حقیقت نفس الامری ہمارے قلب و ذہن پر پوری طرح ثبت ہونی چاہیئے کہ: ہم جاہلی فضا میں زندگی بسر کر رہے ہیں، اس جاہلیّت کے مقابلے میں ہماری راہ زیادہ راست اور سیدھی ہے، ہمارا مشن ایک دُوررس تبدیلی برپا کرنا ہے، یعنی انسانیّت کو جاہلیّت کی تاریکیوں سے نکل کر اسلام کی روشنی میں داخل کرنا ہے۔ جاہلیّت اور اسلام کے مابین ایک وسیع و عریض وادی ہے جس پر کوئی پُل اس غرض کے لیے کھڑا نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں بین بین آ کر مل سکیں، بلکہ ایسا پُل اگر قائم کیا جا

سکتا ہے تو صرف اس غرض کے لیے کہ اہلِ جاہلیت اُسے عبور کر کے آغوش اسلام میں آ پناہ لیں خواہ وہ مبینہ اسلامی وطن کے رہنے والے مدّعیانِ اسلام ہوں یا اس کے باہر کے لوگ ہوں۔ تاکہ وہ اندھیروں سے نکل کر اُجالے میں آئیں، اور اُس زبُوں حالی سے نجات پائیں جس میں سرتاپا غرق ہیں اور اُس "خیر" سے مستفید ہو سکیں جس سے وہ گروہ شاد کام ہو چکا ہے جس نے اسلام کو پہچان لیا ہے اور جو اسلام ہی کے سائے میں جینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اگر کسی کو یہ دعوت پسند نہیں ہے تو ہمیں اُس سے وہی کہ دینا چاہیے جس کا حکم اللہ نے اپنے رسول کو دیا تھا: لکم دینکم ولی دین (تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین) سورۃ الکافرون۔

بابِ یازدہم

ایمان کی حکمرانی

ارشاد باری ہے :

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ (آل عمران : ۱۳۹)

دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔

ایمان باللہ کا ہمہ گیر استیلاء

اس آیت سے بظاہر جو مفہوم متبادر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں اللہ کی طرف سے جو ہدایت دی گئی ہے اُس کا تعلق صرف اس جہاد سے ہے جس میں قتال ہوتا ہے۔ لیکن اس ہدایت کی اصل رُوح اور اس کا دائرہ اپنے پورے

پس منظر اور محرکات و اسباب کی، وسے قتال کی مخصوص حالت سے کہیں زیادہ وسیع اور جامع ہے - یہ ہدایت دراصل اُس دائمی کیفیت کا نقشہ پیش کرتی ہے جو ہر آن مومن کے احساسات و اعصاب پر، مومن کے ذہن و فکر پر اور اشیاء و اشخاص اور واقعات و اقدار کے بارے میں مومن کے نقطۂ نظر پر حاوی رہنی چاہیئے - بالفاظ دیگر یہ ہدایت نفسیاتی تفوق و استیلاء کی اُس حالت کی نشان دہی کرتی ہے جس پر مومن کو ہمیشہ قائم رہنا چاہیئے، خواہ کیسی ہی دعوت اور کیسے ہی حالات سے اُس کا مقابلہ ہو، کیسے ہی لوگ اُس کی راہ میں حائل ہوں اور کیسی ہی اقدار اور پیمانوں کے خلاف وہ نبرد آزما ہو -

ایمان کی یہ بلندی اور بالاتری اُن تمام اقدار کے بارے میں ظاہر ہونی چاہیئے جو چشمۂ ایمان کے سوا کسی اور ماخذ و منبع سے ماخوذ ہوں، دُنیا کی اُن طاقتوں کے بارے میں بھی جو شاہراہِ ایمان سے منحرف ہیں اور اُن دنیاوی پیمانوں کے بارے میں بھی جو شجرِ ایمان سے نہیں پھُوٹے، اسی طرح اُس کا اظہار دنیا کی ان روایات کے بارے میں بھی ہونا چاہیئے جو ایمان کے رنگ میں نہیں رنگی گئی ہیں اور دنیا کے ان قوانین و ضوابط کے بارے میں بھی جن کی ساخت ایمان کے ہاتھوں نہیں ہوئی ہے - ایمان کی یہ کیفیت ان تمام نظامہائے حیات کے بارے میں بھی نمایاں ہونی چاہیئے جن کا خمیر بصیرتِ ایمانی نے تیار نہیں کیا ہے - اس کا عکس مادی کمزوری، عددی قلت اور ناداری میں بھی نظر آنا چاہیئے اور مادی طاقت، عددی کثرت اور خوش حالی کی حالت

میں بھی۔ ایمان کی طاقت بڑی سے بڑی سرکش اور منحرف طاقت سے بھی مات نہیں کھاتی، اور نہ کسی معاشرتی روایت اور باطل قانون کے آگے گھٹنے ٹیکنا جانتی ہے، یہ کسی ایسے نظام کے آگے سرِ تسلیم خم بھی نہیں کر سکتی، جو چاہے لوگوں میں کتنا ہی ہر دل عزیز ہو مگر نورِ ایمان سے محروم ہو۔ جہاد کے دوران ثابت قدمی اور پامردی اور صف شکنی کا مظاہرہ ایمانی قوّت کے ان مختلف مظاہر میں سے صرف ایک کیفیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ کے اندر بیان فرمائی ہیں۔

ایمان کی بدولت پیدا ہونے والی طاقت اور قدرت محض ایک وقتی عزم اور ارادہ کا نتیجہ نہیں ہوتی، نہ یہ کسی عارضی جذبہ کے تحت بھڑک اُٹھنے والی نخوت و حمیت کا کرشمہ ہے، اور نہ کسی ہنگامی جذبے کا کمال ہے، بلکہ یہ طاقت و تفوق ایک ابدی کیفیّت ہے اور اس غیر متزلزل اور دائمی حق پر مبنی ہے جو کائنات کی فطرت کے رگ و پے میں سمایا ہوا ہے۔ اور جو طاقت کی منطق، ماحول کے تصوّر، معاشرے کی اصطلاح اور انسانی عرف سے زیادہ پائیدار اور طاقت ور ہے کیونکہ وہ اُس زندہ خدا سے مربوط ہے جسے فنا نہیں ہے۔

ایمانی قوّت کے اثرات

معاشرے پر کچھ افکار و نظریات کی حکمرانی ہوتی ہے، کچھ ہمہ گیر روایات کا چلن ہوتا ہے، جن کی پُشت پر اُس کا سخت گیرانہ دباؤ اور مضبوط معاشرتی زنجیریں ہوتی ہیں۔ یہ حالات اُس شخص کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں

جسے کسی طاقت ور ہستی کی پناہ نہ حاصل ہو اور جو بغیر کسی مضبوط سہارے کے معاشرے کو چیلنج کرتا ہے۔ غالب افکار اور نظریات کے اپنے مخصوص اثرات اور تقاضے ہوتے ہیں جن سے اُس وقت تک چھٹکارا پانا دشوار ہوتا ہے جب تک کسی ایسی اعلیٰ و ارفع حقیقت سے انسان کا رشتہ استوار نہ ہو جائے جس کی پناہ میں آجانے کے بعد یہ تمام افکار و نظریات اسے پرِ کاہ نظر آنے لگیں، اور جب تک کسی ایسے ذریعہ سے طاقت (Energy) حاصل نہ کی جائے جو ان افکار و نظریات کے ماخذ سے بالادست، باثر اور زیادہ قوی و قادر ہو۔ جو شخص معاشرے کے عام بہاؤ کے مخالف رُخ پر کھڑا ہو جاتا ہے، معاشرے کی حکمران منطق کو چیلنج کرتا ہے، معاشرے کے عرفِ عام، اُس کے مروجہ قوانین و اقدار اور افکار و نظریات اور اُس کی گمراہیوں اور کجرویوں کے خلاف نبرد آزما ہوتا ہے، وہ جب تک کسی ایسی ہستی کا سہارا نہیں لے گا جو انسانوں سے زیادہ قوی، پہاڑ سے زیادہ اٹل اور زندگی سے زیادہ عزیز ہو تو اُسے نہ صرف اپنی ناتوانی کا شدید احساس ہوگا بلکہ اس بھری پُری دنیا میں وہ اپنے آپ کو بالکل اجنبی اور بیکس بھی پائے گا ——— اس لیے اللہ تعالیٰ کی شفیق و رحیم ذات مومن کو اس طرح میدان میں نہیں اُتار دیتی کہ وہ یکہ و تنہا معاشرے کا دباؤ سہتا رہے، اُس کے بوجھ تلے کراہتا رہے، رنج و ملال اور بے کسی و بے بسی میں گھرا رہے بلکہ اُس کی طرف سے مومن کو یہ پیغام جانفزا پہنچتا ہے کہ: "وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ۔" یہ تعلیم اور ہدایت اُس کی دل شکستگی اور رنج دونوں کا

مداوا بن کر آتی ہے۔ یہ دونوں وہ احساسات ہیں جو نامساعد حالات میں انسان پر بالعموم طاری ہو جاتے ہیں۔ لیکن مردِ مومن ان دونوں احساسات کو مجرد صبر و ثبات سے نہیں بلکہ ایک جذبۂ برتری اور نگاہ بلند سے دبا دیتا ہے۔ وہ ایک ایسے مقامِ بلند پر متمکن ہوتا ہے جہاں سے اُسے طاغوتی طاقتیں، غالب اقدار، فروغ یافتہ افکار، دنیاوی دساتیر و قوانین اور رچی بسی عادات و رسوم اور گمراہی پر جمع ہونے والے عوام پست نظر آتے ہیں۔

مومن ہی غالب و برتر ہے، اپنے سہارے کے لحاظ سے بھی اور ماخذ کے نقطۂ نظر سے بھی۔ اس کے نزدیک ملک و سلطنت کوئی وقعت رکھتے ہیں، نہ بڑی بڑی شخصیتیں کوئی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ مقبولِ عام اقدار و معیارات جنہیں ملک کے اندر عروج حاصل ہے اُس کی نگاہ میں ہیچ ہیں، عوام میں مقبول و مروّج نظریے اور خیالات اُسے خیرہ نہیں کر سکتے ——— اس لحاظ سے وہ اعلیٰ ترین ہستی ہے، وہ ہمیشہ خدا کے سرمدی چشمہ سے اکتسابِ ہدایت کرتا ہے، وہ ہر معاملے میں خدا کی طرف لپکتا ہے، اور ہر دم اُس کی بتائی ہوئی راہ پر گامزن رہتا ہے۔

اِسلامی عقیدہ کی افضلیّت و جامعیّت

کائنات کی معرفت و ادراک میں بھی مومن دوسروں سے اُونچا اور فائق ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ایمان باللہ اور نظریۂ توحید ——— اپنی اُس صورت میں جس میں اسلام اُنہیں پیش کرتا ہے کائنات کی عظیم حقیقت کی معرفت حاصل کرنے کی شاہ کلید ہے۔ چنانچہ نظریۂ توحید کائنات کی جو تصویر پیش کرتا ہے وہ

اس قدر درخشاں، اُجلی، حسین اور متناسب ہے کہ جب ہم اُس کا موازنہ اُن تصوّرات وعقائد کے انباروں سے کرتے ہیں جو کائنات کے بارے میں ماضی و حال کے مرعوب کُن نظریات سے عبارت ہیں یا جو مشرکانہ مذاہب اور محرّف آسمانی ادیان کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں، یا جنہیں مکروہ مادّہ پرستانہ تحریکوں نے جنم دیا ہے تو اسلامی عقیدہ کی عظمت و رفعت بالکل نکھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ چنانچہ جو لوگ کائنات کے بارے میں اس طرز کی معرفت کے حامل ہیں، لاریب وہ کائنات کی ساری مخلوقات سے اعلیٰ و افضل اور بالا و برتر ہونے ہی چاہئیں۔[1]

مومن اپنے اُس تصوّر میں بھی دوسروں سے اُونچا اور فائق ہوتا ہے جو زندگی کی ان قدروں اور پیمانوں کے بارے میں وہ رکھتا ہے جن سے حیاتِ انسانی، اس کے احوال و وقائع اور اشیاء و اشخاص کی قیمت اور حیثیت متعین کی جاتی ہے۔ جو عقیدہ خداشناسی (ان خدائی صفات کی روشنی میں جو اسلام بیان کرتا ہے) کی اساس پر قائم ہو اور اقدار و معیارات کے اُن حقائق سے آگاہی کے نتیجے میں ظاہر ہو جو زمین کے اس چھوٹے سے کرّہ تک ہی محدود نہیں بلکہ پُوری کائنات کو محیط ہیں ایسا عقیدہ فطرتاً مومن کو قدروں اور پیمانوں کا ایک ایسا تصوّر عطا کرتا ہے جو ان ناقص اور غیر متوازن پیمانوں سے کہیں زیادہ اعلیٰ، پاکیزہ اور ٹھوس ہوتا ہے جو عام انسانوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں اور جن کا

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "خصائص التصور الاسلامی ومقوماتہ"۔ باب "بینہ ورکام"۔

علم انتہائی محدود ہوتا ہے، اور جو ایک ہی نسل میں کتنی بار اپنے پیمانے بدلتے ہیں، بلکہ ایک ہی قوم کے اندر بار بار بدلتے رہتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی فرد کے بارے میں ان کے پیمانے صبح کچھ ہوتے ہیں اور شام کچھ اور۔

مومن اپنے احساس وضمیر اور اخلاق ومعاملات میں بھی نہایت راستبازانہ اور انتہائی بلندیوں پر فائز ہوتا ہے۔ وہ جس خدا پر ایمان رکھتا ہے وہ اسماءِ حسنیٰ اور بہترین صفات سے متصف ہے۔ یہ عقیدہ بذاتِ خود مومن کے اندر عظمت و رفعت، پاکیزگی وطہارت، اور عفت وتقویٰ کا احساس اُبھارتا ہے، اور عملِ صالح اور خلافتِ الٰہی کا صحیح مفہوم اس کے ذہن نشین کرتا ہے۔ مزید برآں یہ عقیدہ مومن کو یہ یقینِ محکم بھی عطا کرتا ہے کہ آخرت ہی اصل دار الجزاء ہے۔ اور وہاں نیک اعمال اور پاکیزہ زندگی کا جو اجر ملے گا اُس کے مقابلے میں دُنیا کی تکالیف وآلام ہیچ ہیں۔ یہ چیز مومن کے ضمیر میں اطمینان وسکون کی ایک ایسی بہار پیدا کیے رکھتی ہے کہ اگر وہ عمر بھر دنیاوی مال ومتاع سے کلیتہً محروم رہے، تو بھی اُسے کوئی شکایت نہیں ہوتی۔

مومن اپنے قانون اور نظامِ زندگی کی رُو سے بھی اعلیٰ وافضل ہے۔ انسان نے عہدِ قدیم سے لے کر آج تک جو شریعتیں اور جتنے نظامہائے زندگی وضع کیے ہیں مومن جب اُن کا جائزہ لیتا ہے اور اپنی شریعت اور اپنے نظامِ زندگی سے ان کا موازنہ کرتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں برس کی یہ انسانی کاوشیں اسلام کی محکم شریعت اور جامع نظام کے سامنے بچّوں کے کھیل اور اندھوں کے ٹامک ٹوئیے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ چنانچہ

وہ اپنے اس مقامِ بلند پر کھڑا ہو کر جب بھٹکی ہوئی انسانیت کی بے چارگی اور شقاوت پر محبت آمیز اور درد بھری نگاہ ڈالتا ہے، تو اس کو سوائے اس بات کے کوئی اور چارہ نظر نہیں آتا کہ انسان کی سوختہ نصیبی اور گمراہی پر قابو پانے کے لیے اسے کچھ کرنا چاہیئے۔

جاہلی نقطۂ نظر اور مومنانہ نقطۂ نظر

یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو صدرِ اوّل کے مسلمانوں نے جاہلیت کے ان تمام کھو کھلے مظاہر اور طاقتوں اور اُن قوانین و روایات کے مقابلے میں اختیار کیا تھا جنہوں نے دورِ جاہلیت میں انسانوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ جاہلیت تاریخ کے کسی مخصوص دَور کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاص حالت کا نام ہے۔ اور ماضی اور حال میں جب کبھی انسانی سوسائٹی اسلام کی راہ راست سے منحرف ہوتی ہے جاہلیت کی یہ حالت عود کر آتی ہے۔ اور آئندہ جب بھی انسانیت راہ راست سے منحرف ہو گی، یہی حالت پیش آئے گی۔

جنگ قادسیہ میں ایرانی سپاہ کے نامور قائد رستم کے کیمپ میں جب حضرت مغیرہ بن شعبہ گئے اور انہوں نے وہاں جاہلیت کے رنگ ڈھنگ اور جلال و شکوہ کو دیکھا، اور اُس کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا ابو عثمان نہدی نے اُسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"جب مغیرہ بن شعبہ دریا کے پُل کو پار کر کے ایرانی فوج میں پہنچ گئے تو ایرانی سپاہیوں نے مغیرہ کو پاس بٹھا لیا۔ اور رستم سے ان کی ملاقات کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے اپنی شکست کو چھپانے کے لیے اپنی زیب و

زینت میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ مغیرہ آگے بڑھے۔ سب لوگوں نے اپنی مخصوص وردیاں پہن رکھی تھیں۔ سروں پر تاج تھے۔ سونے کے تاروں سے بُنا ہوا لباس زیب بدن تھا۔ غالیچے چار چار سو قدم کے فاصلے تک بچھے ہوئے تھے۔ چار سو قدم غالیچوں تک چلنے کے بعد رستم تک پہنچا جا سکتا تھا۔ مغیرہ خیمے میں داخل ہوئے۔ ان کے بال چار حصوں میں گُندھے ہوتے تھے۔ اندر پہنچتے ہی وہ رستم کے تخت پر چڑھ کر اُس کی مسند پر بیٹھ گئے۔ درباری یہ دیکھ کر فوراً مغیرہ پر جھپٹے اور انہیں نیچے گرا دیا۔ مغیرہ نے کہا: ہم تک تمہاری دانشمندی کی خبریں پہنچا کرتی تھیں مگر تم میں سے زیادہ کوئی بیوقوف نہیں ہوگا۔ ہم عربوں میں یہ اُونچ نیچ نہیں ہے۔ ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو اپنا غلام نہیں بناتا اِلّا یہ کہ وہ جنگ پر اُتر آئے اور گرفتار ہو جائے۔ میرا گمان تھا کہ تم بھی اپنی قوم کی اُسی طرح مواسات کرتے ہوگے جس طرح ہم کرتے ہیں۔ تم نے جو حرکت اب کی ہے اس سے بہتر تو یہی تھا کہ تم مجھے پہلے ہی یہ اطلاع کر دیتے کہ تم میں سے کچھ لوگ تمہارے لیے رب کا مقام رکھتے ہیں۔ اور تمہارا نظام گڑبڑ ہے۔ میں تمہارے پاس خود سے نہیں آیا ہوں، بلکہ تمہارے بُلانے پر آیا ہوں۔ یہاں آکر آج مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا نظام اضمحلال کا شکار ہے۔ اور تم شکست کھا کر رہنے والے ہو۔ بے شک ایسے سلوک اور اس طرح کی ذہنیتوں کے بل پر بادشاہت قائم نہیں رہا کرتی۔"

ربعی بن عامر نے بھی جنگ قادسیہ سے پہلے رستم اور اس کے درباریوں کے سامنے اس جرأت ایمانی اور بلند نگاہی کا رویّہ اختیار کیا تھا (ابن کثیر نے البدایہ

والنہایہ میں بیان کیا ہے) :

"حضرت سعد بن ابی وقاص نے رستم کے پاس جو کہ ایرانی افواج کا سپہ سالار تھا ربعی بن عامر کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ ربعی بن عامر پہنچے تو دربار فرش فروش سے آراستہ تھا۔ رستم یاقوت اور بیش بہا موتی زیب بدن کیے، بیش قیمت لباس پہنے، تاج سر پر رکھے سونے کے تخت پر بیٹھا تھا۔ ربعی بن عامر پھٹے پُرانے لباس میں پہنچے، مختصر سی ڈھال، چھوٹا سا گھوڑا یہ ان کی حیثیت تھی، وہ گھوڑے پر سوار فرش کو روندتے ہوئے بڑھتے چلے گئے اور پھر گھوڑے سے اُترے، قیمتی گاؤ تکیہ سے گھوڑے کو باندھ دیا، اور خود رستم کے پاس جانے لگے، آلات حرب ساتھ، سر پر خود اور جسم پر زرہ تھی۔ لوگ بولے جنگی لباس تو اُتار دو۔ کہنے لگے مَیں خود سے نہیں آیا ہوں، مجھے بُلایا گیا ہے، اگر تم کو منظور نہیں تو ابھی واپس جاتا ہوں۔ رستم نے کہا: آنے دو، وہ اِسی فرش پر نیزہ ٹیکتے ہوئے بڑھے۔ نیزے کی نوک نے فرش کو جا بجا کاٹ دیا۔ لوگ بولے تمہارا کیسے آنا ہوا۔ بولے: ہم کو اللہ نے اِسی لیے بھیجا ہے کہ جس کی مرضی ہو اس کو بندوں کی بندگی سے نجات دلا کر اللہ کی بندگی میں داخل کر دیں اور دُنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں پہنچا دیں اور مذاہب کی زیادتیوں سے چھٹکارا دلا کر اسلام کے عدل کے سایہ تلے لے آئیں۔"

اس کے بعد ایک انقلاب آتا ہے، اور مسلمان کا نقطۂ نگاہ مغلوبانہ اور مادّی طاقت سے تہی شخص کا ہو جاتا ہے۔ مگر احساس برتری سے وہ محروم

نہیں ہوتا۔ اور اگر اُس کے دل میں شمعِ ایمان اب بھی روشن ہے تو وہ غالب اقوام کو اپنے سے فروتر ہی دیکھے گا، اور اسے پختہ یقین ہو گا کہ مادّی محکومی ایک عارضی مرحلہ ہے جو آج نہیں تو کل ختم ہو جائے گا، ایمان کا لشکر بالآخر پانسہ پلٹ کر رکھ دے گا اور اُسے لازماً فتح حاصل ہو گی۔ اور بالفرض اگر یہ مرحلہ جان لیوا ثابت بھی ہو تو اپنی کمزوری کے باوجود مومن اس کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے گا۔ وہ اس یقین سے سرشار ہوتا ہے کہ دوسرے انسان تو معمول کی موت مرتے ہیں، مگر اُسے شہادت کی موت نصیب ہو گی، وہ اس دنیا سے کُوچ کرے گا تو سیدھا اپنے رب کی جنّت میں داخل ہو گا۔ جو لوگ آج اس پر غالب و قاہر ہیں وہ جب دنیا سے رُخصت ہوں گے تو عبرت ناک جہنّم اُن کا ٹھکانا ہو گا۔ دونوں کے اس انجام میں زمین و آسمان کا بُعد ہے۔ انہی احساسات میں وہ مستغرق ہوتا ہے کہ اُسے اپنے ربِّ کریم کا یہ فرمان سُنائی دیتا ہے:

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ۝
مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝
لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ
عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ۝

(آلِ عمران: ۱۹۶ تا ۱۹۸)

ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف

ہے، پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ کی طرف سے یہ سامانِ ضیافت ہے ان کے لیے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کے لیے وہی سب سے بہتر ہے۔

نگاہ بلند و سخن دِلنواز

معاشرے پر ایسے عقائد و افکار اور اقدار و اصول کو غلبہ ہوتا ہے جو مومن کے عقیدہ و فکر اور پیمانہ و میزان کے منافی بلکہ شدید مخالف ہوتے ہیں۔ مگر یہ احساس اس سے کبھی جُدا نہیں ہوتا کہ وہ اعلیٰ اور ارفع مقام پر متمکن ہے اور یہ تمام دنیا پرست اور عیش کوش لوگ اس سے کہیں زیادہ فروتر مقام پر ہیں۔ وہ اپنے بلند مقام سے ان لوگوں پر جب نگاہ دوڑاتا ہے تو ایک طرف وہ اپنی حد تک عزّتِ نفس اور خودداری اور خودپسندی سے مملو ہوتا ہے اور دوسری طرف ان کے بارے میں اُس کا دل ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات سے لبریز ہوتا ہے۔ اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ ہدایت کی جو روشنی اسے اللہ نے ارزاں فرمائی ہے انہیں بھی نصیب ہو اور جس اُفقِ بلند پر وہ خود محوِ پرواز ہے اُن کو بھی وہاں تک اُٹھا لائے۔

باطل ایک ہنگامۂ محشر برپا کرتا ہے، ہاؤ ہو کا غلغلہ بلند کرتا ہے، گرجتا اور دھاڑتا ہے۔ سینہ تانتا اور مُوچھوں کو تاؤ دیتا ہے، اُس کے

چاروں طرف (تملق پیشہ اور خوشامدیوں کی طرف سے) ایسا مصنوعی ہالہ قائم کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے انسانوں کی بصارت اور بصیرت دونوں پر پردہ پڑ جاتا ہے اور وہ یہ دیکھ ہی نہیں پاتیں کہ اس خیرہ کُن ہالہ کے پیچھے کیا گھناؤنی رُوح اور قبیح تصویر مستور ہے اور کیسی منحوس اور تاریک "صبح" پنہاں ہے !! ۔ مومن اپنے مقام بلند سے باطل اور اس کی ہنگامہ آرائیوں کو دیکھتا ہے ۔ فریب خوردہ انسانی جماعتوں پر نظر ڈالتا ہے ، مگر وہ کسی احساسِ ضعف کا شکار نہیں ہوتا اور نہ اُسے کوئی رنج و غم لاحق ہوتا ہے ، اور نہ حق پر اس کی ثابت قدمی میں کوئی کمی ، اور راہِ مستقیم پر اس کی استقامت میں کوئی تزلزل پیدا ہوتا ہے ۔ بلکہ گُم گشتگانِ راہ اور فریب خوردہ انسانوں کی ہدایت کے لیے اُس میں جو تڑپ اور بے تابی پائی جاتی ہے اس میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

معاشرہ پست اور ذلیل خواہشوں میں ڈوبا ہوتا ہے ، سفلی جذبات کی رَو میں بہ رہا ہوتا ہے ، گندگی اور کیچڑ سے آلودہ ہوتا ہے ، اس خیالِ خام میں مگن ہوتا ہے کہ وہ لذائذِ زندگی سے محظوظ ہو رہا ہے اور بندھنوں سے آزاد ہو رہا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ معاشرے کے اندر پاکیزہ تفریح اور لقمۂ حلال کمیاب بلکہ نایاب ہو جاتا ہے ۔ گندگی کے جوہڑوں کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہتی ، جدھر دیکھو غلاظت اور فضلات کے ندی نالے بہ رہے ہوتے ہیں ۔ مومن کیچڑ کے اندر غرق ہونے والوں اور غلاظت سے چمٹے ہوئے انسانوں کو اُوپر سے جھانکتا ہے اور بایں ہمہ کہ وہ اس پورے ماحول میں یکہ و تنہا ہوتا ہے اُس کے حوصلوں میں کوئی احساسِ شکست اور اس کے قلب و جگر میں کوئی غم

جاگزین نہیں ہوتا۔ اور اُس کے نفس میں کبھی یہ اکساہٹ پیدا نہیں ہوتی کہ اپنا پاکیزہ و بے داغ لباس اُتار کر وہ بھی ننگوں کے اس حمام میں ننگا ہو جائے اور اس متعفّن تالاب میں غوطے لگانے لگے۔ مومن جس نشۂ ایمان اور لذت یقین سے سرشار ہوتا ہے اُس کی بدولت وہ اپنے آپ کو بہت اعلیٰ وارفع مقام پر محسوس کرتا ہے۔

ایک ایسے معاشرے کے اندر جو دین سے باغی ہو، مکارم و فضائل سے عاری، اور اعلیٰ و برتر قدروں سے خالی اور شریفانہ مہذّب تقریبات سے ناآشنا ہو۔ الغرض ہر اُس پہلو سے بے گانہ ہو چکا ہو جو پاکیزگی و حُسن اور طہارت و نفاست کی تعریف میں آسکتا ہے۔ ایسے معاشرے کے اندر مومن اپنے دین کا دامن اُسی طرح تھامے رکھتا ہے جس طرح کوئی شخص آگ کا انگارہ مُٹھّی میں لیے ہوئے رہے دوسرے لوگ تو وہ اس کی اس جرأت مندی پر پھبتیاں کستے ہیں، اس کے افکار کا تمسخر اُڑاتے ہیں، اس کی محبوب اقدار کو نشانہ استہزا بناتے ہیں۔ مگر مومن ہے کہ یہ سب کچھ سُنتا ہے، اور سہتا ہے مگر دون ہمّتی اور کم حوصلگی کا شکار نہیں ہوتا، وہ احساس برتری کے ساتھ ان چھچھوروں پر نظر ڈالتا ہے اور اُس کی زبان پر وہی کلمات جاری ہو جاتے ہیں جو اس برگزیدہ گروہ کے ایک فرد حضرت نوح علیہ السّلام کی زبان پر ——— جاری ہوئے تھے جو تاریخ کی پُرخار اور طویل وادیوں میں ایمان و عشق کے نورانی اور غیر منقطع کارواں کے ہمراہ گزر چکے ہیں۔ آنجناب نے تمسخر اُڑانے والوں سے فرمایا تھا:

اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ۔

(ھود: ۳۸)

آج اگر تم ہماری ہنسی اُڑاتے ہو تو ہم بھی تمہاری ہنسی اُڑائیں گے جس طرح تم ہنسی اُڑا رہے ہو۔

مومن کو اس نورانی کارواں اور اس کے بالمقابل بدقسمت وسوختہ نصیب قافلہ دونوں کے انجام کا نقشہ اللہ تعالیٰ کے اس بیان میں نظر آجاتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ۝ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ۝ وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ ۝ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ۝ وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ ۝ فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ۝ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ ۝ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ۔

(المطففین: ۲۹ تا ۳۶)

بے شک مجرم (دنیا میں) ایمان والوں کے ساتھ ہنسی کیا کرتے تھے۔ اور جب اُن کے پاس سے ہو کر گزرتے تو ان سے آنکھیں مارتے۔ اور جب اپنے اہل کی طرف لوٹ کر جاتے تو (مسلمانوں کے تذکروں کا) مشغلہ بناتے۔ اور جب مسلمانوں کو دیکھتے تو بول اُٹھتے کہ بے شک یہ لوگ گمراہ ہیں۔ حالانکہ انہیں (مسلمانوں پر) داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ آج (آخرت میں) مسلمان کافروں پر ہنسیں گے اور تختوں پر بیٹھے نظارے کر رہے ہوں گے۔ کیا

کافروں نے اب کیے کا بدلہ پا لیا؟

اس سے بھی پہلے قرآن کریم نے ہمارے سامنے کافروں کا یہ قول نقل کیا ہے جو وہ اہلِ ایمان سے کہا کرتے تھے:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ۝ (مریم: ۷۳)

ان لوگوں کو جب ہماری کھلی کھلی آیات سنائی جاتی ہیں تو انکار کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں: بتاؤ ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالت میں ہے اور کس کی مجلسیں زیادہ شاندار ہیں۔

یعنی دونوں فریقوں میں سے کون سا فریق اچھا ہے؟ وہ مکھیا اور سردار اور مالدار لوگ جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان نہیں لاتے یا وہ نادار اور بے کس لوگ جو آنجناب کے گرد جمع ہیں؟ نضر بن حارث، عمرو بن ہشام، ولید بن مغیرہ اور ابو سفیان بن حرب جیسے اکابر قوم یا بلال، عمّار، صہیب اور خبّاب جیسے بے سہارا افراد؟ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت کوئی بھلی دعوت ہوتی تو کیا آپؐ کے پیروکار ایسے ہی بدحال لوگ ہوتے جنہیں قریش کے اندر کوئی دبدبہ اور وقار حاصل نہیں؟ آپس میں مل بیٹھنے کے لیے ایک معمولی سے مکان (دار ارقم) کے سوا انہیں اور کوئی جگہ بھی میسّر نہیں، جب کہ اُن کے مخالفین ایک عظیم الشّان اور پُرشکوہ چوپال کے مالک ہیں۔ جاہ و جلال ان کے

قدم چومتا ہے، قوم کی ناخدائی ان کو حاصل ہے ـــــــــ یہ ہے دُنیا پرستوں کا نقطۂ نگاہ اور ان لوگوں کا طرزِ فکر جن کی نگاہوں پر ہر زمانے اور ہر جگہ میں پردے پڑے رہے اور بلندیوں کو نہ دیکھ سکے۔ یہ حکمت الٰہی کا فیصلہ ہے کہ عقیدہ و ایمان دنیاوی زیب وزینت اور ظاہری میناکاری اور سجاوٹ سے محروم اور اسباب تحریص و ترغیب سے پاک رہے گا۔ اسے قبول کرنے کا محرّک کسی حاکم کا تقرّب، کسی جاہ و اقتدار کی حرص، کوئی مرغوب نعرہ اور کسی خواہش کی تسکین نہ ہوگی، بلکہ جہد و مشقّت، جانکاہی و جہاد اور سر دھڑ کی بازی لگا دینے کا جذبہ اس کا اصل محرّک ہوگا۔ تاکہ جو اس کوچہ میں آتے وہ اس یقین کے ساتھ آئے کہ وہ اس نظریئے کو بحیثیت عقیدہ قبول کر رہا ہے، وہ اس کو کسی انسان کی خوشنودی کے لیے نہیں بلکہ خالصۃً اللہ کی رضا جوئی کے لیے قبول کرے اور ان تمام لالچوں اور داعیات سے بری ہو جن پر عام انسان فریفتہ ہوتے ہیں۔ تاکہ اس عقیدہ کو کوئی ایسا شخص اپنانے کی جرأت ہی نہ کر سکے جو دنیاوی منفعتوں کا طالب ہو، بندۂ حرص و آز ہو، جاہ و حشمت اور ٹھاٹھ باٹھ کا پجاری ہو، اور جس کے نزدیک انسانی تصوّرات اللہ کی مرضی اور خوشنودی کے مقابلے میں زیادہ وقیع ہوں، خواہ اللہ کے نزدیک وہ قطعاً بے وقعت ہوں۔

مومن کی شان

مومن اپنی اقدار و نظریات اور اپنے پیمانے اور باٹ انسانوں سے نہیں لیتا کہ اُسے انسانوں کے اندازوں کے پیچھے پیچھے چلنے کی حاجت محسوس

ہو۔ بلکہ وہ انسانوں کے ربّ سے لیتا ہے اور وہی اُس کے لیے کافی ووافی ہوتا ہے ـــــــ وہ مخلوق کی مرضی اور خواہشات کو بھی اپنے لیے معیار نہیں بناتا کہ اُسے مخلوق کی خواہشات کے ساتھ ساتھ لڑھکتے رہنے کی ضرورت ہو، بلکہ اس کا ماخذ وہ میزان حق ہوتی ہے جس میں کوئی تغیّر نہیں ہوتا اور جو کبھی اِدھر اُدھر ڈانواں ڈول نہیں ہوتی۔ وہ ان سب چیزوں کو اس محدود وفانی دُنیا سے نہیں لیتا بلکہ یہ ان ابدی چشموں سے اُبل کر اس کے ضمیر کو منوّر کرتی ہیں جہاں سے ساری کائنات کو خلعت وجود ملا ہے۔ تو پھر وہ اپنے اندر کوئی کمزوری اور اپنے دل میں کوئی حزن وملال کیوں کر محسوس کر سکتا ہے جب کہ اس کا سررشتہ پروردگارِ عالم سے، میزانِ حق سے اور سرچشمۂ کائنات سے استوار اور وابستہ ہے؟

وہ حق پر ہے۔ حق کو چھوڑنے کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا اس کے ہاتھ لگ سکتا ہے؛ ضلال کے پاس اگر جاہ واقتدار اور دبدبہ وطنطنہ ہے، اگر طبلچی اور ڈھنڈورچی اور عوام کے غول اس کے جِلو میں ہیں، تو ہوا کریں ان سے حق میں رائی بھر بھی تغیّر واقع نہیں ہو سکتا۔ مومن حق پر ہے، حق کو چھوڑ کر سوائے ضلال کے کچھ نہیں مِل سکتا۔ پس مومن اگر کھرا مومن ہے تو وہ ہرگز حق کے بجائے باطل کا انتخاب نہیں کر سکتا۔ اور حق کے عوض ضلال کا سودا نہیں کر سکتا۔ حالات چاہے کچھ ہوں، مومن سے یہ توقع کہ وہ حق کے بجائے باطل کا انتخاب کرے گا، عبث ہے:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا

مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ (آلِ عمران: ۸، ۹)

اے ہمارے پروردگار! جب تو ہمیں سیدھے رستہ پر لگا چکا ہے، تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مُبتلا نہ کر دیجیو۔ ہمیں اپنے خزانۂ فیض سے رحمت عطا کر کہ تُو ہی فیاضِ حقیقی ہے۔ اے پروردگار تو یقیناً سب لوگوں کو ایک روز جمع کرنے والا ہے، جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔ بے شک اللہ ہرگز اپنے وعدہ سے ٹلنے والا نہیں ہے۔

باب دوازدہم

وادیٔ پُرخار

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝
وَشَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ ۝ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝
النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝
وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝
وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ
الْحَمِيْدِ ۝ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا
الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ
عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ
جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ ذَٰلِكَ
الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ۝ إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۝
إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ ۝ وَهُوَ الْغَفُورُ
الْوَدُودُ ۝ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ۝ فَعَّالٌ لِمَا
يُرِيدُ ۝ (البروج : ۱ تا ۱۶)

قسم ہے بُرجوں والے آسمان کی۔ قسم ہے اُس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ قسم ہے گواہی دینے والے کی اور اس کی جس کے مقابلے میں گواہی دی گئی۔ کہ مارے گئے خندقوں والے، آگ کی خندقیں جن میں انہوں نے بہت سا ایندھن جھونک رکھا تھا۔ اور وہ خندقوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور اہلِ ایمان کے ساتھ جو (ظلم وستم) وہ کر رہے تھے اُس کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ اہلِ ایمان کی اس بات سے برافروختہ تھے کہ وہ اُس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور سزاوار حمد ہے۔ اور اُس کی بادشاہت ہے آسمانوں کی اور زمینوں کی، اور اللہ ہر چیز کے حال سے واقف ہے۔ بیشک جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذائیں دیں اور پھر توبہ نہ کی ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلنے کا عذاب ہے۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اُن کے لیے

باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے ۔ بے شک تیرے رب کی گرفت بڑی سخت ہے ۔ وہی ہے جو اوّل بار پیدا کرتا ہے اور وہی ہے جو (قیامت کے روز) دوبارہ پیدا کرے گا ۔ اور وہ بخشنے والا اور محبّت کرنے والا ہے ۔ عرش کا مالک ہے اور عالی شان والا ہے ۔ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے ۔

قصّہ اصحاب الاخدود کے اسباق

اصحاب الاخدود کا قصّہ ، جو سورۃ البروج میں بیان ہوا ہے ، اِس لائق ہے کہ اس پر وہ تمام اہلِ ایمان غور و تدبّر کریں جو دنیا کے کسی بھی خطّے میں اور تاریخ کے کسی بھی عہد میں دعوت الی اللہ کا کام کر رہے ہوں ۔ قرآن نے اس قصّہ کو جس طرح بیان کیا ہے ، جس انداز سے اس کی تمہید قائم کی ہے اور پھر اس پر جو تبصرے کیے ہیں اور ساتھ ساتھ جو تعلیمات اور فیصلے بیان کیے ہیں ان سب باتوں کے ذریعہ قرآن نے درحقیقت وہ بنیادی خطوط اجاگر کیے ہیں جو دعوت الی اللہ کی فطرت ، اس دعوت کے بارے میں انسانوں کے رویے اور ان امکانی حالات کی نشان دہی کرتے ہیں جو اس دعوت کی وسیع دنیا میں ——— جس کا رقبہ کرہ ارضی سے زیادہ وسیع اور جس کا عرصہ دنیاوی زندگی سے زیادہ طویل ہے ——— پیش آسکتے ہیں ۔ قرآن نے اس قصّہ میں اہلِ ایمان کے سامنے اُن کے راستے کے نمایاں نقوش بھی واضح کر دیے ہیں ، اور انہیں اس بات پر آمادہ

گیا ہے کہ وہ اس راہ میں پیش آنے والی ہر امکانی مصیبت کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کریں جو پردۂ غیب میں مستور و پنہاں، حکمتِ خداوندی کے تحت تقدیر کی طرف سے صادر ہو۔

اہلِ ایمان کی فتح

یہ ایک ایسی جماعت کا قصہ ہے جو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئی تھی اور اُس نے اپنے سچّے ایمان کا صاف صاف اظہار کرنا چاہا۔ مگر اُسے جابر اور سخت گیر دشمنوں کے ہاتھوں شدید مصائب کا نشانہ بننا پڑا جو انسان کے اس بُنیادی حق کو پامال کرنے پر تُلے ہوئے تھے جو اُسے عقیدۂ حق اختیار کرنے اور خدائے عزیز و حمید پر ایمان رکھنے کے لیے حاصل ہے۔ اور انسان کے اُس شرف کی دھجیّاں اُڑا رہے تھے جس سے اللہ نے انسان کو خاص طور پر نواز رکھا ہے تاکہ وہ دنیا میں ایک کھلونا بن کر نہ رہ جائے کہ ظالم و سنگدل حکّام اُس کو عذاب دے دے کر اُس کی آہوں اور چیخوں سے اپنا دل بہلائیں، اُسے آگ میں بھُونیں اور اپنے لیے تفریح اور لطف اندوزی کا سامان پیدا کریں۔ یہ نفوسِ قدسیہ ایمان و عقیدہ کے جس جذبہ سے سرشار تھے اُسی کی بدولت وہ اس آزمائش میں پُورے اُترے۔ اور جس امتحان میں انہیں ڈالا گیا تھا اُس میں بالآخر فانی زندگی نے عقیدہ کے ہاتھوں شکست کھائی۔ چنانچہ یہ لوگ ان جباروں اور ظالموں کی کسی دھمکی اور دباؤ سے مرعوب و متاثر نہیں ہوئے۔ آگ کے عذاب میں جل کر موت کی آغوش میں چلے گئے مگر اپنے دین سے سرمو ہٹنے کے لیے بھی تیار نہ ہوئے۔ درحقیقت یہ پاکیزہ نفوس دُنیا کی

حیات مستعار کی محبت و پرستش سے آزاد ہو چکے تھے۔ اسی لیے بہیمانہ موت کا بچشم سر مشاہدہ کرنے کے باوجود زندہ رہنے کی خواہش انہیں ترک عقیدہ کی ذلت قبول کرنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ وہ عالم سفلی کی بندشوں اور اسباب کشش سے نجات پاکر عالم علوی کی طرف پرواز کر گئے۔ یہ فانی زندگی پر ابدی عقیدہ کی فتح کا کرشمہ تھا۔

اصحاب الاخدود کا جانوروں سے بدتر گروہ

ان ایمان سے معمور، بلند فطرت، صالح اور پیکر شرافت نفوس کے بالمقابل باغی، سرکش، لئیم اور مجرم انسانوں کی منڈلی تھی جو آگ کے الاؤ کے پاس بیٹھ کر ان کے جلنے کا تماشا دیکھ رہی تھی کہ اہلِ ایمان کیسے تڑپتے اور کیسے دُکھ سہتے ہیں۔ وہ اس منظر سے لُطف اندوز ہو رہے تھے کہ آگ جیتے جاگتے انسانوں کو کس طرح چاٹتی ہے اور کس طرح یہ گروہ شرفاء چشم زدن میں راکھ کے ڈھیروں میں تبدیل ہوتا ہے۔

جب کوئی نوجوان یا دوشیزہ، بچّی یا بوڑھی، کمسن یا سال خوردہ مومن آگ میں لاکر جھونکا جاتا تو ان درندوں کی بدمستی بڑھ جاتی اور خون کے فواروں اور گوشت کے ٹکڑوں کو دیکھ دیکھ کر وہ پاگلوں کی طرح ناچتے اور شور مچاتے۔ یہ انسانیت سوز واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ ان بدبخت ظالموں کی جبلّت اس حد تک مسخ اور خاک آلودہ ہو چکی تھی کہ ان کے لیے یہ بہیمانہ اور خوف ناک عذاب سامان لطف و وجۂ لذّت تھا۔ گراوٹ کی یہ وہ انتہا ہے کہ جنگل کا کوئی درندہ بھی اب تک اس حد تک نہیں پہنچ سکا۔ اس لیے کہ درندہ اگر شکار

کرتا ہے تو خوراک حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے، نہ کہ اپنے نیم جاں نخچیر کو پھڑ پھڑاتا دیکھ کر لذت حاصل کرنے کے لیے۔ اور ساتھ ہی یہ واقعہ اس امر کا پتہ بھی دیتا ہے کہ خدا پرست اہلِ ایمان کی رُوحوں نے اس آزمائش میں کس طرح اس اوجِ کمال تک کو جا چھُوا جو ہر دور اور ہر زمانے میں انسانیت کا نقطۂ عروج سمجھا گیا ہے۔

اس معرکے میں کس کو فتح نصیب ہوئی

دنیا کے پیمانے سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ظلم نے عقیدہ پر فتح پائی اور صالح و صابر اور خدا پرست گروہ کی ایمانی قوت جو بلاشبہ نقطۂ کمال تک پہنچ چکی تھی اس ظلم و ایمان کے معرکے میں بے وزن و بے وقعت ثابت ہوئی۔ نہ قرآن ہی یہ بتاتا ہے اور نہ وہ روایات ہی یہ بتاتی ہیں جو اس واقعہ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان ظالموں کو بھی ان کے جرم شدید کی اسی طرح سزا دی ہو، جس طرح قوم نوحؑ، قوم ہود، قوم صالح، قوم شعیبؑ اور قوم لوطؑ کو دی ہے یا جس طرح فرعون اور اس کے لشکریوں کو پوری قاہرانہ و مقتدرانہ شان کے ساتھ پکڑا تھا ——— گویا دنیا پرست کے نقطۂ نظر سے اس واقعہ کا اختتام بڑا افسوس ناک اور الم انگیز ہے۔

مگر کیا بات صرف یہیں پر ختم ہو جاتی ہے؟ کیا ایمان کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ جانے والی خدا پرست جماعت ان زہرہ گداز آلام کے نتیجے میں آگ کی خندقوں میں راکھ بن کر ملیامیٹ ہو گئی اور گروہ مجرمین جو رذالت اور کمینگی کی آخری حد کو پھلانگ چکا تھا، وہ دنیا میں سزا سے صاف

بچ گیا۔ جہاں تک دنیاوی حساب کا تعلق ہے اس افسوس ناک خلش کے بارے میں دل میں کچھ خلش سی اُٹھتی ہے۔ مگر قرآن اہلِ ایمان کو ایک دوسری نوعیت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کے سامنے ایک اور ہی حقیقت کی پردہ کشائی کرتا ہے۔ وہ ان کو ایک نیا پیمانہ دیتا ہے جس سے وہ اشیاء کا صحیح وزن جانچ سکیں اور حق و باطل کے جن معرکوں سے وہ دوچار ہوتے ہیں ان کی اصل حقیقت اور اصل میدان سے آگاہ ہو سکیں۔

کامیابی کا اصل معیار

دنیا کی زندگی اور اس کی آسائشیں اور تکلیفیں، کامرانیاں اور محرومیاں ہی کارزارِ حیات میں فیصلہ کُن نہیں ہیں۔ یہی وہ مال نہیں ہے جو نفع اور نقصان کا حساب بتا سکے۔ نصرت صرف ظاہری غلبہ کا نام نہیں ہے بلکہ یہ نصرت کی بے شمار صورتوں میں سے محض ایک صُورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی میزانِ فیصلہ میں اصل وزن عقیدہ کا ہے۔ اور اللہ کی منڈی میں جس مال کی کھپت ہے وہ صرف ایمان کی متاع ہے۔ نصرت کی اعلیٰ ترین شکل یہ ہے کہ رُوح مادّہ پر غالب آجائے، عقیدہ کو رنج و محن پر کامیابی حاصل ہو اور آزمائش کے مقابلے میں ایمان فتح یاب ہو جائے ——— چنانچہ اصحاب الاخدود کے واقعہ میں اہلِ ایمان کی روح نے خوف و کرب پر دنیا کی ترغیبات پر، زندگی کی محبت پر اور کڑی آزمائش پر وہ عظیم فتح پائی ہے کہ رہتی دنیا تک وہ بنی نوعِ انسان کے لیے طرۂ افتخار رہے گی ——— یہی ہے اصل کامیابی۔

مومن کی موت بجائے خود اعزاز ہے۔

سب انسان موت کی آغوش میں جاتے ہیں۔ مگر اسباب موت مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن سب انسانوں کو یہ کامیابی نصیب نہیں ہوتی، نہ سب اتنا اونچا معیار ایمان پیش کر سکتے ہیں، نہ اس حد تک کامل آزادی حاصل کر سکتے ہیں، اور نہ وہ اتنے اُونچے اُفق تک پرواز کر سکتے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہوتا ہے کہ وہ ایک مبارک گروہ کو اپنے بندوں میں سے چھانٹ لیتا ہے جو مرنے میں تو دوسرے انسانوں کے ساتھ شریک ہوتا ہے مگر ایک ایسا شرف و اعزاز اس کو نصیب ہوتا ہے جو دوسرے لوگوں کو نصیب نہیں ہوتا ——— یہ شرف و اعزاز اُسے ملاء اعلیٰ میں ملتا ہے۔ بلکہ اگر پے در پے آنے والی انسانی نسلوں کے نقطۂ نظر کو بھی حساب میں شامل کر لیں تو خود دنیا کے اندر بھی ایسا مبارک گروہ شرف و اعزاز کا مرتبۂ بلند حاصل کر لیتا ہے۔

ان مومنین نے انسانی نسل کی لاج رکھی ہے۔

مومنین ایمان ہار کر اپنی جانوں کو بچا سکتے تھے۔ لیکن اس میں خود ان کا اپنا کتنا خسارہ ہوتا اور پوری انسانیت کو کس قدر خسارہ پہنچتا! کتنا بڑا خسارہ تھا کہ اگر وہ اس روشن حقیقت کو پامال کر دیتے کہ زندگی ایمان سے خالی ہو تو وہ ایک کوڑی کی بھی نہیں رہتی، نعمتِ آزادی سے تہی ہو تو قابلِ نفرین ہے اور اگر ظالم و نافرمان لوگ اس حد تک جری ہو جائیں کہ جسموں پر تسلّط حاصل کرنے کے بعد دلوں اور روحوں پر بھی حکمرانی کرنے لگیں تو یہ زندگی کی انتہائی گراوٹ ہے!! یہ وہ پاکیزہ وارفع حقیقت ہے جسے اہلِ ایمان نے اسی وقت پا لیا تھا

جب کہ وہ ابھی دنیا میں موجود تھے، جب آگ ان کے جسموں کو چھو رہی تھی تو وہ اسی عظیم حقیقت اور پاکیزہ اصول پر کاربند تھے۔ ان کے فانی جسم آگ سے جل رہے تھے اور یہ عظیم اور پاکیزہ اصول کامیابی کا لوہا منوا رہا تھا بلکہ آگ اسے مزید نکھار کر کندن بنا رہی تھی۔

حق و باطل کی کشمکش کا فریق اور میدان

حق و باطل کے معرکہ کا میدان صرف اس دنیا کا اسٹیج نہیں ہے۔ اور زندگی صرف اسی دنیاوی زندگی کا نام نہیں ہے، شرکائے معرکہ صرف وہ لوگ ہی نہیں ہیں جو اس نسل سے تعلق رکھتے ہوں جس میں معرکہ برپا ہو۔ دنیا کے تمام واقعات میں خود ملاء اعلیٰ شریک ہوتے ہیں، ان کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ان پر گواہ رہتے ہیں۔ انہیں اس میزان میں تولتے ہیں جو کسی خاص وقت اور نسل کی دنیاوی میزان سے مختلف ہوتی ہے، بلکہ پوری انسانی نسل کی میزانوں سے وہ مختلف ہے۔ ایک وقت دنیا میں زمین پر جتنے انسان پائے جاتے ہیں ملاء اعلیٰ اس سے کئی گنا زیادہ مبارک ارواح پر مشتمل ہیں۔ پس بلاشبہ لشکر حق پر ملاء اعلیٰ کی ستائش و تکریم اہلِ دنیا کے فیصلوں، اندازوں اور عزت افزائیوں سے کہیں زیادہ عظیم اور وزنی ہوتی ہے۔

ان تمام مراحل کے بعد آخرت بھی ہے۔ یہ اصل اور فیصلہ کن میدان ہے۔ دنیا کا اسٹیج اس میدان سے متصل ہے منفصل نہیں ہے، امر واقع کے اعتبار سے بھی اور مومن کے احساس و شعور کے لحاظ سے بھی۔ پس معرکہ حق و باطل دنیا کے اسٹیج پر ہی تمام نہیں ہو جاتا، اس کے حقیقی خاتمہ کا مرحلہ تو

ابھی آیا ہی نہیں۔ دنیا کے اسٹیج پر اس معرکے کا جو حصّہ پیش کیا گیا ہے صرف اُس پر کوئی حکم لگانا صحیح اور منصفانہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا اطلاق معرکے کے صرف چند معمولی ادوار پر ہوگا۔

اہلِ ایمان کے انعامات

پہلی قسم کی نگاہ (جس کے نزدیک ہر چیز کا فیصلہ دنیا کے اسٹیج پر ہی ہو جاتا ہے) کوتاہ، سطح بین اور محدود ہے۔ یہ عجلت پسند انسان کی نگاہ ہے۔ دوسری قسم کی نگاہ دُور اندیش، حقیقت شناس، جامع اور وسیع تر ہے۔ قرآن اہلِ ایمان کے اندر یہی نگاہ پیدا کرتا ہے۔ یہی نگاہ اس حقیقت کی صحیح ترجمان ہے جس پر صحیح ایمانی تصور کی عمارت قائم ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان سے ایمان و اطاعت میں ثابت قدم رہنے، آزمائش و امتحان میں کامیاب اُترنے اور زندگی کی فتنہ پردازیوں پر فتح پانے پر جس صلہ اور ایمان کا وعدہ فرما رکھا ہے، وہ اہلِ ایمان کے لیے طمانیت قلب کا سامان فراہم کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

(الرعد: ۲۸)

جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ آگاہ رہو، اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔

وہ صلہ رحمان کی خوشنودی اور محبّت کے وعدہ پر مشتمل ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۔ (مریم: ۹۶)

جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے عمل صالح کیے عنقریب رحمان اُن کے لیے دلوں میں محبّت پیدا کر دے گا۔

وہ ملاء اعلیٰ کے اندر ذکرِ خیر کا وعدہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کسی بندے کا بچہ مر جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے دریافت فرماتا ہے کہ: تم نے میرے فلاں بندے کے بچّے کی روح قبض کر لی ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں: "ہاں"۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تم نے میرے بندے کے لختِ جگر کی رُوح قبض کر لی ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں: "ہاں اے پروردگار" اس پر اللہ تعالیٰ اُن سے پُوچھتا ہے کہ: "اس موت پر میرے بندے نے کیا کہا؟" فرشتے کہتے ہیں: اُس نے آپ کی حمد فرمائی اور "انا للہ و انا الیہ راجعون" کہا۔ یہ سُن کر اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ میرے اس بندے کے لیے جنّت میں ایک گھر بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو" (ترمذی)۔ نیز آنجنابؐ سے مروی ہے کہ اللہ عزّ و جل فرماتا ہے۔ میں اپنے بندے کے لیے وہی کچھ ہوں جو میرے بارے میں وہ گمان رکھتا ہے۔ جب وہ میرا ذکر کرتا ہے تو مَیں اُس کے ساتھ ہوتا ہوں، اگر اپنے دل میں مجھے یاد کرتا ہے تو مَیں بھی دل میں اُسے یاد کرتا ہوں، اور اگر وہ لوگوں کے اندر میرا ذکر کرتا ہے تو میں اُن سے بہتر گروہ میں اُس کا ذکر کرتا ہوں، اگر وہ ایک بالشت میرے قریب ہوتا ہے تو

میں ایک ہاتھ اُس کے قریب ہوتا ہوں ، اگر وہ ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے تو میں اس کی طرف ایک قدم بڑھتا ہوں ، اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اُس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں (بخاری و مسلم)

یہ وعدہ ہے اس بات کا کہ ملاءِ اعلیٰ اہلِ ایمان کے لیے دُعاگو ہیں اور ان کے ساتھ گہری دلچسپی اور ہمدردی رکھتے ہیں ۔

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ۝ (المومن : ۷)

عرشِ الٰہی کے حامل فرشتے ، اور وہ جو عرش کے گرد و پیش حاضر رہتے ہیں ، سب اپنے ربّ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں ۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دُعائے مغفرت کرتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں : اے ہمارے رب ، تو اپنی رحمت اور اپنے علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے ، پس معاف کر دے اور عذاب دوزخ سے بچالے ان لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے ۔

یہ وعدہ ہے اس بات کا کہ شہداء کے لیے اللہ کے پاس زندگی جاوید ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (آل عمران : ۱۶۹ تا ۱۷۱)

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مُردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں۔ اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں۔ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اُس پر خوش و خرم ہیں، اور مطمئن ہیں۔ کہ جو اہلِ ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں ان کے لیے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں و فرحاں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

باغیوں کا انجام

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پے در پے یہ وعید سُنائی ہے کہ وہ جُھٹلانے والوں، ظالموں اور سرکشوں اور مجرموں کو آخرت میں پکڑے گا اور دُنیا میں ایک مدّت مقررہ تک ان کی رسی ڈھیلی چھوڑے گا اور انہیں مہلت دے گا ــــــ اگرچہ ان میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ نے کبھی کبھی دنیا میں بھی پکڑ لیا ہے ــــــ لیکن اصل سزا کے لیے آخرت ہی پر زور دیا گیا ہے:

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ۔
مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ۔

(آلِ عمران: ۱۹۶-۱۹۷)

ملک کے اندر خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکہ میں نہ ڈالے۔ یہ چند روزہ زندگی کا لُطف ہے، پھر ان کا ٹھکانہ جہنّم ہوگا جو بہت بُری جائے قرار ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ۔
اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ٥
مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ
طَرْفُهُمْ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ٥

(ابراہیم: ۴۲-۴۳)

یہ ظالم لوگ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ کو تم اس سے غافل نہ سمجھو۔ اللہ تو انہیں ٹال رہا ہے اُس دن کے لیے جب یہ

حال ہوگا کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں۔ سر اُٹھائے بھاگے چلے جا رہے ہیں، نظریں اُوپر جمی ہیں اور دل اڑے جاتے ہیں۔

فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتّٰى يُلٰقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ○ يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ○ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ۔

(معارج: ۴۲ تا ۴۴)

انہیں بے ہودہ باتیں اور کھیل کرنے دو یہاں تک کہ آخرکار وہ دن آموجود ہو جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ وہ دن جب کہ یہ قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے اور اس طرح دوڑ رہے ہوں گے کہ گویا وہ کسی استھان کی طرف لپک رہے ہیں۔ ان کی نظریں جھکی ہوں گی ذلت چہروں پر چھا رہی ہوگی، یہی تو وہ دن ہوگا جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

علیٰ ہذا القیاس انسانی زندگی کا ملاءِ اعلیٰ کی زندگی سے رشتہ قائم ہے۔ اور دُنیا کا آخرت سے۔ لہٰذا خیر و شر کا معرکہ، حق و باطل کی آویزش اور ایمان و بغاوت کی کشمکش کا سارا مدار صرف دنیا کے اسٹیج پر نہیں ہے، اور نہ یہ معاملہ دنیاوی زندگی کے اندر ہی انجام پذیر ہوتا ہے، اور نہ دنیاوی زندگی ہی کے

اندر اس کا فیصلہ سُنایا جاتا ہے۔ دنیاوی زندگی اور اس سے وابستہ تمام راحتیں اور تکلیفیں یا لذتیں اور محرومیاں ہی اللہ کی میزان فیصلہ کا اصل وزن نہیں ہیں۔ اس حقیقت کی رُو سے معرکۂ خیر و شر کا میدان بھی بڑا وسیع ہے، اور عرصہ بھی بڑا وسیع ہے۔ اور کامیابی اور ناکامی کے پیمانے اور اوزان کا دائرہ بھی بڑا وسیع ہے۔ اسی بنا پر مومن کے فکر و نظر کے آفاق میں غیر معمولی پھیلاؤ آ جاتا ہے۔ اور اس کی دلچسپیاں اور توجہات بھی اُونچے درجے کی ہو جاتی ہیں۔ اور یہ دنیا اور اس کی رعنائیاں اور یہ زندگی اور اس کے لوازم اُس کی نگاہ میں حقیر اور بے وقعت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور جس قدر اُس کے فکر و نظر کے زاویے بلند ہوتے جاتے ہیں اُس کے درجات میں بلندی ہوتی جاتی ہے۔

ایسا وسیع و ہمہ گیر اور پاکیزہ و بلند تر ایمانی تصوّر پیدا کرنے کے لیے اصحاب الاخدود کا قصہ چوٹی کی مثال ہے۔

مکذبین کے مختلف انجام

اصحاب الاخدود کے قصہ اور سورۂ بروج سے دعوت الی اللہ کے مزاج اور ہر امکانی صورتِ حال کے بارے میں داعی کے مؤقف پر ایک اور پہلو سے بھی روشنی پڑتی ہے۔ دعوت الی اللہ کی تاریخ نے دنیا کے اندر دوسری گوناگوں اور بوقلموں دعوتوں کے مختلف خاتمے دیکھے ہیں۔

اس نے قوم نوح، قوم ہود، قوم شعیب اور قوم لُوط کی ہلاکت و بربادی دیکھی ہے۔ اور معدودے چند اہلِ ایمان کی نجات بھی دیکھی ہے۔ مگر قرآن نے یہ نہیں بتایا کہ نجات پانے والوں نے بعد میں دُنیا اور دُنیاوی زندگی کے

اندر کیا پارٹ ادا کیا۔ ان اقوام کی تباہی کی یہ مثالیں بتاتی ہیں کہ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ مکذبین اور ظالمین کو دُنیا کے اندر ہی عذاب کا ایک حصّہ چکھا دیتا ہے۔ باقی رہی کامل سزا تو وہ صرف آخرت پر اُٹھا رکھی گئی ہے۔ اس دعوت نے فرعون اور اس کے لشکریوں کی غرقابی کو بھی دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھا کہ کس طرح حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کو بچا لیا گیا اور پھر اُسے مُلک کے اندر اقتدار کی مسند پر بٹھایا گیا۔ اور یہ وہ دَور تھا جب یہ قوم اپنی پوری تاریخ میں نسبتہً صالح ترین قوم تھی۔ اگرچہ وہ کبھی بھی استقامت کاملہ کے مرتبے تک ترقی نہ کر سکی، اور اُس نے دُنیا کے اندر دین خداوندی کو زندگی کے جامع نظام کی حیثیت سے برپا نہ کیا ———

یہ نمونہ پہلے نمونوں سے مختلف ہے۔ تاریخ دعوت نے اسی طرح اُن مشرکین کی لاشوں کے انبار بھی دیکھے جنھوں نے ہدایت سے منہ موڑا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے انکار کیا۔ اور یہ بھی دیکھا کہ جب اہل ایمان کے دلوں پر عقیدہ کی حیرت انگیز حد تک حکمرانی قائم ہو گئی تو دنیا کے اندر نصرت کاملہ نے کس طرح آگے بڑھ کر اُن کے قدم چُومے۔ اور پہلی مرتبہ انسانی تاریخ نے یہ منظر بھی دیکھا کہ نظام خداوندی انسانی زندگی کے اصل حاکم کی حیثیت سے عملاً قائم ہُوا۔ یہ ایک ایسی صورت تھی کہ انسانی تاریخ نے نہ اس سے پہلے کبھی اس کا مشاہدہ کیا تھا اور نہ بعد میں۔ اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں دعوتِ اسلامی کی تاریخ نے اصحاب الاخدود کا نمونہ بھی دیکھا ہے۔ علاوہ ازیں تاریخ نے قدیم اور جدید زمانے میں اور بھی کئی مناظر دیکھے ہیں۔ جو تاریخ ایمان کے دفتر میں زیادہ نمایاں جگہ نہیں پا سکے۔ اور ابھی تک اُس کی آنکھ طرح طرح کے نمونے دیکھ رہی

ہے جو انہی انجاموں میں سے کسی نہ کسی انجام سے دوچار ہوتے جا رہے ہیں جو صدیوں سے تاریخ کے سینے میں محفوظ چلے آرہے ہیں۔

اصحاب الاخدود کا جُداگانہ انجام اور اہلِ ایمان کے لیے اس واقعہ میں اصل عبرت۔

دوسرے نمونوں کا ذکر بھی بیشک ضروری ہے مگر اُس نمونے کے ذکر کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے جس کی نمائندگی اصحاب الاخدود کرتے ہیں۔ یہ وہ ناگزیر نمونۂ عزیمت ہے جس میں اہلِ ایمان کو نجات نہیں ملتی، اور اہلِ کُفر کی بھی دنیا میں گرفت نہیں ہوتی۔ یہ اس لیے ہے تاکہ اہلِ ایمان اور داعیانِ حق کے شعور میں یہ بات پوری طرح اُتر جائے کہ راہِ حق میں انہیں بھی ایسے ہی انجام سے دوچار کیا جا سکتا ہے، اس بارے میں اُن کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، ان کا اور ان کے ایمان کا معاملہ سراسر اللہ کے سپرد ہے۔ ان کی ذمہ داری بس یہ ہے کہ وہ اپنے فرض کو سرانجام دیں اور رخصت ہو جائیں، ان کا فرض یہ ہے کہ وہ صرف اللہ کو اپنے لیے پسند کر لیں، زندگی پر عقیدہ کو ترجیح دیں اور آزمائش میں ڈالے جائیں تو ایمان کی مدد سے اس پر غلبہ پائیں، زبان اور نیت سے بھی اللہ کی صداقت کی گواہی دیں اور اپنے عمل و کردار سے بھی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ اور اُن کے دشمنوں کے ساتھ جو چاہے کرے اور اپنے دین اور اپنی دعوت کے لیے جو مقام چاہے منتخب کر لے۔ وہ چاہے تو ان کو اُن انجاموں میں سے کسی انجام کے حوالے کرے جن سے اہلِ ایمان و عزیمت تاریخ میں دوچار ہوتے رہے

ہیں، یا اُن کے لیے کوئی ایسا انجام پسند فرماتے جسے وہ خود ہی جانتا اور دیکھتا ہے۔

مومنین اللہ کے اجیر اور کارندے ہیں

اہلِ ایمان اللہ کے اجیر اور کارندے ہیں۔ وہ جو کچھ ان سے کام لینا چاہتا ہے، جہاں اور جب چاہتا ہے، اور جس انداز سے چاہتا ہے، ان کا کام اُسے انجام دینا اور طے شدہ معاوضہ لینا ہے۔ دعوت کا کیا انجام ہوتا ہے یہ ان کی ذمّہ داری میں شامل نہیں ہے اور نہ یہ اُن کے بس کی بات ہے۔ یہ مالک کی ذمّہ داری ہے، مزدور اور کارکن کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

اہل ایمان اپنی مزدوری کی پہلی قسط دنیا ہی میں وصول کر لیتے ہیں۔ یہ قسط ہے: زندگی بھر طمانیّتِ قلب، احساس وشعور کی بلندی، تصوّرات کا حُسن اور پاکیزگی، سفلی ترغیبات اور گھٹیا خواہشوں سے آزادی، خوف وقلق سے نجات دوسری قسط بھی وہ اسی محدود دنیا کے اندر ہی وصول کر لیتے ہیں۔ جو انہیں ملاءِ اعلیٰ میں ستائش، ذکرِ خیر اور تکریم کی شکل میں ملتی ہے۔ اجر کی سب سے بڑی قسط انہیں آخرت میں ملے گی: ان سے حساب آسان اور معمولی لیا جائے گا اور انہیں نعمتیں بڑی بڑی عطا کی جائیں گی۔ ان تمام قسطوں سے بڑھ کر جو چیز انہیں ہر ہر قسط کے ساتھ ملتی ہے وہ اللہ کی خوشنودی ہے، اور اللہ کی یہ عنایت ہے کہ اُس نے انہیں اس مقصد کے لیے منتخب کر لیا ہے کہ وہ دستِ قضا میں صورتِ شمشیر ہوں، اور اللہ کی قدرت وحکمت کی ڈھال بنیں تاکہ وہ دنیا کے

اندر ان کے ذریعہ سے جو چاہے کرشمہ سازی کرے۔

صدرِ اوّل کے اہل ایمان

قرآن کریم نے صدر اول میں اہل ایمان کی برگزیدہ جماعت کو جو تربیت دی تھی وہ ارتقاء و کمال کے اسی درجۂ بلند کو پہنچی ہوئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی انفرادیت کو کلیتہً فنا کر دیا، اور کارِ دعوت میں انہوں نے "انا" کو ہمیشہ کے لیے فارغ خطی دے دی، وہ صرف صاحب دعوت کے لیے مزدور اور کارکن کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ وہ ہر حال اور ہر بات میں اللہ کے اس انتخاب اور فیصلے پر راضی رہے۔ نبوی تربیت بھی قرآن کی تعلیمات کے پہلو بہ پہلو موجود تھی۔ یہ تربیت ان کے دلوں اور نگاہوں کو جنّت کی طرف متوجہ کر رہی تھی اور انہیں یہ تلقین کر رہی تھی کہ جو پارٹ ان کے لیے پسند کیا گیا ہے وہ اسے ثابت قدمی کے ساتھ اس وقت تک ادا کرتے رہیں جب تک اللہ تعالیٰ اپنا وہ فیصلہ نہیں نازل فرما دیتا جو دنیا میں بھی اسے مطلوب ہے اور آخرت کے لحاظ سے بھی اُسے محبوب ہے۔ آنجناب مکہ میں حضرت عمّار اور ان کی والدہ اور ان کے والد رضی اللہ عنہم کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ انہیں شدید عذاب دیا جا رہا ہے، مگر آپ اس سے زیادہ کچھ نہ فرماتے: صبرًا آل یاسر، موعدکم الجنۃ (اے آل یاسر! صبر کا دامن نہ چھوٹنے پائے، تم سے جنّت کا وعدہ ہو چکا ہے) حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے سائے میں چادر کی ٹیک لگائے آرام فرما رہے تھے کہ ہم نے آپؐ سے شکایت

کی اور عرض کیا: "آپؐ اللہ سے ہماری نصرت کیوں نہیں مانگتے، اور ہمارے لیے دعا کیوں نہیں کرتے؟" آنجنابؐ نے فرمایا: تم سے پہلی اُمتوں کا یہ حال تھا کہ ایک آدمی کو پکڑ لیا جاتا اور اُس کے لیے زمین میں گڑھا کھود کر اس کو اُس میں اُتار دیا جاتا، پھر آری لاکر اُسے سر سے نیچے تک دو ٹکڑوں میں چیر ڈالا جاتا۔ اُن کے جسموں پر گوشت اور ہڈیوں کے درمیان لوہے کی کنگھیاں پھیری جاتیں۔ لیکن یہ سب کچھ انہیں دین سے نہ ہٹا سکتا۔ خدا کی قسم، اللہ اس دین کو مکمل کر کے چھوڑے گا اور وہ وقت آئے گا کہ ایک سوار صنعاء سے حضرموت تک اکیلا سفر کرے گا مگر اُسے کوئی خوف نہ ہوگا، صرف خدا کا خوف ہوگا یا بکریوں پر بھیڑیئے کے حملے کا۔ لیکن تم لوگ جلد بازی کرتے ہو۔" (بخاری)

مومن اور اللہ کی حکمت بے پایاں

ہر کام اور ہر حال کی تہ میں اللہ کی حکمت کار فرما ہے۔ وہی اس پوری کائنات کی تدبیر کر رہا ہے، اس کے آغاز و انتہا سے باخبر ہے، اس دنیا کے اندر جو کچھ وقوع پذیر ہو رہا ہے وہی اس کی تنظیم کرتا ہے۔ پردۂ غیب میں جو حکمت و مصلحت پوشیدہ ہے صرف وہی اُس کو جانتا ہے، یہ حکمت و مصلحت تاریخ کے پورے سفر میں اُس کی مشیت کے تابع چلی آرہی ہے۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کئی صدیوں اور نسلوں کے گزر جانے کے بعد ایک ایسے واقع کی حکمت سے پردہ اُٹھاتا ہے جسے عہد واقعہ کے لوگ نہ سمجھتے تھے۔ اور شاید وہ اسی ٹوہ میں رہے ہوں گے کہ یہ واقعہ کیوں پیش آیا اور اپنے پروردگار سے سوال کرتے رہے ہوں گے کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ یہ سوال ہی بجائے خود ایک

جہالت ہے۔ جس سے مومن بچتا رہتا ہے۔ اُسے پہلے ہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ہر فیصلے میں حکمت پنہاں ہے۔ مومن کا وسیع تصوّر اور زمان و مکان اور اوزان و اقدار کے بارے میں اُس کی ژرف نگاہی اُسے یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ یہ سوال سوچ بھی سکے۔ چنانچہ وہ قافلۂ قضا و قدر کا پُورے اطمینان اور تسلیم و رضا کے عالم میں ہمسفر رہتا ہے۔

قرآن کی اصل تربیّت

قرآن ایسے قلوب پیدا کر رہا تھا جو بارِ امانت[1] اٹھانے کے لیے تیار ہو جائیں اور ضروری تھا کہ یہ قلوب اتنے ٹھوس اور مضبوط اور پاکیزہ و خالص ہوں کہ اس راہ میں اپنی ہر چیز نچھاور کر دیں اور ہر آزمائش کا خیر مقدم کریں اور دوسری طرف دنیا کے مال و متاع میں سے کسی چیز پر نظر رکھنے کے بجائے صرف آخرت کو اپنا مطمحِ نظر بنائیں اور صرف رضائے الٰہی کے طلب گار رہیں ——— گویا ایسے بے نظیر قلوب ہوں جو سفرِ دنیا کو تا دمِ آخریں تکلیف و تنگی، محرومی و کم نصیبی، عذاب و جانکاہی اور سرفروشی و ایثار پیشگی کے اندر گزارنے کے لیے تیار ہوں، اور اس دنیا کے اندر کسی عاجلانہ جزا کی اُمید نہ رکھیں خواہ یہ جزا دعوت کے فروغ، اسلام کے غلبہ اور مسلمانوں کی شوکت کی شکل میں ہی کیوں نہ ظاہر ہو بلکہ ظالموں کی ہلاکت اور ان کی عبرت ناک پکڑ کی صورت ہی کیوں نہ اختیار کرے۔ جیسا کہ پچھلے مکذبین کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔

---

[1] اشارہ ہے خلافتِ الٰہی کے قیام کی طرف۔

ضروری نہیں ہے کہ اہلِ ایمان کو دُنیاوی غلبہ حاصل ہو۔

جب اس پائے کے قلوب وجود میں آگئے جو اس یقین سے سرشار تھے کہ دنیا کے سفر میں کسی اجر اور معاوضے کے بغیر انہیں ہر خدمت اور ہر قربانی انجام دینی ہے، اور جو سمجھتے تھے کہ صرف آخرت ہی میں حق و باطل کے درمیان اصل فیصلہ ہو گا۔ جب ایسے کھرے قلوب مہیا ہو گئے، اور اللہ تعالیٰ نے دیکھ لیا کہ انہوں نے جو سودا کیا ہے اس میں وہ سچے اور مخلص ہیں تب اللہ تعالیٰ نے زمین میں اُن پر نصرت نازل فرمائی اور زمین کی امانت انہیں سونپ دی۔ مگر یہ امانت اس لیے انہیں نہیں دی کہ وہ اسے ذاتی تصرف میں لائیں بلکہ اس لیے دی کہ وہ نظامِ حق برپا کریں۔ اس گراں بارِ امانت کو اُٹھانے کی اہلیت و استحقاق انہیں اُسی روز حاصل ہو گیا تھا جب کہ اُن سے دنیا کے اندر کسی کامیابی اور فائدہ کا وعدہ نہیں کیا گیا تھا جس کا وہ "تقاضا کرتے"، اور نہ خود ان کی نگاہیں دنیاوی غنائم پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ صحیح معنوں میں اُسی روز سے اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہو چکے تھے جس روز سے اُن کی نگاہوں کو رضائے خداوندی کے سوا کسی اجر و مزد کی تلاش نہ رہی۔

قرآن کی جن آیات میں نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے، یا مغانم کا ذکر ہوا ہے یا یہ اطلاع دی گئی ہے کہ مشرکین کو دنیا کے اندر ہی اہلِ ایمان کے ذریعہ کیفرِ کردار تک پہنچا دیا جائے گا۔ ایسی تمام آیات مدنی دَور میں نازل ہوئی ہیں یہ تب نازل ہوئی ہیں جب یہ تمام چیزیں اہلِ ایمان کے پروگرام سے خارج ہو چکی تھیں، اور انہیں ان میں سے کسی چیز کا انتظار رہا تھا اور نہ طلب۔ نصرت

الہٰی خود بخود نازل ہوئی اور اس لیے نازل ہوئی کہ مشیتِ الہٰی کا یہ تقاضا تھا کہ نظامِ حق انسانی زندگی کے اندر عملی پیکر بن کر منودار ہو، ایسی جیتی جاگتی تصویر بن جائے جسے انسان بچشم سر دیکھ لیں۔ یہ نصرت اہلِ ایمان کی محنت و مشقت اور ان کی سرفروشیوں اور قربانیوں کا انعام نہیں تھا۔ بلکہ یہ اللہ کا ایک فیصلہ تھا جس کے بطن میں اللہ کی وہ حکمتیں اور مصلحتیں چھپی ہوئی تھیں جنہیں ہم آج دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

دنیاوی غلبہ مشیتِ الہٰی کے تحت ہو گا نہ کہ صلہ کے طور پر

دعوت کا یہ وہ پہلو ہے جس پر ہر ملک اور ہر قوم اور نسل کے داعیانِ حق کو پورا غور و تدبر کرنا چاہیئے۔ صرف یہی ایک پہلو انہیں راہِ حق کے تمام نشانات اور خطوط کو صاف صاف کسی ابہام و غموض کے بغیر دکھا سکتا ہے۔ اور اُن بندگانِ صدق و صفا کو ثابت قدمی بخش سکتا ہے جو یہ ارادہ کر چکے ہیں کہ وہ راہ حق کو اس کی انتہا تک طے کریں گے خواہ یہ انتہا کیسی کچھ ہو۔ اور اللہ نے اپنی دعوت کے لیے اور ان کے لیے جو کچھ بھی مقدر فرما رکھا ہے وہ درست ہے۔ اس پُر آشوب اور خون آشام راستے کو جو کاسہ ہائے سر سے پٹا ہوا ہے طے کرتے وقت وہ کبھی نصرت و غلبہ کے لیے چشم براہ نہیں رہیں گے یا اِسی دنیا کے اندر حق و باطل کے درمیان فیصلہ کے لیے بے تاب نہ ہوں گے۔ البتہ اگر خود ذاتِ خداوندی اپنی دعوت اور اپنے دین کی مصلحت کی خاطر ان سے ایسا کوئی کام لینا چاہے گی تو اسے پورا کر کے رہے گی۔ مگر یہ ان کی قربانیوں اور جانفشانیوں اور آلام و مصائب کا صلہ ہرگز نہ ہو گا۔ یہ دنیا

دار الجزا نہیں ہے۔ بلکہ یہ اللہ کی مشیت اور فیصلے کی تنفیذ ہوگی جو وہ اپنی دعوت اور اپنے نظام کے بارے میں طے فرمائے گا۔ اور جس کے لیے اپنے کچھ بندوں کو منتخب فرمائے گا تاکہ ان کے ذریعہ وہ اپنی مشیت کو پورا کرے۔ ان کے لیے یہی شرف کافی ہے کہ قرعہ فال ان کے نام نکل آیا، اس شرف کے آگے دنیا کی زندگی اور اس میں پیش آنے والی آسائشیں اور تکلیفیں ہیچ اور حقیر ہیں۔

اہل ایمان کی جنگ سیاسی نہیں ہے بلکہ عقیدہ کی جنگ ہے۔

یہاں ایک اور حقیقت قابلِ غور ہے جس کی طرف قرآن نے اصحاب الاخدود کے واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ذیل کی آیت میں اشارہ کیا ہے:

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔

اور وہ اہل ایمان سے صرف اس وجہ سے چڑے کہ وہ اللہ عزیز و حمید پر ایمان لا چکے تھے۔

اس حقیقتِ قرآن پر بھی داعیانِ حق کو، ہر دور اور ہر ملک کے داعیانِ حق کو گہری نگاہ سے غور و تامل کرنا چاہیئے۔ اہلِ ایمان اور ان کے حریفوں کے درمیان جو جنگ برپا ہے یہ درحقیقت عقیدہ و فکر کی جنگ ہے، اس کے سوا اس جنگ کی اور کوئی حیثیت قطعاً نہیں ہے۔ ان مخالفین کو مومنین کے صرف ایمان سے عداوت ہے اور ان کی تمام برافروختگی اور غیظ و غضب کا سبب وہ عقیدہ ہے جسے مومنین نے حرز جاں بنا رکھا ہے۔ یہ کوئی سیاسی جنگ ہرگز نہیں ہے، نہ یہ اقتصادی یا نسلی معرکہ آرائی ہے۔ اگر اس نوعیت کا کوئی جھگڑا ہوتا تو اسے بآسانی

چکایا جا سکتا تھا اور اس کی مشکلات پر قابو پایا جا سکتا تھا لیکن یہ تو اپنے جوہر و روح کے لحاظ سے خالصتہً ایک فکری جنگ ہے۔ یہاں امر متنازع فیہ یہ ہے کہ کفر رہے گا یا ایمان، جاہلیت کا چلن ہوگا یا اسلام کی حکومت!

مشرکین کے سرداروں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مال و دولت، حکومت اور دوسرے ہر طرح کے دنیوی مفادات پیش کیے اور ان کے مقابلے میں صرف ایک چیز کا مطالبہ کیا اور وہ یہ کہ آپ عقیدہ کی جنگ ترک کر دیں، اور اس معاملے میں اُن سے کوئی سودا بازی کر لیں۔ اور اگر خدانخواستہ آپ ان کی یہ خواہش پوری کر دیتے تو آپ کے اور ان کے درمیان کوئی جھگڑا باقی نہ رہتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایمان و کفر کا مسئلہ ہے اور اس کشمکش کی تمام تر بنیاد عقیدہ پر ہے۔ مومنین کو جہاں کہیں اعداء سے سامنا ہو یہ بنیادی حقیقت ان کے دل و دماغ پر منقش رہنی چاہیئے۔ اس لیے کہ اعداء کی تمام تر عداوت و خفگی کا سبب صرف یہ عقیدہ ہے کہ "وہ اس اللہ پر ایمان رکھتے ہیں جو غالب ہے اور حمید ہے" اور صرف اسی کی اطاعت کرتے ہیں اور اُسی کے آگے سرافگندہ ہیں۔

دشمنانِ اسلام اس جنگ کو دُوسرے معنی پہناتے ہیں

اعداء یہ ہتھکنڈہ بھی استعمال کر سکتے ہیں کہ عقیدہ و نظریہ کے بجائے کسی اور نعرہ کو اس جنگ کا شعار بنا دیں۔ اور اسے اقتصادی یا سیاسی یا نسلی جنگ ثابت کرنے کی کوشش کریں تاکہ مومنین کو اس معرکہ کی اصل حقیقت کے بارے میں چھپلے میں ڈال دیں اور عقیدہ کی جو مشعل ان کے سینوں میں فروزاں ہے اُسے بجھا دیں۔ اہلِ ایمان کو اس بارے میں کسی دھوکے کا شکار نہ ہونا چاہیئے۔ اور انہیں یہ سمجھ لینا چاہیئے

کہ اعداد کے یہ اُلجھاوے ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہیں۔ اور جو اس جنگ میں کوئی اور نعرہ بلند کرتا ہے تو در اصل وہ یہ چاہتا ہے کہ اہلِ ایمان کو اس ہتھیار سے محروم کر دے جو ان کی کامیابی و ظفر مندی کا اصل راز ہے، یہ کامیابی جس شکل میں بھی ہو، چاہے اُس روحانی بلندی اور آزادی کے رنگ میں ہو جو اخدود کے واقعہ میں اہل ایمان کو نصیب ہوئی یا اس روحانی بلندی کی بدولت حاصل ہونے والے مادّی غلبہ کی صورت میں جس سے صدرِ اوّل کے مسلمان سرفراز ہوئے۔

مقصدِ جنگ اور شعارِ معرکہ کو مسخ کرنے کی مثال آج ہمیں بین الاقوامی عیسائیت کی اس کوشش میں نظر آتی ہے، جو ہمیں اس فکری جنگ کے بارے میں طرح طرح کے فریبوں میں مبتلا کرنے کے لیے صرف ہو رہی ہیں اور تاریخ کو مسخ کر کے یہ افترا پردازی کی جا رہی ہے کہ صلیبی جنگوں کے پس پردہ سامراجی حرص کار فرما تھی، یہ سراسر جھوٹ ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سامراج جس کا ظہور ان جنگوں کے بہت بعد ہوا ہے وہ صلیبی روح کا آلۂ کار بنا رہا ہے۔ کیونکہ یہ صلیبی رُوح جس طرح قرونِ وسطیٰ میں کھُل کر کام کرتی رہی ہے اس طرح اب وہ بغیر نقاب کے سامنے نہیں آسکتی تھی۔ یہ عقیدۂ اسلام کے ان معرکوں میں پاش پاش ہو چکی تھی جو مختلف النسل مسلمان رہنماؤں کی قیادت میں برپا ہوئے۔ ان میں صلاح الدین اور خاندان ممالیک کے توران شاہ کُردی تھے، ان لوگوں نے اپنی قومیتوں کو فراموش کر کے صرف عقیدہ اور نظریہ ہی کو یاد رکھا۔ اور عقیدہ ہی کی بدولت وہ ان کامیابیوں سے ہم کنار ہوئے۔

وما نقموا منہم الا ان یومنوا باللہ العزیز الحمید۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان بالکل سچا ہے۔ اور یہ جعل ساز اور فریب پیشہ لوگ جھوٹے ہیں۔